

(پٹھانوں کی اصلیت اور انکی تاریخ)

مصنف

خان روشن خان

•

تذکرہ

(پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ)

•

مصنّف

روشن خان

اشاعت اوّل	یکم جنوری ۱۹۸۰ء	طبع سوم	اپریل ۱۹۸۲ء
طبع دوم	یکم فروری ۱۹۸۱ء	طبع چہارم	جولائی ۱۹۸۳ء
طبع پنجم	دسمبر ۱۹۸۷ء	قیمت	150
طبع ششم	نومبر ۱۹۹۲ء		

ناشر

روشن خان ایجوکیشنل ٹرسٹ

جونا مارکیٹ، پھول چوک، کراچی ۲

•

مطبع

المخزن پرنٹرز

•

ملنے کا پتہ :

روشن خان اینڈ کمپنی تمباکو ڈیلرز

پھول چوک، جونا مارکیٹ۔ کراچی ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع پنجم

"تذکرہ" پٹھانوں کی تاریخ کے سلسلے کی ایک کتاب ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "تواریخ حافظ رحمت خانی" کا اصل مخطوطہ (پشتو زبان میں) شائع ہوا تھا، پھر اس کے اردو ترجمے کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ دوسرا اردو ایڈیشن اپنے حواشی کی جامعیت کی بنا پر بہت اہم ثابت ہوا۔ تواریخ کے یہ تینوں ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے اور لوگوں کی مانگ باقی رہ گئی۔ لیکن وہ چونکہ ایک ضخیم کتاب تھی اس لیے اس پر نظر ثانی اور اس کے نئے ایڈیشن کی تیاری میں زیادہ وقت صرف ہونا تھا۔ اس دوران میں اس کی اشاعت کے لیے اہل علم اور دردمندانِ قوم کا مطالبہ بہت بڑھ گیا تھا اور اس سے صرفِ نظر ممکن نہ تھا، اس لیے اس جانب بھی توجہ کرنی پڑی۔ اس کی اشاعت کی اہمیت کا اندازہ ہے اور اس کے سروسامان سے غافل نہیں ہوں۔

اس سلسلے کی تیسری تالیف "افغانوں کی نسلی تاریخ" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے اس موضوع پر بھی چونکہ کوئی کتاب یا مقالہ موجود نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بھی قبولیت کا شرف بخشا۔ اس کے بھی اب تک تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اس سلسلے کی دوسری کتاب "تذکرہ" (پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ) ہے اور اس وقت اسی کے چوتھے ایڈیشن کے تعلق سے چند ضروری باتوں کا اظہار مقصود ہے۔

تذکرہ کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۸۰ء میں، دوسرا فروری ۱۹۸۱ء میں اور تیسرا ایڈیشن اپریل ۱۹۸۲ء میں نکلا تھا۔ یہ تینوں ایڈیشن ساڑھے تین ہزار کی تعداد میں نکلے تھے اور اب جبکہ جولائی ۱۹۸۳ء شروع ہو چکا ہے۔ پچھلے کسی ایڈیشن کا کوئی نسخہ باقی نہیں رہا۔ سوا تین سال کی مدت میں اتنی تعداد میں ایک اردو کتاب کا نکل جانا تعجب انگیز اور اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ ایسی صورت میں یہ تعجب اور بڑھ جاتا ہے کہ نہ تو مجھے اپنے مصنف اور محقق زعم تھا اور نہ مؤرخ اور محقق کی حیثیت سے کسی شہرت کا مالک تھا کہ اسے کتاب کی مقبولیت کا سبب سمجھ لیتا۔ اس کتاب کو کسی بڑے اشاعتی ادارے کے وسائل بھی حاصل نہ تھے اور نہ اس کی تشہیر کی کوشش کی گئی حتّٰی کہ اخبارات و رسائل میں تبصروں کے لیے بھی کتاب نہیں بھیجی گئی۔ اس کے باوجود اگر کتاب مقبول ہوئی تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کے شرفِ قبول و نوازش کا نتیجہ ہے۔ میرا یقین ہے کہ جب کوئی کام خلوصِ نیت کے ساتھ قوم و ملت کی بھلائی کے لیے کیا جاتا ہے اور صرف اللہ کی رضاجوئی مقصو

ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے قبول کے لیے لوگوں کے دلوں کو کھول دیتا ہے۔

پہلی اشاعت کے بعد سے اب تک اس کتاب کے مباحث و مطالب کے بارے میں دماغ برابر کام کرتا رہا۔ چنانچہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں کئی اہم مباحث کا اضافہ ہوا تھا اور کسی نہ کسی حد تک اصلاح اور ترمیم و اضافہ کا یہ عمل تیسرے ایڈیشن میں بھی ہوا۔

پہلا اہم اضافہ جس کے سرور سے دماغ اب تک سرشار ہے، ام المومنین حضرت صفیہ رضؓ کا تذکرہ تھا پٹھانوں کے لیے یہ فخر کا مقام تھا کہ ان کے سلف صالحین میں سے ایک بزرگ خاتون کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے زمرے میں شامل ہونے اور کرۂ ارض کے تمام توحید پرستوں کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس اضافے کے لیے مجلہ علمی "پشتو" (پشاور) کی ایک مقالہ نگار خاتون محترمہ یاسمین پروین احمد خان کا شکر گزار ہوں جن کے ایک مقالے سے پٹھانوں کے اس عظیم شرف اور افتخار کا پتہ چلا

دوسرا اہم اضافہ "گندھارا میں بنی اسرائیل کے قدیم آثار" کے عنوان سے ہے۔ یہ آثار اب سے تقریباً دو ہزار سال قبل کے ہیں اور سری بہلول اور ہنڈ کے مقام پر بنی اسرائیل کے دو مجسموں کی شکل میں دستیاب ہوئے ہیں، ان کے مطالعے اور مشاہدے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس علاقے میں افغانوں کی تاریخ کتنی قدیم ہے۔ بنی اسرائیل کے ان مجسموں کا دریافت ہونا اس بات کا بھی ناقابل تردید ثبوت ہے کہ پٹھان اسرائیلؑ ہی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک مفید اضافہ چند افغان سلاطین دہلی کی تصاویر ہیں۔ ان کے اخذ کردہ نتائج کی طرف ان پر نوٹ میں اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے چوتھے ایڈیشن میں بھی متعدد مقامات پر اہم اسناد حوالے اور ضروری توضیحات کا اضافہ کیا گیا تھا اور جو غلطیاں پچھلے ایڈیشنوں میں رہ گئی تھیں انھیں بھی درست کیا گیا تھا۔ یہ ایڈیشن ۲ ہزار کی تعداد میں جولائی ۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔

چوتھے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد گزشتہ ڈھائی سال میں چونکہ مطالعہ برابر جاری رہا تھا اور متعدد مفید معلومات کا اضافہ ہوا تھا ضروری معلوم ہوا کہ پانچویں ایڈیشن میں ان معلومات کا اضافہ کر کے تذکرہ کے قارئین کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے۔ جو قارئین اس کا مطالعہ فرمائیں گے وہ اندازہ کر لیں گے کہ خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس ایڈیشن میں بعض اہم ترامیم کی گئی ہیں اور بعض ضروری معلومات کا اضافہ ہوا ہے اور اگرچہ صفحات کی تعداد اتنی ہی رہی ہے اور کوئی مضمون حذف نہیں ہوا ہے، بعض صفحات کی دوبارہ کتابت کے ذریعے بعض نئے مطالب مع حوالہ بڑھا دیئے گئے ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ اپنے مطالعے اور تحقیق کے بعد تاریخ کے مختلف مسائل کے بارے میں میری جو رائے اور تحقیق تھی نئے انکشافات اور حوالوں سے اس کے لیے مزید پختہ دلائل فراہم ہو گئے ہیں۔ کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی حسب سابق برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ امید بے جا نہ ہو گی کہ اہل علم اور تاریخ کے شائقین میں تذکرہ کا یہ ایڈیشن بھی مقبول ہو گا۔

روشن خان

فہرست مضامین

نقشہ جات

قطعۂ تاریخ "تذکرہ"

سلیم فاروقی

مردِ خوش افکار روشن خان نے — سخت محنت سے لکھی ہے یہ کتاب
کر دیا ہے حق ادا تحقیق کا — ہر ورق اس کا نویدِ انقلاب
"تذکرہ" اُس قوم کی تاریخ ہے — جس نے دنیا کے سہے رنج و عتاب
عزم و ہمت اس کا دستورِ حیات — جس سے روشن اپنی آزادی کا باب
دانت کھٹے کر دیئے انگریز کے — اسکے جذبے کی کہاں لاتا وہ تاب
کینہ پرور، فتنہ جو، حیلہ طراز — سوچتا رہتا تھا اس کا سدِ باب
تھوپے وہ الزام اس کی ذات پہ — پڑ گیا اچھائیوں پر بھی نقاب
"تذکرہ" کا طرزِ استدلال خوب — اس میں ہر الزام کا مسکت جواب
ایک نعمت ہے پٹھانوں کے لئے — خوبیاں ہیں اس کی بے حد و حساب
ہیں ابو سلمان میرے محترم — ان کا ارشادِ گرامی ہے جناب
لکھو تاریخِ اشاعت اس طرح — جس کا مصرعہ آپ اپنا ہو جواب

بس قلم برداشتہ لکھ دو سلیم
ہے مناقب "تذکرے" کی آب و تاب

۱۹۸۰ء



بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مصنف

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم، چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

راست خواہی ہزار چشم چناں کور بہتر کہ آفتاب سیاہ

پٹھانوں کے متعلق بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں پٹھان مصنفوں کی لکھی ہوئی بھی ہیں اور غیر پٹھان اہل قلم کی لکھی ہوئی بھی ہیں۔ لیکن ایسی کوئی کتاب نہیں ہے جس میں پٹھانوں کی تاریخ اپنی صحیح شکل میں آئی ہو۔ یہ خامی دونوں قسم کے اہل قلم کی کتابوں میں موجود ہے۔ اگر غیر پٹھان اہل قلم نے کوتاہ نظری کی وجہ سے ٹھوکر کھائی ہے یا کسی تعصب یا مفاد کے پیش نظر واقعات کے بیان میں رنگ آمیزی کی ہے تو پٹھان مصنف بھی واقعات کے پس منظر یا اس کے تمام پہلوؤں پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

غلطی کی وجہ کچھ بھی ہو، وہ دانستہ کی گئی ہو یا نادانستہ طور پر واقع ہو گئی ہو، اس بات سے تو کسی صورت میں انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پٹھانوں کو اس سے شدید نقصان پہنچا۔ ان کے بارے میں شدید غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ اور نہ صرف عام لوگ بلکہ عام طور پر پٹھان بھی جو اپنی قومی تاریخ میں گہری نظر نہ رکھتے تھے وہ ان افسانوں کو پڑھ کر یا سن کر اسے تاریخ اور غلط بیانیوں کو واقعات کی صحیح تصویر سمجھ بیٹھے۔ یہ غلط بیانیاں تاریخ کے کسی ایک واقعہ یا سیرت کے کسی ایک پہلو تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ پٹھانوں کی اصل و نسل، ان کی تاریخ، ان کی روایات ان کے اسلاف کے تذکروں، ان کی خدمات کے بیان، اور اقوام عالم میں ان کے

تاریخ ساز کردار، غرض کہ ان کی قومی زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو تک پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ کس قدر افسوس کا مقام تھا کہ بعض مورخین کی نقل نویسی کی عادت اور ان کی کوتاہ نگاہیوں اور تعصب نے نہ صرف اس قوم کی تاریخی عظمتوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کی بلکہ اس کے حسب و نسب تک کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے۔

پٹھانوں کو ان تاریخوں سے اور ان کے مطالعے سے یہ نقصان پہنچا کہ وہ نہ صرف اپنی صحیح قومی تاریخ سے ناواقف رہ گئے بلکہ اپنی صالح قومی روایات سے کٹ گئے۔ بزرگوں کی اسلامی سیرت اور ان کے کارنامے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور نتیجۃً ان کے دلوں کی وہ انگیٹھی سرد پڑ گئی جس پر قومی زندگی کا دارومدار تھا اور نظر کی وہ شعلہ فشانی ختم ہو گئی جو سنگ و آہن کو موم بنا دیتی تھی۔

تاریخ کی ان غلطیوں اور ان کے نقصانات کا ہر شخص اندازہ نہیں کر سکتا تھا اور اسی لئے ابھی تک ان غلط بیانیوں کی تردید اور صحیح تاریخ کی تالیف و تصنیف کی طرف کسی صاحب قلم نے توجہ نہیں کی اور یہ غلط بیانیاں اپنے تمام اثرات کے ساتھ روز بروز پھیلتی رہیں۔ ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے فکر بیٹھے رہنا اور ظلم کو پھیلتے اور بڑھتے دیکھتے رہنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ میں نے قومی تاریخ کے ان پہلوؤں پر اپنے مطالعے اور تحقیق کو اہل علم اور تاریخ کے شائقین کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس سلسلے میں مجھے جو مشکلات پیش آئیں، ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا اس کتاب کے مطالعے سے میری محنت اور جانفشانی کا خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔ البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس سلسلے میں تاریخ کی جتنی اہم کتابیں تھیں انہیں میں نے دیکھ لیا ہے اور اٹکل سے غلط فہمیوں کو دور کرنے اور غلط بیانیوں کے انسداد کی کوشش نہیں کی بلکہ تاریخ کے حوالوں سے اور دلائل و براہین کی روشنی میں قلم اٹھایا ہے اور یقین رکھتا ہوں کہ ان مقالات کے مطالعے کے بعد کم از کم اس کتاب کے قارئین کے ذہنوں میں پٹھانوں کی تاریخ کے

بارے میں کوئی غلط خیال باقی نہیں رہے گا۔[12]

لیکن کوئی تریاق کسی زہر کا اس وقت تک مداوا نہیں بن سکتا جب تک مریض اسے استعمال نہ کرے۔ دنیا تریاق سے خالی نہیں ہوگئی لیکن مار گزیدہ دنیا سے ضرور اٹھتے رہتے ہیں اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ تریاق کا قطرہ ان کے لبوں تک نہیں پہنچتا اس کی وجہ تریاق تک عدم رسائی کے علاوہ جہالت اور عدم واقفیت بھی ہوسکتی ہے۔

پھر اگر میں یہ کہوں کہ قوم کی تعلیم و تربیت اور اس کی سیرت کی تشکیل و تعمیر کے لئے ایک نسخہ کیمیا دریافت کرلیا ہے لیکن افراد قوم عدم رسائی یا ناواقفیت اور کم علمی کی بنا پر اسے حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے سے قاصر ہیں تو انقلاب حالات اور قوم کی نشاۃ ثانیہ کی امید کیوں کر پوری ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر یہ سوچ کر میں اپنے قلم اور اپنے قدم سعی کو روک لیتا تو ایک قومی جرم کا مرتکب ہوتا۔ اس کے لیے میں اپنے آپ کو تیار نہیں کرسکا الحمد للہ کہ میں نے اپنا کام پورا کردیا۔ اب اللہ ہی سے دعا ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشے۔

اور اللہ ہی کی توفیق بخشی سے امید ہے کہ وہ اس کوشش کو رائیگاں نہیں جانے دیگا قوم کے نونہال اپنے اسلاف کو اور ان کے کارناموں کو اپنے عمل اور اپنی سیرت سے دنیا کو یاد دلائیں گے اور اپنے بزرگوں کے دینی افکار اور قومی سیرت کی روشنی سے اپنی زندگی کی مشعلوں کو روشن اور منور کریں گے۔ اور قوم کی سربلندیوں کی ایک نئی اور دلفریب تاریخ جنم لے گی۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ قوم کے نوجوانوں میں قومی تاریخ و ادب کے مطالعہ کا شوق اور پٹھانوں کی نئی زندگی کے آغاز کا سروسامان پیدا کرے کیونکہ ہماری کسوٹی پر اب وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں۔ کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہے ——— روشن خان یکم جنوری ۱۹۸۰ء



پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

خان صاحب روشن خان، تاریخ خصوصاً پٹھانوں کی تاریخ وثقافت سے نہ صرف گہری دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ پٹھانوں کے مختلف قبائل وعشائر کی تاریخ پر ان کی ماہرانہ اور محققانہ نظر ہے۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ ان تحقیقات وانکشافات کی نشر واشاعت میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ مرحوم اللہ بخش یوسفی جو ان کے گہرے دوست تھے، علمی و تحقیقی کاموں میں خانصاحب ان کے معین ومددگار ہوتے تھے۔ یوسفی مرحوم کے انتقال کے بعد روشن خان کی دلچسپیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے پٹھانوں کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ "تواریخ حافظ رحمت خانی" (پشتو) پشتو اکیڈیمی پشاور کی طرف سے شائع کی۔ پھر اس کتاب کا اردو ترجمہ مع حواشی شائع کیا جو واقعی ایک تاریخی و تحقیقی کام تھا۔ ملک کے علمی تاریخی حلقوں میں تواریخ حافظ رحمت خانی (اردو ایڈیشن) کو خوب حسن قبول حاصل ہوا۔ ملک کے علمی وادبی جرائد نے اس کتاب پر گرانقدر رائے کا اظہار کیا۔ علمی اداروں نے اس کتاب کو سراہا اور دانشوروں اور مورخوں نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

اب خان صاحب روشن خان اس موضوع پر ایک نئی اور تازہ تالیف "تذکرہ" (پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ) کے نام سے اہل تحقیق کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس میں انہوں نے پٹھانوں کی تاریخ پر نئی معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ اور پورے برصغیر میں پٹھان جس عروج وزوال سے آشنا رہے ہیں، تاریخی پس منظر کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ بعض مباحث کی ترتیب اور سلسلہ ملانے

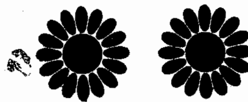
کی غرض سے تواریخ حافظ رحمت خانی کے بعض حواشی من وعن لے لئے ہیں اور بعض مباحث پر انہوں نے تحقیق و تدقیق کی روشنی میں اس طرح اضافہ کیا ہے کہ یہ کتاب ایک مستقل تالیف کی حیثیت اختیار کر گئی۔

خانصاحب نے نہ صرف پٹھانوں کے مراکز کے احوال و آثار پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف پٹھان حکمراں خاندانوں اور ریاستوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے اس طرح یہ کتاب پٹھانوں کے عہد اقتدار کی ایک مجمل مگر مربوط تاریخ بن گئی ہے۔

علم انساب کے علماء واقف ہیں کہ بعض خاندانوں اور خصوصاً حکمراں خاندانوں کے نسب مابہ النزاع رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر گم نامی میں مستور تھے۔ جب اقتدار و حکومت سے آشنا ہوئے تو سیاسی مصلحتوں کی بنا پر حسب منشا نسب نامے وضع کر لئے گئے۔

خانصاحب نے اس سلسلے میں بعض حقائق کی نقاب کشائی کی ہے۔ بعض نئے تاریخی انکشافات بھی ملتے ہیں۔ جو مورخین کے لئے فکر انگیز ہیں۔ فاضل مولف کی رائے سے اختلاف کی گنجائش ہے مگر ان کی تحقیق اور دلائل کی داد دینی پڑتی ہے خانصاحب کی یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت محققانہ اور معلومات آفریں کتاب ہے۔ اس کے لئے وہ علمی دنیا کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

محمد ایوب قادری





پروفیسر ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

روشن خان صاحب کی یہ تصنیف ایک ہی موضوع سے متعلق چند مقالات کا مجموعہ ہے بظاہر یہ مقالات الگ الگ نظر آتے ہیں لیکن یہ ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان میں ایک علمی رابطہ ہے اور یہ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو علم و مطالعہ کی روشنی میں لاتے ہیں۔ ان کی تحریر کا مقصد ایک ہی حقیقت گمشدہ کا پتا چلانا اور ایک تسبیح کے منتشر دانوں کو پھر ایک رشتۂ انسلاک سے وابستہ کر دینے کی کوشش ہے۔

تشبیہ و استعارہ کی زبان سے گریز کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان مقالات کی تحریر اور اس کتاب کی تالیف و اشاعت کا مقصد دنیا کی ایک عظیم المرتبت قوم میں اس کی نسل کی معرفت پیدا کرنا، دنیا میں ان کے امتیازات کی نشان دہی کرنا ان کی بھولی ہوئی روایات کو یاد دلانا اور دوبارہ ان کو زندہ کر دینا اور ان میں قومی شعور کے ساتھ اسلامی خصائص سیرت کی روح پھونک کر انہیں اس کارگہہ حیات میں سرگرم عمل کر دینا ہے۔

ان مقالات میں روشن خان نے پٹھانوں کی تاریخ کے چند اہم مباحث کو چھیڑا ہے۔ ان میں تاریخ کے اس ظلم کی نشان دہی کی گئی ہے جو مورخین عالم نے دانستہ یا نادانستہ طور پر، عدم واقفیت اور کوتاہ نظری کی بنا پر یا جان بوجھ کر کسی خاص مقصد کے تحت ان پر روا رکھا ہے۔ ان مقالات میں تاریخ کی ان شدید غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو پٹھانوں کی اصل حقیقت، ان کی نسل، ان کے تاریخی کردار اور ان کے قومی خصائص کے بارے میں اپنوں اور بیگانوں نے پیدا کر دی ہیں۔

ان مقالات میں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اقوام عالم میں ان کا پہلے مقام کیا تھا۔ وہ دنیا کے آسمانوں کی کن رفعتوں اور وسعتوں کے بلند پرواز شاہین تھے۔ وہ سمندروں کا سینہ چیرنے والے صحراؤں کو اپنے قدموں سے پامال کرنے والے اور پہاڑوں پر ہیبت طاری کرنے والے استقامت اور پختگی سیرت کے کتنے عظیم اور کیسے حسین پیکر تھے انہوں نے تاریخ عالم کے صفحات پر کتنے گہرے اور روشن نقش یادگار چھوڑے ہیں اور پھر جب وہ عزم وہمت، استقامت، پختگی سیرت اور حسن اخلاق کے مقامات جلیلہ کے حامل نہ رہے اور جہالت و توہمات اور انتشار و تشتت کی معصیت میں مبتلا ہوئے اور اس سیرت کے خصائص ان کی انفرادی اور قومی زندگی میں باقی نہ رہے تو ذلت و رسوائی کے کن درجات اسفل السافلین میں جا پڑے۔

ان مقالات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ روشن خان تاریخ کے اس نظریے پر ایمان نہیں رکھتے جس کے مطابق صرف واقعات کو من وعن بیان کر دینا ہی اصل مقصد ہوتا ہے۔ انہوں نے تاریخ کے واقعات کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ تاریخ ایک دعوت اور تحریک بن گئی ہے۔

روشن خان نے ان مقالات میں پٹھانوں کی تاریخ کے جن اہم مباحث پر قلم اٹھایا ہے، اگرچہ ان میں سے بعض مباحث کے متعلق وہ اس سے پہلے "تواریخ حافظ رحمت خانی" کے حواشی میں اپنے خیالات پیش کر چکے تھے لیکن وہاں اصل اہمیت تواریخ حافظ رحمت خانی کی تھی اور یہ مباحث اس کے حواشی میں ثانوی حیثیت میں آئے تھے۔ حواشی میں افکار و معلومات میں انتشار تھا اور ایک تصنیف جیسا ربط اور تسلسل مفقود تھا اور یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ضرورت تھی کہ ان مباحث پر مزید تفصیل اور دلائل کے ساتھ قلم اٹھایا جائے اور الگ اور مستقل حیثیت میں ان کی اشاعت کا سروسامان کیا جائے تاکہ پٹھانوں کی تاریخ کے جو نقوش وقت کی گرد تلے دب گئے ہیں اور ان کا اصل چہرہ اور حقیقی خدوخال پہچاننے میں دشواری ہو رہی ہے یا قومی سیرت کے وہ خصائص اور تاریخ کے وہ حقائق جن کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا

ہوگئی ہیں اور مخالف مورخین اور اہل قلم کی غلط بیانیوں نے جنہیں کچھ سے کچھ بنا دیا ہے وہ اچھی طرح اجاگر ہوں۔ روشن خان نے ان مقالات کی تالیف واشاعت کا عزم واہتمام اسی مقصد کے پیش نظر کیا ہے۔

ویسے تو ان تمام مقالات میں ایک فکری اور معنوی ربط ہے اور تمام مباحث کی سیر و گردش کا محور اور مدار ایک ہی ہے اور ہر مقالے کے مضمون کا دوسرے مبحث سے ایسا تعلق ہے کہ اسے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان تمام مقالات کی الگ الگ اور مستقل حیثیت اور اہمیت بھی ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ الگ بحث ہے، پٹھانوں کی اصل کے متعلق الگ مقالہ ہے، برصغیر کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے پٹھان خاندانوں اور ان کی خدمات کا تذکرہ الگ مضمون ہے۔ پٹھانوں کے قومی نام اور نسب و نسل کا مبحث اپنی حیثیت میں دوسرے مباحث سے بالکل الگ ہے۔ جہاں انہوں نے پٹھان اکابر اور خاندانوں کے بارے میں غلط بیانیوں کا پردہ چاک کیا ہے اور صحیح واقعات کو علم و تحقیق کی روشنی میں پیش کیا ہے، ان کی قدر و قیمت الگ ہے۔ ضمنی طور پر جو تاریخی حقائق و واقعات زیر قلم آگئے ہیں وہ اپنے دامن میں عبرت و موعظت کا الگ سرمایہ رکھتے ہیں۔ ہند و شاہیہ کے دار الحکومت اور علاقہ گندھارا کی قدیم سیاسی مرکزیت اور لاہور (پنجاب) کی تاریخ پر جو بحثیں ہیں وہ اپنی اہمیت اور افادیت میں منفرد ہیں اور ان تمام مطالب و مباحث کا تعلق برصغیر میں پٹھانوں کی آمد، ان کی ابتدائی تاریخ اور ان کے کارناموں سے بہت گہرا ہے۔ اگر ان مباحث پر قلم نہ اٹھایا جاتا تو بہت سے حقائق سے قارئین کو متعارف کرانا دشوار ہوتا۔

میدان جنگ میں ایک قوم دوسری قوم کا نشانہ ستم بنتی رہی ہے۔ یہ ایک روایت ہے جو قدیم ترین زمانے سے موجودہ دور علم و تہذیب تک جاری ہے اگر یہ ظلم و ستم پٹھانوں پر روا رکھا گیا ہے تو ہم اس کے لئے شکوہ سنج نہیں، آخر کبھی انہوں نے بھی اپنے مخالفین کی قسمتوں کے فیصلے تلوار سے میدان جنگ ہی میں

کیے تھے۔ لیکن جب سے علم و تہذیب کی روشنی نمودار ہوئی ہے نئے نئے ستم ایجاد ہوئے ہیں۔ میدان جنگ میں شکست اور پسپائی کے بعد ایک صاحب ہمت بھی قوم کے منتشر شیرازے کو مجتمع اور متحد کرنے کا وسیلہ بن جاتا تھا اور قوم میں ایک نئی زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ لیکن جو ستم تاریخ کے صفحات میں ایجاد ہوئے ہیں وہ ایسا زہر ہیں جن کا کوئی تریاق نہیں۔ یہ زہر رفتہ رفتہ پھیلتا ہے اور سارے وجودِ قومی کو متاثر کر دیتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم کا متحد اور غیر منقسم وجود منتشر اعضا و جوارح کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے۔ مثلاً مخالف مورخ اور حریف اہل قلم نے ایک جملہ لکھ دیا کہ پٹھانوں کا نسلی تعلق بنی اسرائیل سے نہیں آریوں سے ہے یا محمد غوری ضحاک تازی کی نسل سے ہے۔ اسی طرح قطب الدین کی نسل و خاندان پر پردہ ڈال کر اسے غلام اور اس کے قائم کردہ پٹھانوں کے نظام حکومت کو غلام خاندان کا دورِ حکومت قرار دینا۔ دکن کے بہمنی خاندان کا رشتہ برہمنوں سے جوڑ دینا تغلق اور خلجی کو تاتاری النسل لکھ دینا، احمد شاہ ابدالی اور کئی دوسرے پٹھان سلاطین و ملوک کو تاتاریوں یا ہندوؤں کی نسل سے قرار دے دینا وغیرہ واقعات کا تعلق تاریخ کے اسی قسم کے ستم سے ہے۔ چنانچہ اس حقیقت سے کوئی صاحب علم و مطالعہ انکار نہیں کر سکتا کہ برصغیر کے پٹھان بادشاہوں میں محمد غوری سے لے کر احمد شاہ ابدالی اور اس کے قبیلہ ابدالی اور ترین تک کوئی پٹھان بادشاہ یا اس کا قبیلہ ایسا نہیں جو مخالف مورخین کے اس ستم ناروا کا نشانہ نہ بنا ہو۔ جب پہلی مرتبہ کسی کے متعلق اس قسم کی بات کہی گئی ہو گی تو بہت کم لوگوں نے اس کا یقین کیا ہو گا۔ لیکن آج کیا تعجب کہ بہت سے پٹھان بھی ان غلط فہمیوں میں مبتلا ہوں یا وہ اہل قلم جن کا خاص موضوع پٹھانوں کی تاریخ اور ان کی اصلیت نہیں یا تحقیق و تبحر سے جن کی نظر نا آشنا ہے اور جنہوں نے صرف نقل و اقتباس کو تاریخ نگاری کا کمال سمجھ لیا ہے یا وہ سادہ لوح قاری جو کسی خود غرض مصنف اور صاحبِ قلم کی دسیسہ کاری کا اندازہ نہیں لگا سکتا اور سطحی نظر رکھنے والے کی طرح ہر چمک دار چیز کو سونا سمجھنے لگتا ہے ان غلط فہمیوں کا شکار

ہو سکتا ہے۔

سیاسی تاریخیں تو فرقہ وارانہ جذبات اور قومی اور جماعتی تعصبات کے زیر اثر لکھی جا سکتی ہیں۔ اس لئے ان میں اگر پٹھانوں کے خلاف زہر گھولا گیا اور ان کی سیاسی خدمات اور کارناموں کو اجاگر نہیں ہونے دیا گیا تو تعجب نہ کرنا چاہئے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ مذہبی پیشواؤں کے تذکروں میں بھی یا تو پٹھانوں کے فضائل و محاسن کا اعتراف نہیں کیا گیا اور اگر فضائل کا اعتراف کیا گیا تو ان کی قومیت پر پردہ ڈال دیا گیا۔ حتیٰ کہ بعض غیر افغان بزرگوں نے تو مغل دوستی میں ان علماء و صلحا اور صوفیہ و مشائخ کو "اشرار" تک لکھ دیا جن کا تعلق پٹھانوں سے تھا اور جو سیاستاً مغلوں کے حریف اور مخالف تھے۔

خالص مذہبی محاذ پر بھی ان کے عقائد کے بارے میں غلط بیانیاں کی گئیں۔ پٹھانوں کے بزرگوں اور اکابر قوم کو رسوا کرنے اور انہیں بدنام کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ حمید لودی کے بیٹے نصر اور پوتے ابوالفتح داؤد والئ ملتان کو کافر اور مرتد قرار دیا گیا، بایزید انصاری پر جو پیر روشن کے عرف سے مشہور اور روشنائی تحریک کے بانی ہوئے کفر و الحاد اور زندقہ کے الزامات عائد کئے گئے۔ یہ اس لئے ہوا کہ ان سے مغلوں اور ان کے حلیفوں کی ریاست و امارت کو خطرہ تھا۔ ان کا علم و فضل دین داری اور پاکیزہ سیرت اور پٹھانوں کی ان بزرگوں سے عقیدت دشمنوں کے خلاف ایک مرکز فراہم کر رہی تھی اور ان کی مرجعیت دشمن کے شیرازۂ ریاست و امارت کو منتشر کر دینے کا سبب بن سکتی تھی۔

ان کے خلاف ادبی محاذ بھی کھول دیا گیا اور لطائف و قصص میں مسلمان قوموں میں شاید سب سے زیادہ پٹھانوں کو تضحیک و تذلیل کا نشانہ بنایا گیا۔ ان سے متعلق ایک سے ایک بڑھ کر لطیفے گڑھے گئے، ان کے لئے مقولے وضع کئے گئے اور مثلیں تصنیف کی گئیں، بداخلاقی کی روایتوں کو ان سے منسوب کیا گیا۔ ان کی سادگی اور کم علمی کو بے وقوفی اور جہالت کی علامت بنا دیا گیا۔ یہاں تک ہوا کہ پٹھان اور جہالت کو لازم و ملزوم

بنا دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ وہ پٹھان نہیں جس میں جہالت نہ ہو۔ حالانکہ علم و تہذیب کے فروغ، صنعت و حرفت کی ترقی، اور سیاسی و اقتصادی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاحات سے پٹھانوں کے علاقے کو قصداً محروم رکھا گیا اور مغلوں کے ابتدائی زمانے سے لے کر انگریزوں کے دورِ آخر تک حکومتوں کے سیاسی مفادات اور مصلحتوں کی کارفرمائی رہی اور جو کچھ ہوا ایک سوچی سمجھی پالیسی کے مطابق ہوا۔

پھر اگر پٹھان علم و ترقی یا صنعت و حرفت یا سیاست و اقتصادیات کی دوڑ میں پیچھے رہ کر جہالت، غربت یا کسی بداخلاقی میں مبتلا ہو گئے تو اس کے لئے انہیں نشانہ ملامت کیوں کر بنایا جا سکتا تھا؟ لیکن افسوس کہ یہی ہوا، انہیں ستم ناروا کا نشانہ بنایا گیا اور علم و تہذیب کے نئے پیمانوں سے کام لے کر بیک جنبشِ قلم یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ یہ قوم ہی جاہل، وحشی اور غیر مہذب ہے۔

اس قوم کی مظلومیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس کی سادگی کو خست، سادہ لوحی کو بے وقوفی، کم علمی کو بدتہذیبی، جس کی اصلاح کی کوششوں کو گمراہی، جس کی دینداری کو ضلالت، جس کی غیرت کو جہالت، جس کے فکر و عقیدہ کی پختگی کو ہٹ دھرمی اور جس کی عزیمت و استقامت کو ضد، جس کی حق گوئی کو شرارت، جس کی حریت طلبی کو بغاوت، غرضیکہ جس کے ہر سفید کو سیاہ اور جس کے ہر خوب کو ناخوب بنا کر پیش کیا گیا ہو!

یہ وہ ظلم تھا جس کا کوئی مداوا نہیں۔ آج یہ بات کسی کے بس میں نہیں کہ صدیوں میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کر دیا جائے اور تاریخ و تذکار کی ان تمام کتابوں کو ضبط کر لیا جائے یا ان کے صفحات سے خلافِ واقعہ باتوں کو محو اور الزامات و اتہامات کی سیاہی کو دھو دیا جائے۔

البتہ اب صرف یہ صورت باقی ہے کہ پٹھانوں کی تاریخ کے صحیح واقعات، ان کے کارناموں اور ان کی سیرت کے اُجلے نقوش کو زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے اور تاریخ کو ایک صالح قومی تحریک کی شکل میں پیش کیا جائے۔ ضروری ہے کہ اس

کے دو محاذ ہوں۔

- سب سے پہلے تو پٹھانوں کے اندر ان کی قومی تاریخ ان کی شاندار روایات اور ان کے بزرگوں کے کارناموں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔ اور اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ آج کے پٹھان جہالت، توہمات اور اخلاق کے جن رذائل میں مبتلا ہیں ان سے انہیں نجات ملے۔
- دوسری ضرورت اس امر کی ہے کہ پٹھانوں سے باہر مختلف زبانوں میں، چھوٹی بڑی مختلف کتابوں میں ان غلط بیانیوں کی تردید کی جائے۔

روشن خان نے کچھ اسی قسم کے جذبات سے مجبور ہو کر قلم اٹھایا ہے اور پٹھانوں کی تاریخ کے چند خاص مباحث پر اپنے مطالعہ و تحقیق کو اہل علم کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس کے لئے اسلوب منفی اختیار کرنے کے بجائے مثبت ہی اختیار کیا ہے۔ دراصل میں ان کے اسلوب کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی تحریر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ محض غلط فہمیوں کو دور کرنا اور غلط بیانیوں کی تردید کرنا چاہتے ہیں بلکہ انہوں نے تاریخ کے ان ابواب کو موضوع بنایا جن میں بیشتر غلط فہمیاں پیدا کر دی گئیں تھیں یا وہ واقعات جن کے سبب سے غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں۔ روشن خان نے اس سلسلے کے صحیح واقعات کو پیش کر دیا اس طرح غلط فہمیاں خود بخود دور ہو گئیں اور غلط بیانیوں کی تردید بھی ہو گئی اگر وہ تاریخ کے چہرے سے نقاب الٹنے اور اس کے صحیح اور حقیقی خدوخال دنیا کو دکھانے کے بجائے غلط بیانیوں کی تردید اور مورخین پر تنقید کو موضوع بناتے تو وہ اپنے مقصد میں اتنے کامیاب نہ ہوتے۔

(۲)

اب میں اس کتاب کے خاص مباحث پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

اس کتاب کی ایک اہم بحث یہ ہے کہ پٹھانوں کی نسل اور ان کی اصلیت کیا ہے؟ وہ بنی اسرائیلی ہیں یا آرین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ روشن خان نے اس مبحث

پر بڑی تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور صرف شجرے پیش کر دینے کے بجائے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کے تذکرے کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھے ہیں۔ اور نہ صرف شجروں کی مدد سے بلکہ تاریخی اور جغرافیائی دلیلوں اور مذہبی معتقدات اور قومی روایات کے تسلسل سے نہ صرف بنی اسرائیل کے حالات کو وہ علم کی روشنی میں لاتے ہیں بلکہ بنی اسرائیل کا پورا تاریخی پس منظر بیان کر دیا ہے۔ اور اس طرح تاریخ بنی اسرائیل کی ان گمشدہ کڑیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جن سے پٹھانوں کے بنی اسرائیلی ہونے پر محکم استدلال کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بائبل کے بیانات و روایات ہی سے استفادہ نہیں کیا بلکہ قرآن حکیم کے محکمات سے بھی استدلال کیا ہے۔ بلاشبہ روشن خان اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔

روشن خان نے پٹھانوں کے بنی اسرائیلی ہونے کے ثبوت کے لیے یہ قدرے دور کا مگر علمی راستہ اختیار کیا ہے اس کا ایک آسان اور قریب کا راستہ بھی تھا اور وہ یہ کہ اسلام نے نسب و خاندان کے معاملے میں سند متصل ہونے کی شرط ہی نہیں رکھی صرف خاندانی روایات کو کافی سمجھا گیا ہے جیسا کہ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ نے اپنے رسالہ "میرے والد ماجد" میں لکھا ہے:

"شریعت نے ان معاملات (نسب و خاندان) میں "سند متصل" ہونے کی شرط نہیں رکھی بلکہ بڑے بوڑھوں کی زبان پر عام شہرت کو کافی سمجھا ہے جس کو فقہا کی اصطلاح میں "تسامع" کہا جاتا ہے"۔

اگر وہ یہ آسان طریقہ اختیار کرتے تو صرف مسلمانوں ہی کو مطمئن کر سکتے تھے لیکن پٹھانوں کے نسب اور نسل کا مسئلہ صرف برصغیر کے محدود علمی و تاریخی حلقے کی بحث نہیں بلکہ تاریخ اقوام عالم کے اہم ترین مباحث میں شمار ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ مذہبی جذبات سے کام لے کر اس مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے اس کے لئے علمی انداز اختیار کیا جائے۔ میں اس نتیجے پر صرف اس کتاب کی اس بحث کے مطالعے کے بعد پہنچا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ روشن خان کے ذہن میں کیا بات تھی۔

ایک اہم بحث دربار رسالت مآبؐ میں قیس عبدالرشید کی سربراہی میں افغان وفد کی حاضری کی ہے ۔ اس کی صحت کے بارے میں پٹھان مورخین، علما، صوفیہ، اہل قلم، اور اسلاف سے لے کر اخلاف تک کبھی کسی کا اعتقاد متزلزل نہیں ہوا۔ پٹھانوں کی تاریخ وروایات میں یہ واقعہ ایک مسلّمہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اب اس کے بارے میں بھی موشگافی کی گئی ہے کہ چونکہ اس وفد کا ذکر احادیث میں نہیں آیا اس لئے اس کی صحت کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ روشن خان صاحب نے نہایت دلائل کے ساتھ اس کا دفاع کیا ہے ۔ ان کا یہ خیال درست ہے کہ قرآن حکیم انسانی ہدایت کی کتاب ہے اور انسانی زندگی کی سعادتوں کے لئے وہ بس کرتی ہے اسلام کے معتقدات اور احکام وفرائض شرعیہ تمام اس میں بیان کر دیئے گئے ہیں لیکن وہ عام معنوں میں کسی اور علم وفن کی کتاب نہیں ہے۔ اس میں انسانی ہدایت ورہنمائی کے لئے بعض واقعات (ایام اللہ) سے ضرور استدلال کیا گیا ہے لیکن وہ اپنے عہد نزول یا اس سے قبل کے تاریخی واقعات کی کوئی انسائیکلو پیڈیا نہیں کہ ہر واقعہ لازماً اس میں موجود ہو۔ یہی بات احادیث نبوی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے احادیث میں عہد نبوی کے ہزاروں واقعوں کا کلاً یا جزواً یا مستقلاً یا ضمناً ذکر آیا ہے اور اس عہد کے لئے وہ تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہیں لیکن عرب وحجاز کی تاریخ یا تاریخ کے فن میں وہ بہر حال نہیں ہیں ۔ اور صرف اس وجہ سے کہ قرآن حکیم یا احادیث رسولؐ میں چونکہ ایک واقعہ کا ذکر نہیں اس لئے اس کی تاریخی صحت کا انکار کر دیا جائے علمی انداز فکر نہیں ہے ۔ ہم اسے کسی مسلمان مورخ یا اہل قلم کی خوش عقیدگی قرار دے سکتے تھے لیکن افسوس کہ یہ دعویٰ کسی مسلمان اہل قلم کا نہیں بلکہ ایک مستشرق کا ہے جو احادیث پہ ایمان نہیں رکھتا جس کے عقیدے کے مطابق قرآن میں جن ایام اللہ کا یا تاریخی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے ان کی صحت بھی شک وشبہ سے بلند نہیں ۔ ان کے بارے میں مستشرقین کا عام عقیدہ یہ ہے کہ وہ مفروضات یا صرف امثال ہیں ۔ لیکن ایک مستشرق کے اس اعتراض کے بارے میں یہ کسی نے نہیں

سوچا کہ آخر اس میں اس کی کیا مصلحت پوشیدہ ہے کہ پٹھانوں کی ایک مسلمہ تاریخی روایت کی تردید کے لئے وہ ایک ایسی کتاب (حدیث) کے "سکوت" سے استدلال کر رہا ہے۔ جس میں مذکورہ واقعات کی صحت کا وہ خود ہی یقین نہیں رکھتا۔ روشن خان کا یہ استدلال بہت پختہ ہے کہ حدیث کے کسی بیان سے تو تاریخ و واقعات پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سکوت سے تاریخ کے کسی واقعے کی تردید و انکار کے لیے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک الزامی سوال یا اعتراض بھی کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر افغان وفد کے بارے میں حدیث خاموش ہے اور یہ قوی اور معقول استدلال ہے تو افغان نسب کے بارے میں کہ وہ آرین نسل سے تعلق رکھتے ہیں، حدیث میں کہاں آیا ہے؟ پس اگر حدیث کے سکوت سے ایک واقعہ کا انکار کیا جا سکتا ہے تو دوسرے دعوے کی تردید کیوں نہیں کی جا سکتی؟۔

اس سلسلے میں ایک بڑی نازک بحث جنّوں کی حقیقت اور افغان وفد پر جنّوں کے وفد کے اطلاق کی آ گئی ہے۔ روشن خان نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کوئی نئی تعبیر نہیں جنّوں کا اگر اطلاق کسی ایسی جماعت پر کیا جا سکتا ہے جو چھپ کر قرآن سنتی تھی اور اگر ایسی قوم پر کیا جا سکتا ہے جو غیر مہذب، جاہل، گنوار، اجڈ تھی یا اشارہ صحرائی باشندوں اور بدوؤں کی طرف ہے تو پھر اس کا مورد افغان وفد بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ روشن خان بعض دوسرے مفسروں یا دانش وروں کی طرح جنوں کی حقیقت اور ان کے وجود کا انکار نہیں کرتے بلکہ ان کے مخلوق الٰہی ہونے اور خارج میں ان کے وجود کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے خیال کو کسی پر ٹھونسنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی صحت کے صرف امکان کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

"میرے ذہن میں... ایک بات آئی ہے وہ یہ کہ کہیں اس ذکرِ جنّ سے قیس کا وفد مراد نہ ہو؟"

پھر وہ کہتے ہیں:۔

"صفت سے کسی کا متصف اور موسوم ہونا نہ تو خلاف قاعدہ ہے، نہ غیر ممکن"

آگے چل کر وہ قارئین سے صرف یہ التماس کرتے ہیں کہ

"وہ خالی الذہن ہو کر انصاف کے ساتھ اس پہ غور کریں"۔

وہ یہ بات ہرگز نہیں کہتے کہ ان کی بات کو ضرور تسلیم کر لیا جائے۔ ان کے اس انداز فکر سے ان کی اصول و انصاف پسندی کا پتا چلتا ہے۔

ایک طویل بحث کئی بادشاہوں، متعدد امیروں، اور کچھ علماء و مشائخ کے نسب کے بارے میں ہے۔ افغانوں کے نسب کے بارے میں قصداً یا سہواً جو بے شمار غلطیاں ہوئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ یا تو ان سے ناراض ہو کر ان کے نسب کو غلط بیان کیا گیا ہے مثلاً ایبک، تغلق، بہمن، سواتی، خلجی، غوری وغیرہ یہ تمام خاندان اور قبائل خالص پٹھان تھے اور ان میں سے کسی کے نسب کے بارے میں کوئی شک یا شبہ نہ تھا لیکن انہیں غیر مسلم اور مسلمان مگر غیر پٹھان خاندانوں سے وابستہ کر دیا گیا یا ان کے نسب پر پردہ ڈال دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج اکابر علماء و مشائخ کے نسب کے بارے میں عام تاریخوں میں کوئی رہنمائی نہیں پاتے روشن خان نے کئی شاہی خاندانوں اور متعدد علماء و مشائخ کے بارے میں تحقیق کی روشنی میں ہمیں بتایا ہے کہ ان سے نسل و خون کے تعلق کا فخر پٹھانوں کو حاصل ہے۔

بعض اکابر و افاضل اور بعض شاہی سلسلوں کے علاوہ کئی قبیلوں اور خاندانوں مثلاً گدون، برکی، بتنی، لودی، صافی، نرملی، ساغری، کرلانی، ترین وغیرہ کے بارے میں بھی خان صاحب موصوف نے مفصل اور مدلل بحث کی ہے اور پٹھان نسل سے ان کے تعلق کے بارے میں جہاں عدم واقفیت اور کم علمی کی تاریکی پائی جاتی تھی۔ وہاں علم کی روشنی پھیلا دی ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی، حضرت بختیار کاکی اور حضرت امام ابو حنیفہ کے بارے میں نہایت مدلل بحث کی ہے اور جہالت اور غلط فہمی کی تمام تاریکیوں کو دور کر دیا

ہے ۔ حضرت امام ابوحنیفہ کے نسب کے بارے میں فاضل مصنف نے تواریخ حافظ رحمت خانی کے حواشی میں بھی بحث کی تھی ۔ اِس کتاب میں بھی یہ بحث موجود ہے ۔ پہلے میرا تاثر تھا کہ خانصاحب نے تاریخی دلائل کے بجائے نفسیاتی تجزیے پر اپنی تحقیق کے نتائج کا انحصار کیا ہے لیکن اب میرا خیال یہ ہے کہ نفسیاتی تجزیہ تو ایک ضمنی بحث ہے انہوں نے مورخانہ طریق پر حضرت امام ابوحنیفہ کے پٹھان ہونے پر اظہار خیال ہے اور نہایت محققانہ اسلوب پر محکم دلائل اور ناقابل تردید براہین سے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے ۔

پٹھانوں کی تاریخ ونسل کے سلسلے کی بحث کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ پشتو زبان کی اصل اور ماخذ کون سی زبان ہے ؟ وہ مستشرق اور اہل قلم جو انہیں آریہ نسل سے ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں انہوں نے پٹھانوں کا نفسیاتی اور جسمانی تجزیہ بھی کیا ہے اور ان کی زبان پشتو کے اصل و ماخذ کو بھی زیر بحث لائے ہیں جہاں تک نفسیاتی اور فزیکل بحث کا تعلق ہے انہیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ پٹھان اپنے اخلاق وعادات اور مزاج وطبیعت سے بنی اسرائیلی معلوم ہوتے ہیں اور ان کی جسمانی ساخت اور چہرے کے نقوش بھی ان کے بنی اسرائیلی ہونے کی غمازی کرتے ہیں لیکن وہ چونکہ ان کی موجودہ قومی زبان پشتو کے قدیم آرامی، سریانی یا عبرانی زبانوں سے تعلق کو ثابت نہیں کر سکے تھے اس لئے اس نکتے پر انہوں نے اس بحث کا خاتمہ کر دیا اور فیصلہ کر دیا کہ چونکہ پشتو کا بنی اسرائیل کی قومی زبان آرامی، سریانی یا عبرانی سے تعلق ثابت نہیں اس لئے پختون یا پٹھان بنی اسرائیلی نہیں ہو سکتے ۔ یہ ایک ایسا اعتراض تھا کہ کسی پٹھان مورخ سے بھی ابھی تک اس کا جواب نہیں بن پڑا تھا اس لئے انہوں نے بھی اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر لی تھی ۔

روشن خان نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ پٹھانوں کی تاریخ کی ایک عظیم الشان بحث ہے اور پہلی بار اس اعتراض کا مسکت جواب دیا گیا ہے ۔ یہ بحث پڑھنے کے بعد تعجب ہوتا ہے کہ حقائق کی طرف سے مورخین اور مستشرقین نے کس طرح اغماض برتا

کیسے کیسے بودے اعتراضات کیے گئے اور تاریخ کے چہرے کو مسخ کرنے کی کیسی کیسی جسارتیں کی گئیں۔ روشن خان آرامی، سریانی یا عبرانی کے عالم نہیں، وہ ماہر لسانیات بھی نہیں اس کے باوجود عبرانی زبان کا جو ذخیرہ الفاظ ان کی دسترس میں آیا اس میں سے سینکڑوں الفاظ انہوں نے نکال کر رکھ دیے جو پشتو میں مستعمل ہیں۔ ایک اچھا خاصا ذخیرہ تو ایسے الفاظ کا انہوں نے مہیا کر دیا ہے جو نہ صرف اصل کے لحاظ سے عبرانی ہیں بلکہ آج تک لفظاً اور معناً پشتو زبان میں اسی طرح استعمال ہوتے ہیں جس طرح وہ اپنی اصل زبان عبرانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انہوں نے آیندہ اس طرف توجہ کی تو وہ تھوڑی سی کوشش سے عبرانی اور پشتو زبان کے یکساں تلفظ اور ہم معنی الفاظ کی ایک ڈکشنری مرتب کر دیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ بالفرض وہ اپنے معمولات زندگی میں اس طرف توجہ نہ کر سکیں تب بھی انہوں نے ایک اہم موضوع کی طرف اہل تحقیق اور ماہرین لسانیات کی رہنمائی کی ہے اور جہاں تک مخالفین کے اس اعتراض کا تعلق ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ تو یہ بات ماننی ہی پڑے گی کہ روشن خان نے اس اعتراض کا تمام تار و پود بکھیر دیا ہے اور اس طرح ایک طرف تو پٹھانوں کے بنی اسرائیلی ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ دوسری طرف انہوں نے پشتو زبان کے آغاز کی تاریخ کو کئی صدی پیچھے پہنچا دیا ہے۔ پشتو زبان کی تاریخ کے ماہرین کے لئے یہ بہت اہم نکتہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ لسانی تحقیق کے لئے یہ نکتہ چراغ ہدایت کا کام دے گا۔

اس میں ایک دلچسپ بحث پٹھانوں کے مختلف ناموں اور ان کے پس منظر کی بھی ہے۔ اس میں روشن خان نے بتایا ہے کہ بنی اسرائیل کے ان قبائل کے لئے جو اپنے وطن سے نکلے اور افغانستان اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دور دراز تک پھیلتے چلے گئے اور افغان، پختون، پٹھان وغیرہ ناموں سے مشہور ہوئے تو ان کی وجوہ کیا ہیں۔ یہ ایک ہی مسمیٰ کے مختلف نام ہیں یا ان میں فرق ہے؟ خان صاحب کی تحقیق کے مطابق نسلاً ان میں کوئی فرق نہیں یہ ایک ہی حقیقت کے

مختلف اظہار، ایک ہی شجر طیبہ کے مختلف برگ وبار اور ایک ہی اصل کے فروع ہیں۔ جس طرح پٹھان مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم ہوئے تھے اور اپنے تعارف کے لئے اپنے کسی بزرگ کے نام کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا یہی عمل قومی نام کے سلسلے میں ہوا کہ مختلف قبائل نے کسی علاقے سے نسبت یا کسی قومی بزرگ کے نام کو اپنے لیے ذریعہ تعارف قرار دے لیا اور اس طرح افغان، پختون یا پٹھان کے نام مشہور ہوئے۔ خواہ عام لوگ ان ناموں میں نسبتوں کو معلوم کرنے میں ناکام رہے ہوں۔ لیکن اہل علم سے ان کی اصلیت کبھی پوشیدہ نہ تھی۔ یہ بحث اور کتابوں میں بھی آئی ہے لیکن سب ہی مورخ اور مصنف اس مقام سے سرسری گزر گئے۔ روشن خان نے قدرے تفصیل اور تحقیق کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

روشن خان ایک روایتی پٹھان کی طرح دینی جوش وجذبات سے سرشار ہیں لیکن کئی اہم اور نازک مواقع پر جہاں ان کی مورخانہ حیثیت ان کی دینی عصبیت سے متاثر ہو سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے قلم کو متعصبانہ جذبات سے صاف بچا لیا ہے ان ہی سے ایک مقام پر اکبر اور اورنگ زیب کا تذکرہ ہے۔ اگر اکبر شمالی مغربی سرحد پر پٹھانوں سے درگزر کرتا تو وہ مشرق میں اور جنوب میں اپنے حدود مملکت کو اس سے بہت آگے بڑھا سکتا تھا جہاں تک وہ تھے لیکن وہ کچھ اپنی "راج ہٹ" اور کچھ اپنے عاقبت نااندیش امرا کے مشوروں سے متاثر ہو کر بیس برس تک صرف پٹھانوں کو یا دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کی بہترین قوتوں کو نیست ونابود کرنے یا ان پر غلبہ حاصل کرنے اور انہیں نیچا دکھانے کی کوششوں میں مصروف رہا۔ اسی خصلت کو اس کے جانشینوں نے ورثے میں پایا تھا حتیٰ کہ اورنگ زیب تک کو یہی فکر دامن گیر رہی۔

اورنگ زیب کی دین داری اپنی جگہ، لیکن مسلمان اہل قلم مذہبی جوش میں اس پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ وہ ایک مطلق العنان بادشاہ بھی تھا، جس کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ اقتدار کی جنگ میں اس نے اپنے بھائیوں کے

ساتھ ٹھیک ٹھیک وہی برتاؤ کیا جو ایک آمر مطلق کو اپنے حریفوں کے ساتھ کرنا چاہیئے تھا۔ اس کی مطلق العنانی اور اس کے آمرانہ رویے کی بدولت مسلمانوں کی کئی قومیں تباہ و برباد ہوگئیں جن میں پٹھان بھی تھے اور اگر وہ کم از کم پٹھانوں ہی کے معاملے میں جو اس کے ہم قوم نہ سہی ہم مذہب ضرور تھے، اپنی نظر کو بلند اور قلب کو فراخ رکھتا تو اس پٹھان قوت سے اسلام اور مسلمانوں کی پشتیبانی کا کام لیا جا سکتا تھا اور مغل حکومت کا وہ زوال جو اس کی وفات کے فوراً بعد شروع ہوگیا، اتنی جلد شروع نہ ہو جاتا۔

فاضل مصنف کے لئے دوسری آزمائش محمود غزنوی کے ضمن میں پیش آسکتی تھی۔ مسلمان مورخین نے اسے عام طور پہ ایک مجاہد اسلام اور بت شکن کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس کے تذکرے میں مسلمان مورخین کا قلم جھوم جھوم اٹھا ہے اور دل جوشِ مسرت سے اچھل اچھل پڑا ہے لیکن کیا اس نے جو کچھ کیا وہ واقعی جہاد تھا؟ کیا اس کا کردار اسلام سے سچی محبت اور تبلیغ دین کے حقیقی جذبات، دعوتِ توحید اور سچی بت شکنی کا آئینہ دار ہے؟ روشن خان نے اس کی شخصیت کے اس پہلو پر تفصیلی روشنی تو نہیں ڈالی، اس کا موقع بھی نہ تھا لیکن انہوں نے اس کے سلسلۂ بیان میں بڑے پُرمعنی اشارے کئے ہیں۔ اس کے بعض جانشینوں مثلاً بہرام شاہ کا رویہ پٹھانوں کے خلاف افسوسناک تھا۔ روشن خاں نے اس کی پٹھان دشمنی کے پس منظر میں بعض خاص چہروں اور ان کی ریشہ دوانیوں کی نشان دہی کی ہے لیکن پٹھانوں کی اسلامی قوت اور غور کے دینی اور ملی مرکز کو اس نے نقصان پہنچانے کی جو کوشش کی اس کا ذمہ دار صرف وہی تھا۔ محمود غزنوی خصوصاً اس کے جانشینوں نے پٹھانوں کو نظر انداز کر کے ان کے دشمنوں کو جس طرح سرفراز کیا اس سے تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور متعدد اشارے اس کتاب میں بھی موجود ہیں۔

اس کتاب کی خوبیوں کے اور بھی کئی پہلو ہیں لیکن ایک مختصر تحریر میں جو اس کتاب میں بطور مقدمہ شامل ہو رہی ہے اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہر

خوبی پر روشنی ڈالی جائے اور قارئین کو اس جانب متوجہ کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ کتاب کی خوبیاں قارئین کی نظروں کو خود اپنی طرف متوجہ کر لیں گی لیکن اس کتاب کی ایک خوبی کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ وہ خوبی یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اس میں دو درجن سے زیادہ نقشے بھی شامل کیے ہیں جن میں تقریباً ان تمام اہم اور تاریخی مقاموں، علاقوں، شہروں، راستوں، دریاؤں، پہاڑوں وغیرہ کی نشاندہی کر دی ہے اور ان کا محل وقوع بتا دیا ہے جن کا ذکر کتاب میں آیا ہے۔ نقشوں کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مختلف قبیلوں کے وطن کون کون سے شہر یا علاقے تھے۔

تاریخ کی کتابوں میں عام طور پر یہ خامی پائی جاتی ہے کہ قاری کو تاریخ و واقعات کا علم ہو جاتا ہے لیکن ان کی جائے حادثہ اور سمتوں کا پتا نہیں چلتا روشن خان نے اس میں نقشوں کی شمولیت کا جو اہتمام کیا ہے اس سے کتاب کی افادیت بھی بڑھ گئی ہے اور مطالعہ کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

(۳)

پٹھانوں کی تاریخ کبھی تاریکی میں نہیں رہی۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کی ایک ایک کڑی علم کی روشنی میں گئی اور مطالعہ کی نظر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ قوم اپنے دینی، سیاسی، اخلاقی خصائص کے اعتبار سے کبھی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئی۔ بلاشبہ قوم کے افراد ستاروں کی طرح ابھرتے، چمکتے، ڈوبتے اور نظروں سے اوجھل ہوتے رہے لیکن جن قبائل سے ان اکابر قوم کا تعلق تھا وہ کبھی تاریخ کے پس منظر میں نہیں گئے اور ان قبائل کا قوم سے تعلق کبھی مشتبہ نہیں ہوا۔ اس کی تاریخ صرف اسی بنا پر نہیں لکھی گئی کہ وہ تاج و تخت کی مالک بھی رہی تھی بلکہ اسے دنیا نے اس بنا پر بھی فراموش نہیں کیا کہ اس نے غلامی اور جلا وطنی کے ایام میں بھی اپنی قومی سیرت کو برقرار رکھا تھا۔ اس قوم کی آواز کو دنیا نے صرف اسی بنا پر آویزہ گوش نہیں بنایا کہ وہ بادشاہوں اور حکمرانوں کی

آواز تھی بلکہ دنیا اس کے لیے ہمیشہ ہی گوش بر آواز رہی خواہ وہ تخت حکومت پر ہو، خواہ تختۂ دار پہ، خواہ وہ سجادۂ طریقت پہ ہو یا مسندِ علم و فضل پہ ہو۔ اس لیے کہ اس کی آواز ہمیشہ صداقت کا بلاوا، ایمان کی دعوت اور اخلاق و سیرت کے پکار رہی ہے۔

پٹھانوں کی نسل پھیلتی اور قبیلے بڑھتے رہے۔ پھر ان قبیلوں سے مختلف خاندان بنے، خاندانوں کی شاخیں نکلیں۔ پھر ان شاخوں میں مختلف نامور پیدا ہوئے جن کے اخلاف نے ان سے اپنی نسبت قریبہ کو اپنے لئے باعث اعزاز و افتخار سمجھا۔ پھر یہ نسل، قبیلے، خاندان، ان کی شاخیں اپنے جد اعلیٰ یا اسلف الاسلاف سے جتنی دور ہوتی گئیں اتنا ہی اپنے اصل و جد سے ان کا تعلق کمزور ہوتا گیا۔ اگرچہ وہ اپنے لئے تاریخ کا ایک قابل فخر سرمایہ بھی فراہم کرتی گئیں لیکن نتیجہ دونوں باتوں کا یہی نکلا کہ ہر شاخ اور ہر نوع گرد و پیش اور ماحول کے مطابق تاریخ و ثقافت کے نئے سانچوں میں ڈھل کر ایک نئی قوم کی شکل اختیار کرتی گئی حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ انھوں نے اپنے جد اور اصل سے نسلی اور نسبی تعلق کو بالکل فراموش کر دیا۔ اور جیسا کہ تاریخ میں اقوام کے ساتھ ہمیشہ برتاؤ ہوا ہے۔ پٹھانوں کے ساتھ بھی ہوا۔ ان قبیلوں اور خاندانوں کو گرد و پیش کی مناسب آب و ہوا میسر آئی اور حالات سازگار ہوئے تو انھوں نے اپنی مستقل اور آزاد حکومتیں قائم کر لیں اور تاج و تخت کے مالک بھی بن گئے اور حالات نے جن کے ساتھ مساعدت نہ کی یا اپنی جہالت، بداخلاقی، بے دینی اور دیگر مختلف اسباب کی بنا پر وہ اپنے قومی اور نسلی خصائص برقرار نہ رکھ سکے وہ عزت و افتخار کے مقام سے نیچے گر گئے اور وقت کی سیاسی مصلحتوں یا مورخ کی ظالمانہ جہالت و ناواقفیت یا تعصب کی بدولت انہیں تاریخ میں جرائم پیشہ قوم تک لکھ دیا گیا۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ تاریخ اقوام عالم خصوصاً برصغیر کی اقوام پر از سر نو تحقیقی نظر ڈالی جائے اور ایک نئی تاریخ مرتب کی جائے تاکہ مورخ کے اس ظلم ناروا کی تلافی ہو سکے۔

ہمیں روشن خان کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس عظیم الشان دور کا آغاز کر دیا ہے۔ ان کے قلب میں مدت سے تاریخ کے اس ظلم کے خلاف انگیٹھی دہک رہی تھی۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس کی گرمی، حرارت اور جذبات کی شدت اور سوز دروں کو دوسرے بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے قلب میں دہکتی ہوئی انگیٹھی کو ایک ظاہر اور بھڑکتے ہوئے الاؤ کی شکل دے دی ہے۔ اگرچہ انہوں نے تواریخ حافظ رحمت خانی کے حواشی میں اور خصوصاً اپنی اس کتاب میں اس الاؤ کو بھڑکتے رکھنے کے لیے کافی سروسامان مہیا کر دیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس آگ کو بھڑکانے، شعلوں کو دہکانے اور الاؤ کو روشن رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ان کے قومی جذبات کو ایک تحریک کی شکل دے دی جائے اس کے لئے قومی درد رکھنے والے نوجوان اہل قلم کو آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

میں اس طرف سے بھی مایوس نہیں ہوں۔ تواریخ حافظ رحمت خانی اور خصوصاً اس کے حواشی کے مطالعے سے پڑھے لکھے طبقے میں احساس جاگنے لگا ہے اور بیداری پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔ میں خود قومی تاریخ کی طرف سے ایک بے حس شخص تھا لیکن آج میرے سینے کے اندر افکار و خیالات اور جوش و جذبات کا ایک طوفان برپا ہے اور بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ کام صرف ایک شخص کے کرنے کا نہیں اس کی ذمہ داری صرف روشن خان ہی پر عاید نہیں ہوتی بلکہ اس کی ذمہ داری میں پوری قوم شامل ہے۔ اس کے لئے صرف ان کی تنہا کوششیں اور صرف ان کا تنہا قلم کافی نہیں بلکہ ایک علمی و تحقیقی ادارے اور اکیڈمی کے قیام اور پوری قوم کے تعاون کی ضرورت ہے مجھے امید ہے کہ روشن خان کی بلند ہمتی، اولوالعزمی اور ان کا ایثار اور قومی تاریخ کی تالیف و اشاعت میں ان کی یہ کوشش ایک نئی قومی زندگی کے آغاز کا باعث ہو گی۔

ابوسلمان شاہجہانپوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تَذْكِرَةُ الْاَبْرَارِ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَبْصَارِ

(نیک لوگوں کے تذکرے میں اہلِ نظر و بصیرت کیلئے عبرت اور نصیحت ہے)

حضرت ابراہیمؑ —— اولاد ابراہیمؑ

قرآن میں ذکر آیا ہے، یہ کہ ہم نے خاندان ابراہیمؑ کو کتاب (آسمانی) دی اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بھی دی۔

خاندانِ ابراہیمی کی یہ ساری فضیلتیں بالکل ظاہر ہیں۔ اس خاندان کی دو اہم اور بڑی شاخیں بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل ہیں۔ ایک طرف نبوت اور علوم روحانی اور دوسری طرف مملکت و سلطنت، یہ دونوں چیزیں بڑی حد تک انہیں خاندانوں میں رہیں۔ اس کی مثال کسی دوسرے خاندان میں مشکل ہی سے ملے گی۔ (اعلام القرآن)

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے شہر اُور یا اُر میں پیدا ہوئے اُر ایک مشہور آتش کدہ تھا۔ پشتو زبان میں اُور آگ کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کی اصل بھی وہی ہے۔ اُر یا اُور شہر جنوبی عراق میں بغداد کے جنوب مغرب میں ۲۳۰ میل کے فاصلے پر دریائے دجلہ کی ایک شاخ پر واقع ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ۲۱۶۰ ق م میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام تارح تھا۔ وہ نحور بن سروج بن رعو بن فلج ابن عبر کا بیٹا تھا۔ عبر کی نسل اور اس کی قومی زبان اس کی نسبت سے عبرانی کہلاتی ہے۔ عبر کے پردادا سام حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اس کا شجرہ نسب اس طرح ہے عبر بن شلخ بن ارفکشد بن سام بن حضرت نوح علیہ السلام۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے مشہور ہیں۔ سام، حام اور یافث۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب شریعت نبی تھے ان کا مرکز تعلیم و ہدایت عراق تھا۔ یہاں سے ان کی نسل و خاندان کے متعدد نبی عراق، شام، حجاز میں مبعوث ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بھائی اور بھی تھے جن کے نام تاریخ میں نحور اور حاران آئے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام حاران کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔

سارہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی کا نام سارہ تھا۔ تورات میں اس کا املا سری آیا ہے۔ بعد ازاں یہ نام سرۃ استعمال ہونے لگا۔ اسی لفظ کی وہ شکل ہے جو مسلمانوں میں مشہور و مستعمل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت سارہ کے بطن سے تھے۔ حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے تو حضرت سارہ کی عمر ایک سو سال کی تھی۔ حضرت اسحاقؑ حضرت ابراہیم کے دوسرے اور حضرت سارہ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی اولاد بنی اسحاق کے نام سے مشہور ہوئی۔

ہاجرہ

حضرت ہاجرہ مصر کے فرعون ریان کی بیٹی تھیں ریان عراق کا باشندہ تھا

مصر میں بادشاہ ہوگیا تھا۔ مصر میں حضرت ابراہیمؑ کو اس نے اپنا ہم وطن اور ہم قوم پاکر اپنی بیٹی ہاجرہ کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا حضرت ابراہیم نے اپنی پہلی بیوی سارہ کے ایما و اجازت سے ان سے نکاح کرلیا جن کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیل حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی نسل بنی اسماعیلؑ کہلائی۔

قطورہ

حضرت قطورہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی تھیں۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۳۷ سال کی تھی اور حضرت سارہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ قطورہ کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ کی چھ اولادیں ہوئیں۔ جن کے نام زمران، یقشان مدان، مدیان، اسباق، سوخ آئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے یہ بیٹے اور ان کی نسل بنی قطورہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یقشان سے ان کے دو بیٹے شبا اور دودان یا دودال پیدا ہوئے۔

مذہب

جس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اس وقت عراق میں مختلف مظاہر و اصنام کی پرستش ہوتی تھی۔ کوئی آگ کو پوجتا تھا۔ کوئی سورج کی پرستش کرتا تھا، کوئی کسی اور مظہر قدرت کو اپنا خدا سمجھتا تھا۔ کوئی بتوں کے آگے سر جھکاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا نبی بنا کر بھیجا اور توحید کی دعوت دی۔ انہوں نے اپنے اہل وطن و قوم کو مظاہر قدرت اور بتوں کو پوجنے سے روکا۔ اور بت خانے میں گھس کر بتوں کو توڑا اور ان کی تذلیل کی اور اپنی قوم پر اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ بت نہ سنتے ہیں۔ نہ دیکھتے ہیں، نہ حرکت و عمل کی قدرت رکھتے ہیں۔

یہ تم سے بھی زیادہ بے بس اور بے کس ہیں ان کی پرستش تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی ۔ اس لئے تم صرف ایک خدائے قادر، اپنے خالق اور دنیا و آخرت کے نفع و ضرر کے مالک کی عبادت کرو ۔ حضرت ابراہیمؑ نے دین حق کی تبلیغ و اشاعت کے راستے میں اپنی قوم کی مخالفت برداشت کی، سختیاں جھیلیں، حتیٰ کہ انہیں آگ میں ڈالا گیا ۔ ان آزمائشوں سے گذرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں تاریخ رسالت میں ایک خاص امتیاز سے نوازا یہ مقام کسی قریہ یا کسی خاص قوم میں مقام نبوت کا نہ تھا بلکہ دنیا کی تمام اقوام و ملل اور تمام اقطار عالم میں تبلیغ و اشاعت دین اور دعوت اسلام کے لئے ایک مرکزی شخصیت کے قیام کا تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مقام پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے ۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ (البقرہ آیت ۱۲۴)

جب ابراہیمؑ کو اس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تھا اور وہ ان میں پورا اترا تھا، تو خدا نے فرمایا "اے ابراہیمؑ میں تجھے انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں (یعنی دنیا کی آنے والی قومیں تیری دعوت قبول کریں گی اور تیرے نقش قدم پر چلیں گی)۔

بالآخر حضرت ابراہیمؑ شام کی طرف ہجرت کر گئے ۔ اس ہجرت میں آپ کے بھتیجے حضرت لوطؑ اور آپ کی بیوی حضرت سارہ آپ کے ساتھ تھیں ۔ ملک شام کے مقام کنعان میں آپ نے سکونت اختیار فرمائی اور اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ہو گئے اور جب انہوں نے اس دنیا سے سفر آخرت

اختیار فرمایا تو اپنی اولاد کو اسلام پہ قائم رہنے کی وصیت فرمائی اور ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی اسی دین کی پیروی کی۔ قرآن حکیم میں ہے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (البقرۃ آیت ۱۳۱ تا ۱۳۳)

اور پھر اسی طریقہ (دین) کی ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اور (اس کے پوتے) یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔ انہوں نے کہا' اے میرے بیٹو! خدا نے تمہارے لیے اس دین (حقیقی) کی راہ پسند فرمائی ہے۔ تو دیکھو دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو (یعنی فرمانبردار رہو) پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کے سرہانے موت آکھڑی ہوئی تھی اور اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے پوچھا تھا: "میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟" انہوں نے جواب دیا: " اسی خدائے واحد کی جس کی تو نے عبادت کی ہے اور تیرے بزرگوں ابراہیمؑ' اسماعیلؑ اور اسحاقؑ نے کی ہے۔ اور ہم اس کے حکموں کے فرمانبردار ہوں گے اور مسلمان رہیں گے۔"

حضرت ابراہیمؑ کی وفات

حضرت ابراہیمؑ ایک سو پچھتر سال زندہ رہ کر فوت ہوئے۔ اور حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق نے مکفیلہ کے مغارہ میں حتی قوم کے ایک شخص صحر کے بیٹے عفران کے کھیت میں دفن کیا' یہ کھیت حضرت ابراہیمؑ نے اسی غرض سے خریدا

تھا، حضرت سارہ، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، اور حضرت یوسف کے مدفن بھی اسی مقام پر ہیں۔ اس مقام کو خلیل یا بیت اللحم کہتے ہیں جو بیت المقدس سے کم و بیش چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہی مقام حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش بھی ہے۔

حضرت اسمٰعیل ہاجرہ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اسمٰعیل عبرانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں خدا نے میری دعا سُنی۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا نتیجہ تھا۔ اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی برس کی ہو چکی تھی۔ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ چودہ برس کے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ وحی الٰہی کی ہدایت کے مطابق حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو حجاز میں جا کر چھوڑ آئے تھے۔ حجاز میں ان کا قیام فاران کے پہاڑوں کے دامن میں اس مقام پر ہوا جہاں اب مکہ مکرمہ کی آبادی ہے۔

حضرت ابراہیم نے خدا کے حکم سے مکہ میں بیت اللہ (یعنی مسجد حرام) آباد کیا۔ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ اس پاک گھر کے معمار ہوئے۔ اللہ کا یہی گھر عالم انسانی کے لئے گرد آوری کا مرکز اور امن و حرمت کا مقام ہے۔ اس کا حج اس کی تعمیر کے زمانہ سے مقرر ہے اسلام نے بھی اس کو بحال رکھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ایک خواب کی بنا پر حضرت اسماعیلؑ کو اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اخلاص کو قبول فرما کر تمام اہل اسلام پر اس یادگار کو قائم رکھنا واجب قرار دے دیا۔ حضرت اسمٰعیل کی نسل ان کے بارہ بیٹوں سے چلی۔ ان کے نام یہ ہیں۔ نبایوت[۱] یا نبیت۔ قیدار[۲]۔ ادبیل[۳]۔ مبسام[۴] یا بلسام۔ مشماع[۵]۔ دوما[۶] حسّاہ یا منشا[۷]۔ حدر[۸]۔ تیما[۹]۔ یطور[۱۰] یا اطور۔ نافس[۱۱] یا نافیش۔ قیدما[۱۲] یا قدمہ۔ یہ تمام بیٹے اپنے خاندانوں کے رئیس تھے۔ فلپ۔ کے۔ حتی مصنف تاریخ شام کے

مطابق ان کی قومی زبان عبرانی تھی۔ مدت مدید تک اس کا رواج رہا لیکن اپنے وطن سے مہاجرت کا زمانہ جوں جوں طویل ہوتا گیا اور اپنے اجداد سے جیسے جیسے دوری پیدا ہوتی گئی وہ عبرانی بھولتے گئے اور ایک وقت وہ آیا کہ ان کی آبائی زبان خود ان کے لئے اجنبی ہوگئی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ایک سو سینتیس ۱۳۷ برس کی عمر پاکر فوت ہوئے اور مکہ میں دفن ہوئے (بحوالہ پیدائش باب ۲۵ آیت ۱۳ و ۱۷)۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔

حضرت اسحاقؑ جن کو یہودی اضحاک یا ضحاک کہتے ہیں۔ قرآن میں ان کا نام اسحاق آیا ہے۔ حضرت اسحاق پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر ایک سو سال تھی۔ حضرت اسحاقؑ جب جوان ہوئے تو ربقہ بنت بیتوائیل سے ان کی شادی ہوئی۔ بیتوائیل حضرت ابراہیمؑ کے بھائی نحور کا بیٹا تھا اور مِلکہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ گویا حضرت اسحاقؑ کی شادی حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ربقہ کے بھائی کا نام لابن تھا۔ اس کی لڑکیوں سے حضرت یعقوبؑ نے شادی کی تھی۔

ربقہ کے بطن سے حضرت اسحاقؑ کے دو لڑکے پیدا ہوئے ان میں سے ایک کا نام عیص یا عیسو اور دوسرے کا نام یعقوب تھا۔ اس وقت حضرت اسحاقؑ کی عمر ساٹھ برس کی تھی حضرت اسحاقؑ کے بیٹے عیسو کی اولاد شام میں مقیم رہی لیکن حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے حضرت یوسفؑ کی دعوت پر مصر میں ان کے پاس بمعہ اولاد چلے گئے تھے۔ حضرت یعقوبؑ کی ہجرت مصر کے چار سو تیس سال کے بعد حضرت موسیٰؑ انہیں پھر شام میں لے آئے۔

حضرت اسحاقؑ کا بیٹا عیسو جو سرخ و سفید رنگ کا تھا ادوم کہلاتا تھا۔ اس

کی اولاد ادومی کہلاتی ہے۔ عیسو نے حضرت اسمٰعیلؑ کی لڑکی محلت سے شادی کی۔ اس محلت کا دوسرا نام بشماتھ تھا۔ حضرت اسحاقؑ نے ایک سو اسی ۱۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور حضرت ابراہیمؑ کے پاس دفن ہوئے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام جنہیں اللہ تعالیٰ نے اسرائیل کے خطاب سے نوازا تھا حضرت اسحاقؑ کے چھوٹے بیٹے تھے، جب وہ عاقل اور بالغ ہوئے تو حضرت اسحاق نے اس کو کسدیا یعنی عراق کو روانہ کیا تاکہ وہاں جا کر بیتوائیل بن نحور کے بیٹے لابن کی لڑکی سے شادی کرے۔ لابن نے حضرت یعقوبؑ سے اپنی بڑی لڑکی لیا کی شادی کر دی۔ اس کے ساتھ ایک لونڈی بھی دی تھی جس کا نام زلفہ تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد لابن نے اپنی دوسری بیٹی راحیل کا نکاح بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ اس کے ساتھ ایک لونڈی بلہا نامی دی۔ (بحوالہ پیدائش باب ۲۹ آیت ۲۱ و ۲۹)

حضرت اسرائیل کی مندرجہ ذیل اولاد ہوئی۔

۱۔ بی بی لیا سے۔ روبن، شمعون، لاوی اور یہودا پیدا ہوئے۔

۲۔ زلفہ سے۔ جد۔ آشر۔ آشکار یا یسا کار۔ اور زبلون یا روئیل پیدا ہوئے

۳۔ راحیل سے یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے۔

۴۔ بلہا سے دان اور نفتالی پیدا ہوئے۔

حضرت یعقوبؑ کے یہ کل بارہ بیٹے تھے۔ ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی حضرت اسرائیلؑ ایام قحط میں بال بچوں سمیت حضرت یوسفؑ کی دعوت پہ مصر چلے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ایک سو تیس برس تھی۔ مصر میں انہوں نے سترہ ۱۷ برس زندہ رہ کر وفات پائی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ایک سو سینتالیس ۱۴۷ برس تھی۔ حضرت یوسفؑ ان کی میت کو مصر سے کنعان لائے اور ان کے باپ اسحاق کے پاس دفن کر کے مصر واپس چلے گئے۔ حضرت یوسفؑ

کا یہ عمل ان کے باپ حضرت یعقوبؑ کی وصیت کے مطابق تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ ان کی نعش کو کنعان میں باپ دادا کے قبرستان میں لے جا کر دفن کریں۔

حضرت یوسفؑ جب ایک سو دس۱۱۰ برس کی عمر کو پہنچے تو بیمار ہوئے۔ انہوں نے تمام بھائیوں کو جمع کیا اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ ان کی نعش کو بھی کنعان لے جا کر اپنے آبائی قبرستان میں دفن کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات سے مصر میں بنی اسرائیل کے اقتدار کا سورج غروب ہوگیا۔ رفتہ رفتہ ان کی تذلیل اور ان پر تشدد کا آغاز ہوا۔ پھر جب اہل مصر کا یہ ظلم و تشدد اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی نجات کے لئے حضرت موسیٰؑ کو مبعوث فرمایا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون مصر سے کہا بنی اسرائیل کو چھوڑ دو، تاکہ یہ ہمارے ساتھ یہاں سے نکل جائیں۔ فرعون اس کے لئے تیار نہ ہوا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دے۔ لیکن قدرت نے بنی اسرائیل کی نجات کے اسباب پیدا کر دیئے۔ حضرت موسیٰؑ کی راہنمائی میں انہیں فرعون کی غلامی سے نجات مل گئی۔ بنی اسرائیل کو اس وقت مصر میں چار سو تیس۴۳۰ سال گزر چکے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر صرف ان کے مردوں کی تعداد تقریباً چھ لاکھ تھی۔

فرعون کو خبر ملی کہ بنی اسرائیل چلے گئے تو اس نے ایک لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور جب بنی اسرائیل بحیرہ قلزم کے کنارے ڈیرے جما رہے تھے انہیں جا لیا۔ بنی اسرائیل اس کے لشکر کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے انہیں تسلی دی، اور خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کو لے کر سمندر میں داخل ہوگئے۔ سمندر نے انہیں راستہ دے دیا۔ بنی اسرائیل صحیح سلامت پار نکل

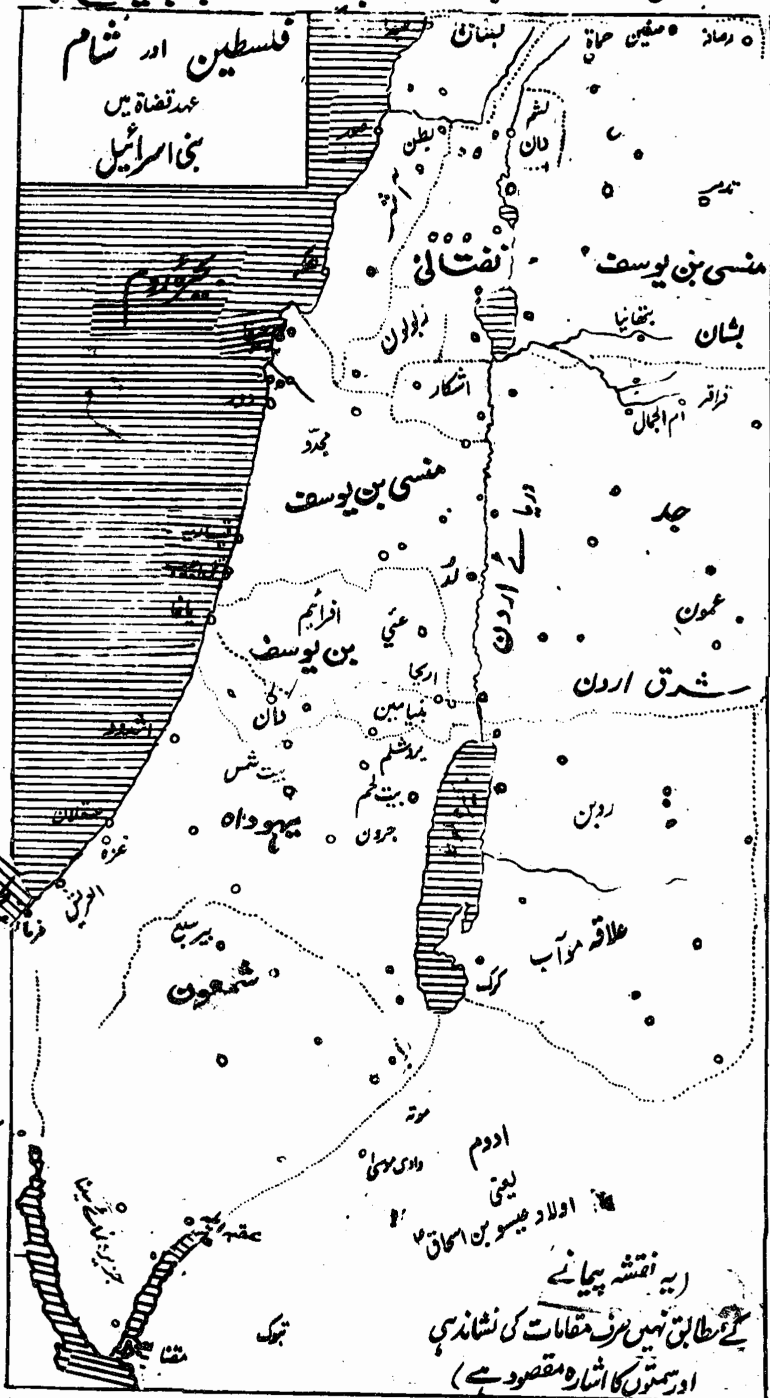
گئے۔ ان کے تعاقب میں فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں بنے ہوئے راستے پر دوڑا لیکن اللہ کے حکم سے پانی اپنی جگہ پر آگیا۔ اور فرعون اور اس کا سارا لشکر سمندر میں غرق ہو گیا۔ وہ جگہ جہاں فرعون غرق ہوا تھا آج کل خلیج سویز کہلاتی ہے۔ موسیٰؑ بنی اسرائیل کو بحیرہ قلزم[1] کے مشرق کی جانب لے گئے۔ پہلے ایلم پہنچے اور کوہ طور کے دامن میں قیام کیا۔ پھر مختلف مقامات پر رہائش اختیار کی حکم ہوا کہ شمال کی سمت میں کچھ اور آگے بڑھ کر اپنے آبائی ملک فلسطین (کنعان) پر قبضہ کر لو جس پر اس وقت عمالقہ قابض ہو گئے تھے۔ اسرائیلی اس قوم کی حربی شوکت وحشمت سے مرعوب ہو چکے تھے۔ اپنے میں ان سے مقابلہ کی سکت نہ پا کر ہمت چھوڑ بیٹھے۔ اس بزدلی و پست ہمتی پر عتاب الٰہی نازل ہوا، کہ اچھا اب چالیس سال تک اسی صحرائے سینا میں بھٹکتے پھرو گے۔ (اعلام القرآن ص ۱۷۹)
بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ کی نصیحت قرآن کی سورۃ مائدہ میں بدیں صورت مذکور ہے کہ:۔

---

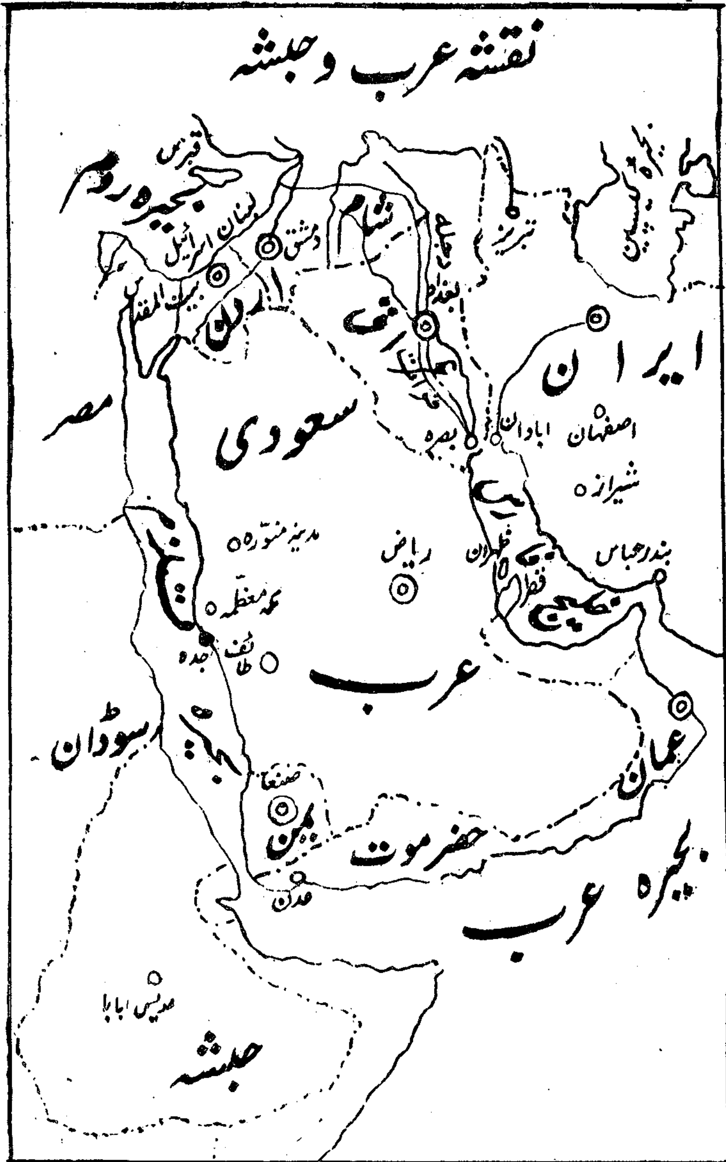
[1] قلزم عبرانی لفظ ہے اس کا صحیح تلفظ کول زم ہے جو کول اور زم دو لفظوں کا مرکب ہے۔ کول کے معنی اصل و بنیاد اور مستقل کے ہیں۔ اصل جس سے فروع (شاخیں) پیدا ہوں، بنیاد جس پر کسی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے یا خاندان کی مرکزی اور بزرگ شخصیت جس سے خاندان اور نسل وابستہ ہوتی ہے۔ مستقل جو بذاتہٖ اپنا وجود رکھتی ہو اور کسی اصل کی فرع نہ ہو۔ زم عبرانی زبان میں پانی کو کہتے ہیں اور یہ لفظ پشتو زبان میں آج تک پانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کول زم کثرت استعمال سے پہلے کلزم ہوا پھر قلزم کا بول چال اور تحریر کی زبان میں رواج ہوا۔ اسی طرح آب زم زم "آب" کے اضافے کے ساتھ اور جیحون کے کنارے آمل زم، خوارزم، گومل زم وغیرہ کی مثالیں موجود ہیں۔ بحر قلزم ایک مستقل اور اصلی سمندر ہے وہ کسی اور سمندر کی شاخ یا حصہ نہیں بلکہ اس کی دو شاخیں خلیج عقبہ اور خلیج سوئز ہیں۔

شمال

نقشہ بمطابق کتاب مقدس ۔ باب یوشع نبی



"یٰقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علیٰ ادبارکم فتنقلبوا خٰسرین ۝ (المائدہ پ ۶)



ترجمہ :- اے قوم اس ارضِ مقدسہ میں داخل ہو جاؤ۔ جسے اللہ نے تمہاری مقدر میں لکھی ہے۔ اور پیچھے مت پھرو ورنہ تمہیں شکست و خسارہ ہوگا۔

ماخوذ از تورات

حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ چلو ہم اپنا وہ مقدس ملک لے لیں جسے اللہ نے ہمیں دینے کا عہد کیا ہے، مگر مصر میں بہت عرصے تک غلامی میں رہنے کی وجہ سے ان کی آزادانہ فطرت اس درجہ بدل گئی تھی کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے بار بار ہمت دلانے اور آزادی کی زندگی کی ترغیب دینے پر بھی کسی طرح آمادہ نہ ہوئے، یہی وجہ تھی کہ اللہ نے انہیں چالیس سال تک میدان تیہہ میں بھٹکنے پر مجبور کر دیا تاکہ اس مدت میں ایک نئی نسل تیار ہو جائے جو آزادی کی قدر کو سمجھ سکے اور عزتِ نفس کی مالک ہو اور پرانی نسل جو مصر میں غلامانہ ماحول میں بڑھی پلی ہے وہ مر کھپ جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا جو لوگ اُس وقت جوان اور بوڑھے تھے وہ سوائے یوشیع اور کالب کے سب مر گئے اور ایک نئی نسل نے جوان ہو کر اُن کی جگہ لے لی۔ یہ عزتِ نفس کی مالک تھی، آزادی کی قدر دان تھی اور غلامی کی زندگی گزارنے کے بجائے فرماں روائی کی خواہش سے اُن کے سینے پھولے ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل کی یہ نئی نسل خلیج عقبا کے کنارے کنارے اُردن کی طرف بڑھتی رہی یہاں تک کہ شرقِ اردن کے دو بادشاہ سیحون اور عوج پر حملہ کر کے انہیں شکست دی اور اُن کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اُس وقت اسرائیل کا مرکز موآب کا میدان تھا، موآب کے میدان میں حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو مخاطب کیا اور کہا :-

"اے بنی اسرائیل ! جب تم دریائے اردن عبور کر کے مُلکِ کنعان میں داخل ہو تو وہاں کے تمام بتوں کو توڑ ڈالنا اور اُس مُلک پر قبضہ کر کے اُس میں بسنا کیونکہ خدا نے وہ مُلک تمہیں دیا ہے۔ تم قرعہ ڈال کر ملک کو اپنے گھرانوں میں میراث کے طور بانٹ لینا، جس خاندان میں زیادہ آدمی ہوں اُسے زیادہ حصہ ملنا چاہیے اور جس خاندان میں کم آدمی ہوں اُسے کم پر راضی ہو جانا چاہیے اور جس خاندان کے قرعہ میں جو جگہ نکلے وہ اس کا حصہ ہوگا۔ تم اپنے آبائی قبائل کے مطابق اپنی اپنی میراث لینا۔ لاویوں کے رہنے کے لیے انہیں گاؤں دینا اور گاؤں کے نواح کی اراضی بھی اُن ہی کو دے دینا، گاؤں ان کے رہنے کے لیے اور نواح کی اراضی اُن کے چوپایوں کے لیے ہو (لاوی اُن میں علماء کا طبقہ تھا) یعنی ہر قبیلہ اپنی میراث کے مطابق لاویوں کے لیے مسکن اور زمین دے، حضرت موسیٰؑ نے قوم کو وصیت کی اور یوشیع بن نون کو بنی اسرائیل کا پیشوا مقرر کیا اور نصیحت کی کہ تم میرے بعد یوشیع ن... دی کرنا اور ان کی ہدایت پر چلنا وغیرہ وغیرہ۔ حضرت موسیٰؑ نے ایک سو بیس سال

کی عمر میں موآب کے ملک شرقِ اردن میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔"

عروج بنی اسرائیل

کچھ عرصہ بعد بنی اسرائیل نے فلسطین کے گرد و نواح کے تمام علاقے قبضہ میں کر لیے جس میں اکتیس[۳۱] بادشاہ تھے۔ ان تمام ممالک کو حضرت موسیٰؑ کی وصیت کے مطابق بنی اسرائیل کے قبائل میں تقسیم کر دیا گیا۔ وہ ان علاقوں میں تقریباً چودہ سو[۱۴۰۰] برس تک حکمران رہے۔ قیام حکومت کے بعد بنی اسرائیل چار سو سال سے زیادہ امور سیاست کے تصفیہ و احکام کے اجرا کے لیے ہمیشہ ستّر سردار منتخب کرتے رہے اور دینی و دنیاوی نظام کو وہ اس طرح چلاتے رہے لیکن اس کے بعد جب پڑوس کے ممالک سے نبرد آزمائی شروع ہو گئی اور حالات میں رفتہ رفتہ انقلاب پیدا ہوا اور انہیں اپنی سلطنت کی طرف خطرہ پیدا ہوا تو انہوں نے طالوت کو اپنا بادشاہ مقرر کر لیا۔ حضرت طالوت کی رہنمائی میں بنی اسرائیل کو پھر جاہ و حشمت حاصل ہو گئی۔ فلسطین کا کافر بادشاہ جالوت مارا گیا۔ حضرت طالوت نے سینتالیس سال تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ ان کے انتقال پر حضرت داؤدؑ تختِ حکومت پر رونق افروز ہوئے۔ حضرت داؤدؑ نے چالیس[۴۰] سال تک نہایت تزک و احتشام کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد انتقال فرمایا۔ اُن کے جانشین حضرت سلیمانؑ ہوئے۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں بیت المقدس کی اعلیٰ پیمانے پر تعمیر کی جس کی وصیت اُن کے والد حضرت داؤدؑ نے انھیں کی تھی اس مقدس مسجد کی تعمیر چار سال میں مکمل ہوئی۔ اُس وقت حضرت موسیٰؑ کی وفات کو پانچ سو سال گزر چکے تھے۔ حضرت سلیمانؑ نے تقریباً باون سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔

سرزمین مقدس شام

اس مضمون میں چونکہ بنی اسرائیل کے مرکز اور سرزمینِ انبیاء ملکِ شام کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اس کی تاریخی عظمت اور مذہبی بزرگی پر چند الفاظ میں روشنی ڈال دی جائے۔ بنی اسرائیل اگرچہ سیاسی انقلابات کی بنا پر بامعاشی مجبوریوں کے تحت مشرق وسطیٰ اور شمال مغربی ایشیا کے مختلف دیار و امصار میں پھیل گئے تھے لیکن اُن کی تگ و دو کا اصل میدان شام و فلسطین کی مقدس سرزمین رہی۔ بیت المقدس تو ہمیشہ ان کی مذہبی زندگی کا مرکز رہا ہے۔ ابو محمد حسن شعری صاحبِ زُبدۃ الاخبار کے بیان سے اس سرزمینِ مقدس کی مرکزیت اور شان و عظمت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شام ایک ملک ہے جسے خدا نے ارضِ مقدسہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ کل خوبیوں کے دس حصوں میں نو حصے شام میں ہیں اور باقی ایک حصہ تمام جہان میں، یہاں زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں حضرت جبرئیلؑ نے نزول نہ کیا ہو۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے اکثر اسی ملک سے اٹھے ہیں اور شام میں بہترین علاقہ فلسطین ہے یہاں مرکزی شہر بیت المقدس ہے کہ مہبطِ وحی (نزول وحی کی جگہ) و محلِ توطن انبیائے بنی اسرائیل واقع ہوا ہے۔ عبرانی زبان میں اس شہر کو ایلائی کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور اسے اُورشلیم یا یروشلم بھی کہا گیا ہے۔ بنی اسرائیل جب یہاں متوطن ہوئے تو حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں اس شہر کی آبادی میں متوجہ ہوئے اور بہ اتفاق علمائے بنی اسرائیل مسجدِ اقصیٰ کی بنیاد رکھ دی گئی جب اس کی دیواریں انسانی قد کے برابر پہنچیں تو تعمیر کا کام بند پڑ گیا حتیٰ کہ حضرت سلیمانؑ برسرِ نبوت و خلافت ہوئے تو مسجدِ اقصیٰ اور شہر مقدس کی تعمیر کا کام مکمل ہوا اور شہر کو فصیل سے بارہ دروازوں میں محفوظ بنایا اور مسجد اقصیٰ شہر کے مشرقی حصہ میں واقع ہوئی۔ دنیا میں سب سے پہلی مسجد جو کعبہ شریفہ کے بعد بنائی گئی یہی مسجد ہے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مسجد اقصیٰ میں ایک بالشت بھی ایسی زمین نہیں جہاں کسی پیغمبر نے نماز ادا نہ کی ہو۔ یہاں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے نماز ادا کی ہے"۔

آگے چل کر صاحبِ زُبدۃ الاخبار لکھتے ہیں:

"اصطخر سالہا سال تک شاہانِ عجم کا دار الحکومت رہا تھا۔ مشہور ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا دار الحکومت بھی یہ شہر تھا۔ قرآن کریم میں آیا ہے: غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ وہ صبح کو شام میں ہوتے اور دن اصطخر میں گذارتے اور اکثر شبہا (راتیں) کشمیر میں بسر کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کا یہی طریقہ ستنول اور صنعا (یمن) میں بھی تھا"۔

پختون چونکہ بنی اسرائیل کی اولاد ہیں اس لیے ان کا وطن اصلی و آبائی یہی سرزمین شام ہے اور بار و۔ اس سرزمین سے ان کے جذباتی اور روحانی تعلق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بنی اسرائیل اور ان کا امتیاز

حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا :

یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (قرآن، سورۂ مائدہ، آیت ۲۰)

"اے میری قوم تم یاد کرو خدا کی اس نعمت کو جو اُس نے تم پر کی ہے۔ اس طرح کہ ایک طرف تم میں انبیاء پیدا کیے اور دوسری طرف تم کو بادشاہت دی اور تم میں سے بادشاہ ہوئے۔ یہ وہ نعمت ہے جو دنیا میں کسی قوم کو یکجا طور پر نہیں دی۔"

حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے یہ بھی فرمایا :

"اگر تم نے خدائی عہد کی تعمیل کی تو تم میں سے بادشاہ بھی ہوں گے اور خدا ہر طرح تم کو انعام کرتا رہے گا اور اگر تم نے خدا سے نافرمانی اور بدعہدی کی تو تم سے نبوت اور بادشاہت سب نعمتیں چھین لی جاویں گی اور غیر نسل کے بادشاہ تم پر مسلّط کر دیئے جاویں گے اور خدا تمہیں زمین کے ایک سرے سے دوسرے تک اقوام عالم میں منتشر کر دے گا۔" (تورات، استثنا، باب ۲۸)

بنی اسرائیل

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اعلام القرآن میں لکھتے ہیں کہ سورۃ البقرہ سے لے کر سورۃ الصف تک تقریباً چالیس بار یہ لفظ آیا ہے اکثر بصورتِ خطاب۔

اسرائیل دوسرا نام حضرت یعقوبؑ کا ہے۔ یعقوبؑ بن اسحٰقؑ بن ابراہیمؑ خود ہی نبی نہیں بلکہ نبی زادے اور ایک نبی کے پوتے بھی تھے۔ حضرت یعقوبؑ کے بارہ فرزندوں سے جو نسل آگے کو چلی، وہی بنی اسرائیل کہلائی۔ اور اس کا مذہب یہودیت ہے۔ ایک مذہبی نسل کے اعتبار سے تاریخ میں اس کی عظیم الشان اہمیت ہے۔ توحید کی علمبرداریہ بہ حیثیت کم قوم و نسل کے بھی ایک مدت تک دنیا میں رہی اور سو دو سو سال تک نہیں، تقریباً دو ہزار سال تک اس نسل سے انبیاء و مرسلین پیدا ہوتے رہے، اور دنیوی عروج بھی اسے صدیوں تک حاصل رہا۔ داؤدؑ و سلیمانؑ جیسے عظیم الشان بادشاہ اور یوسفؑ جیسے عظیم المرتبت وزیرِ سلطنت اسی قوم سے اٹھے۔

بنی اسرائیل کا لفظ قرآن مجید میں جہاں بھی آیا ہے اُس سے مراد حضرت یعقوبؑ کے صلبی بیٹے نہیں بلکہ نسل اسرائیل ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت (سے پہلے) یہ لوگ اپنے وطن شام (یا اگر اسے محدود کر دیجیے تو فلسطین) سے نکل کر ایک طرف عراق اور دوسری طرف مصر وغیرہ اطرافِ شام میں پھیل چکے تھے اور اُن کے بعض قبیلے حجاز میں بھی آ بسے تھے۔ خصوصاً شہر یثرب (جس کا نام ہجرت نبویؐ کے بعد مدینۃ النبیؐ پڑا) کے حوالی میں یہ لوگ مالدار تھے، ساہوکار تھے اور تجارت کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ، سحر، کہانت اور عملیات وعلمیات وغیرہ میں ممتاز تھے۔ مشرکین عرب اُن کے علم وفضل کے قائل تھے۔ اُن کی تہذیب اور ان کے تمدن سے متاثر تھے اور مالی و معاشی معاملات میں بھی انہیں حاجت روا سمجھتے تھے۔ قرآن نے بار بار ان پر اللہ کے انعاماتِ خصوصی کا ذکر کیا ہے اور تکرار کے ساتھ ان کی فضیلت کی صراحت کی ہے اور مشرکین کو بار بار ان کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے ساتھ ہی قرآن نے ان کی بداعمالی، زبوں حالی، بددیانتی، حرام خوری، بدعہدی، مسلم آزاری، سنگدلی، پیغمبر کشی اور پیغمبر آزاری کی پردہ دری بھی شدومد سے کی ہے۔

قرآن کی آیت یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:

"یہاں ذکر مذہبِ یہود کا نہیں بلکہ ایک مخصوص قوم ونسل کا ہے۔ بنی اسرائیل نام کسی مذہب یا فرقہ یا عقیدہ کا نہیں بلکہ ایک خاص نسل کا ہے۔"

الغرض افضلیت یہاں مذہبِ یہود کی نہیں، نسلِ اسرائیل کی بیان ہو رہی ہے۔



پختون نسل اور اس کی اصلیت

پختون

پختون قوم کا نسلی اور آبائی تعلق ان جلاوطن بنی اسرائیل سے ہے جنہیں اشوریوں اور بابل والوں نے یکے بعد دیگرے ان کے وطن شام اور اس کے اطراف سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اور جن کی آبادیاں مشرق میں نواح بابل کے علاوہ ایران اور خراسان کے علاقوں سے لے کر دریائے سندھ کی وادی تک میدیوں یعنی آریاؤں کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ قوم پہلے شریعت موسوی اور پھر ہدایت عیسوی پر قائم تھی اور جب ان تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام پہنچی تو مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

الغرض عیسائیت اور یہودیت، جس پر یہ لوگ قائم تھے اس تشنگی کو نہ بجھا سکتی تھی جس کو اسلام نے آکر بجھایا اور عیسوی اور موسوی تعلیمات کو صحیح جامہ پہنا کر ان کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اسلام کی بدولت ان میں نئی زندگی پیدا ہوئی اور ماہویہ سوری، شیخ حمید لودی اور خصوصاً شہاب الدین محمد غوری کے دور اقتدار میں دشت لوط یا بادیۂ ایران کے مشرقی پہاڑوں سے مشرق کی طرف دریائے سندھ کی وادی تک اس سارے علاقہ پر جہاں جہاں سے ساسانیوں اور تاتاریوں کے غلبہ کی وجہ سے یہ ہجرت کر گئے تھے، قبضہ کر کے دوبارہ آباد ہو گئے۔ اور محمد غوری کے زیر قیادت وہ پنجاب اور سندھ پر بھی قابض ہونے کے ساتھ ساتھ بنگال اور آسام تک بحیثیت حکمران جا پہنچے۔

زوال بنی اسرائیل

شام سے جلاوطنی کی مختصر داستان یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رجعام کو بادشاہ بنانے کے سلسلے میں بنی اسرائیل کے بارہ قبائل اکھٹے ہو گئے اور رجعام کے سامنے اپنے کچھ مطالبات پیش کئے رجعام نے ان کے مطالبات کو مسترد کر دیا۔ بنی اسرائیل کے دس قبیلے اس بات پہ ناراض ہو کر چلے گئے اور انہوں نے یربعام کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ انہوں نے اپنی مملکت کا نام "اسرائیلیہ" رکھا۔ اس کے برعکس یہودا اور بنیامین دو قبیلوں نے رجعام بن سلیمانؑ کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا اور اپنی حکومت کا نام "سلطنت یہودیہ" رکھا۔ یہاں سے بنی اسرائیل میں پھوٹ پڑ گئی۔ ان دونوں حکومتوں کی تاریخ باہمی قتل و غارت اور نفاق اور سازشوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس باہمی نفاق اور جنگ و جدل کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں اپنی حکومتوں کو قائم نہیں رکھ سکے۔ وہ اشوریوں، بابلیوں اور رومیوں کی تاخت و تاراج کا تختہ مشق بنے رہے۔ اس دور میں فلسطین کے یہودیوں اور سامرہ کے اسرائیلیوں میں بہت سے نبی مبعوث ہوتے رہے جو انہیں خدا کا پیغام سناتے، ہدایت کی طرف بلاتے اور آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے تھے۔ مگر انہوں نے کان نہ دھرا۔ بنی اسرائیل ان ایام میں اکثر خدا سے باغی ہو گئے اور تورات کی اتباع سے انکاری ہو گئے۔ لہٰذا آپس کے اختلاف، جنگ و جدل، اللہ کی نافرمانی اور اس کے دین سے روگردانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۵۹۰ء ق م میں بابلیوں کے ہاتھوں یہودیہ کی ریاست تباہ ہو گئی اور اس سے پہلے ۷۲۱ء ق م میں سلطنت اسرائیلیہ اور اس کا مرکزی شہر شورون یا سامریہ اشوریوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا تھا اور اس طرح چودہ سو سال کے بعد اسرائیل کی دونوں حکومتیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر بنی اسرائیل کی تاریخ اور زوال پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

مملکت اسرائیلیہ کا پہلا حصہ اشوری پال یا پلول کے ہاتھوں جلا وطن ہوا تھا۔ یہ واقعہ ۷۷۱ برس قبل مسیح پیش آیا تھا۔ ان جلاوطنوں میں رُوبن اور جدّ کے صرف دو قبیلے تھے۔ ان دنوں حکومت اسرائیلیہ کا بادشاہ ناحم تھا اور یہودیہ سلطنت کا بادشاہ عزریا تھا۔

۷۲۱ ق م میں اسرائیلیہ حکومت کا آخری بادشاہ ہوسیع تھا جس پر نینوا کے شاہ اشور نے حملہ کیا اور شورون (سامریہ) کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے نے تین سال تک طول کھینچا۔ چوتھے سال شورون (شارون) پر قبضہ ہو گیا اور اسرائیل بادشاہ ہوسیع کو قید کر لیا گیا۔ اس قبضے میں جتنے اسرائیلی ہاتھ آئے تھے اشور انہیں نینوا لایا اور پھر مشرق کی طرف ایران اور خراسان وغیرہ علاقوں میں اور دریائے سندھ کی وادی تک میں لا کر آباد کر دیا۔

اسرائیلیہ کے بعد اشوری بادشاہ سرجون ثانی کو یہودیہ پر حملہ کرنے کا براہِ راست موقع مل گیا اور چند سال چھیڑ چھاڑ کے بعد یہودا کا بادشاہ حزقیا اس کا باج گزار بن گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے خراج دینے سے انکار کر دیا اور مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشوریہ کے بادشاہ سرجون ثانی اور اس کے جانشین سنحیرب نے لشکر کشی کر کے یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ اس جنگ میں حزقیا کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ اس کے لڑکے کو تخت نشین کر کے سنحیرب نے اپنا باجگزار بنا لیا۔ تاریخ شام کے مطابق سنحیرب کا دعویٰ ہے کہ اس جنگ میں اس نے دو لاکھ ایک سو پچاس یہودیوں کو قیدی بنایا۔" اشوری بادشاہ نے حسب سابق ان قیدیوں کو بھی مشرق کی طرف

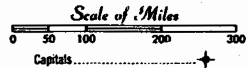
جلاوطن کر دیا اور خراسان وغیرہ میں جہاں جہاں پہلے دس اسرائیلی جلاوطن قبائل آباد کئے گئے تھے، وہیں انہیں بھی بسا دیا گیا۔ ان نووارد قیدیوں میں زیادہ تر تعداد بنی پخنت کی تھی جو علاقہ موآب، شرق اردن میں آباد تھے۔ اس واقعہ کے بعد سلطنتِ یہودیہ مزید کمزور ہو گئی اور وہ نینوا کے آگے جھکی رہی اور باقاعدگی سے خراج ادا کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ نینوا والوں کے وارث اہلِ بابل نے ۵۹۷ قبل مسیح میں یروشلم پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ انہوں نے بادشاہ یہوداکے بیٹے صدقیا کو تخت پر بٹھا کر اسے اپنا باجگزار بنا لیا۔ اہلِ بابل یہودیہ سے دس ہزار قیدیوں کو ان کے بال بچوں سمیت بابل لے گئے۔ صدقیا بادشاہ یہوداکئی سال تک تو بخت نصر کا وفادار رہا اور پابندی کے ساتھ خراج ادا کرتا رہا لیکن پھر اس نے اپنی آزادی اور استقلال کا پرچم لہرایا جس پر بخت نصر نے طیش میں آ کر اس پر فوج کشی کر کے یروشلم کو تباہ و برباد کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا اس نے یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے نے پندرہ ماہ تک طول کھینچا بالآخر بخت نصر کو کامیابی حاصل ہوئی یروشلم فتح ہو گیا۔ ہیکل (مسجد) کو تباہ کر دیا گیا۔ صدقیا کو گرفتار کر کے اس کے سامنے اس کے بیٹوں کو قتل کیا گیا پھر اس کی آنکھیں نکالی گئیں اور اسے قید کر کے بابل لے جایا گیا۔ بخت نصر ایک لاکھ سے زیادہ یہودیوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا اور انہیں ایران میں اور بابل کے آس پاس آباد کیا جہاں وہ تقریباً ستر برس تک غلامی کے عذاب میں مبتلا رہے۔ اس دوران میں بہت سے یہودی ادھر اُدھر کے علاقوں میں بھاگ گئے۔ ان حوادث کی وجہ سے فلسطین میں یہودیوں کی تعداد بہت تھوڑی رہ گئی۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں :-

"برائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بخت نصر، خدا کا عذاب بن کر چڑھ آیا اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بکریوں کے گلے کی طرح ہنکا لے گیا اور بیت المقدس جیسے خوب صورت اور مقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔" (قصص القرآن جلد سوم)

سید سراج الاسلام کہتا ہے کہ "بابلیوں نے یہودیوں کے شہروں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ لاکھوں یہودی مارے گئے اور لاکھوں یہودیوں کو قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا۔" حوالہ (عہد قدیم ص۲۳۳)

نینوا کے اشوری

اشوری قدیم سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور اسرائیلی سلطنت کے ماتحت تھے لیکن اندرونی طور پر وہ دریائے دجلہ کے بالائی حصہ میں آزادی اور اندرونی خود مختاری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل کے آپس کے اختلاف اور طوائف الملوکی کو دیکھ کر انہیں ان حالات سے فائدہ اٹھانے کا خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے اپنی طاقت کو منظم کیا اور گردونواح کے علاقوں کو تاراج کرنا شروع کیا۔ اس میں انہیں بڑی کامیابی ہوئی۔ ہر طرف وحشت و بربریت کا بازار گرم کر دیا۔ انہیں جن لوگوں کی طرف سے مخالفت کرنے یا سدِ راہ بننے کا خطرہ پیدا ہوتا اُسے گرفتار کر کے اس کے اعضاء الگ الگ کرتے یا انہیں پنجروں میں بند کر کے لٹکا دیتے اور طرح طرح کے عذاب دے کر ہلاک کرتے۔ ان کی وحشت و بربریت سے لوگوں کے دلوں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ اشوری پہلی قوم ہے جس نے فنِ حرب کو ترقی دے کر فوج کی تنظیم کی، اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا۔ گھوڑ سواروں پر رسالہ منظم کیا، لوہے کے ہتھیاروں، تیر، کمان، بھالے تلواروں اور فصیلوں کو گرانے کے لئے منجنیقیں ایجاد کیں اور سرنگوں وغیرہ کا استعمال کیا۔ وادی دجلہ، فرات کی سرزمین، بابلیہ، ایلام، ایشیائے کوچک



نقشہ اشوری عہد حکومت
۸۲۴ تا ۶۲۵ ـــ قبل مسیح
THE ASSYRIAN EMPIRE
824 to 625 B. C.
Scale of Miles
0 50 100 200 300
Capitals
Thracians
Macedonians
Thasos
Byzantium
Chalcedon
Cyzicus
Abydos
GREEK
LESBOS
EUBOEA
CHIOS
Athens
Corinth
SAMOS
CITY STATES
Sparta
Miletus
Sardis
LYDIAN KINGDOM
Celaenae
PHRYGIAN KINGDOM
Ancyra
Gordium
Cimmerians
(Gomer)
CAPPADOCIA
Site of Assyrian trading post 1850 B.C.
Kanish
Cilician Gates
Tarsus
Phaselis (Greek)
RHODES
CRETE
Greek colonization of the Mediterranean world began in this period.
CYPRUS
Salamis
Paphos
بحر روم
Trapezus (Greek)
Scythians (Ashkenaz)
KINGDOM OF URARTU (before 712 B.C.)
Tushpa
Musasir
Carchemish
Haran
Til Barsip
Gozan
Nisibis
Arpad
Karkar
Shalmaneser III's victory over Ahab 854 B.C.
Hamath
Arvad
Tadmor
Byblos
Sidon
Tyre
SYRIA (ARAM)
Damascus
PHOENICIA
destroyed the Kingdom of Israel in 721 B.C.
Samaria
Eltekeh
Ashkelon
Raphia
Jerusalem
AMMON
JUDAH
MOAB
EDOM
Sela
Kedar
Nineveh
Sennacherib's great capital
Dur Sharrukin
Arbela
Calah
Ashur
Early Assyrian capital
Arrapakha
Anatho
ASSYRIAN EMPIRE
Home of Assyrian colonists of Samaria
Opis
Sippar
Babylon
Borsippa
Kish
Cuthah
Nippur
AKKAD
BABYLONIA
Destroyed by Sennacherib 689 B.C.
Sumer
Erech
Ur
Chaldea
Aribi (Arabs)
Domah
Susa (Shushan)
ELAM
Ecbatana
Medes
ZAGROS MTS.
The Medes & Babylonians destroyed the Assyrian Empire in 612 B.C.
The dashed line represents the ancient shoreline of the Persian Gulf according to many scholars. Late research indicates, however, that the ancient coast corresponded closely to the modern one.
خلیج فارس
بحیرہ کیسپین
Cyrene (Greek)
Libyans
Ammonium
Sais
Tanis
Pelusium
Bubastis
Memphis
On
The Assyrians held Egypt from 671 B.C. to 652 B.C.
Heracleopolis
Sinai Peninsula
EGYPTIAN KINGDOM (before 671 B.C.)
Akhetaton (Tell el Amarna)
Siut
Abydos
Thebes
Destroyed by Ashurbanipal 663 B.C.
Jeb (Elephantine I.)
LIBYAN DESERT

کے مشرقی حصے، آرمینیہ، سامریہ، یہودیہ، ایران، خراسان اور دریائے سندھ کی وادی، یہ تمام علاقے مدتوں تک اشوری بادشاہوں کی تاخت وتاراج کا میدان اور تختہ مشق بنے رہے۔ یہاں کے بادشاہ اور حاکم اشوری بادشاہوں کو خراج دیتے تھے اور جہاں کوئی بادشاہ سر اٹھانے کی جرأت اور سرکشی کا ارادہ کرتا اس پہ فوج کشی کر کے اسے سخت ترین سزا دی جاتی تھی۔

اشوریوں کا زوال

۶۱۲ء قبل مسیح میں ایران کے مودی (میدی یا مادی) سردار سیاک سیر نے جس کا دوسرا نام اوآکیشتر (کھشتری) ہے بابل کے حکمران قبائل کی مدد سے نینوا پر چڑھائی کر کے اشوریوں کی فوج کا خاتمہ کر دیا۔ شاہی خاندان کے افراد کو نیست ونابود اور ملک کو تہس نہس کر دیا۔

بابل والوں کا عروج وزوال

اہل بابل، نو بابلی یا کلدانی قوم سے ایک ہی قوم مراد ہے۔ اشوریوں کے زوال کے باعث بابل والوں کو اپنا حلقہ اقتدار اور حدود مملکت وسیع کرنے کا موقع مل گیا۔ نیو پلیسر نے جو جنوبی عراق کے دلدلی علاقے کا قبائلی سردار تھا ۶۲۶ء ق م میں بابل میں نئے شاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔ ان قبیلوں نے اشوریوں کے خلاف ایران کے مادیوں کی مدد کی تھی۔ بخت نصر اسی نیو پلیسر کی اولاد میں تھا وہ زبردست فاتح اور صاحب شان وشوکت بادشاہ تھا۔ اس کے بعد بابل کے تخت پہ چار بادشاہ بیٹھے۔ آخری بادشاہ بخت نصر کا پوتا بال شارزر تھا۔ ایک مرتبہ وہ جشن منا رہا تھا اور شراب کا دور چل رہا تھا کہ دیوار پہ ایک غیبی ہاتھ کچھ لکھتا ہوا نظر آیا۔ اس کا

مطلب یہ لیا گیا کہ پارسی بادشاہ اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیں گے۔
چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ ۵۵۸ء ق م میں سائرس ایرانی نے بابل پر حملہ کر کے بابلی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ خسرو اعظم کا ذکر بائبل کے عہدنامہ عتیق میں مرقوم ہے، مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن میں اسی مذکورہ بادشاہ کو ذوالقرنین ظاہر کیا گیا ہے۔ اور بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں اُسے نجات دہندہ کہا گیا ہے۔ (واضح ہو کہ سائرس، خورس، کورش، اخویرس، خسرو، یہ سب ایک ہی شخص کے مختلف نام ہیں)۔

جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہے سیاست میں ان اسرائیلی جلاوطنوں کو بڑا دخل تھا چنانچہ میدیوں اور خورس کی سلطنت کے قیام میں انہیں کا ہاتھ تھا۔ اشوریوں کے خلاف میدیوں کو جنگ پر آمادہ کرنے اور پھر بابلیوں سے انتقام لینے کے جذبات بھی رکھتے تھے اور اس سلسلے میں ان کو کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ چنانچہ درپردہ بابل سے اسرائیلی سرداروں کا ایک وفد خورس کے پاس اس وقت پہنچا جب کہ وہ اپنی مشرقی مہم میں مصروف تھا۔ خورس (سائرس) نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ وہ اپنی مہم سے فارغ ہو کر ضرور بابل پر حملہ کرے گا اور ان کو بابل کے ظالم اور عیاش بادشاہ سے نجات دلائے گا۔ خورس جب اپنی مہم سے فارغ ہو گیا۔ تو حسب وعدہ اس نے بابل پر حملہ کر دیا اور دیتاؤں کی قدیم ترین ریاست کو ایران کی سلطنت میں شامل کر لیا۔

یہود کی حیات نو

سائرس کے متعلق مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، لکھتے ہیں:۔

"یہود کے لئے اس کا عروج و ظہور، آزادی اور امن و اطمینان کا بہت بڑا سبب بنا اسی لئے وہ اس کی شخصیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان کے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں اس کو خدا کا چرواہا اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ کہا گیا ہے ... خورس، اس کے بیٹے کیقباد دوم اور دارا کا مذہب بلاشبہ ایران کے قدیم مجوسی مذہب کے خلاف، اور دین حق کا مذہب تھا۔" (قصص القرآن جلد سوم)

سائرس کی سلطنت یونان سے مشرق میں دریائے سندھ تک ایک سو ستائیس (۱۲۷) صوبوں میں پھیلی ہوئی تھی جس میں جلا وطن بنی اسرائیل بھی پہلے سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سائرس نے ان کو واپس یروشلم جانے، شہر کو آباد کرنے اور مسجد بیت المقدس (اقصیٰ) کی از سر نو تعمیر کا فرمان صادر فرمایا۔ چنانچہ بحوالہ کتاب مقدس اس فرمان کے اجرا کے بعد مختلف اوقات میں بیالیس ہزار تین سو ساٹھ (۴۲۳۶۰) یہودی یروشلم واپس چلے گئے۔ جبکہ جلا وطنوں کی تعداد کئی لاکھ تھی۔ ان میں جو لوگ خوشحال ہو گئے تھے، انہوں نے وطن واپس جانے کے مقابلے میں یہیں رہنے کو ترجیح دی۔ سائرس کی زندگی میں اور اس کے خاندان کے عہد فرمانروائی میں بھی جو دو سو بیس (۲۲۰) سال پر پھیلا ہوا ہے۔ اسرائیلی حاکم قوم کی شکل میں تھے اس دوران میں جو اسرائیلی مملکت ایران میں جہاں کہیں بھی رہائش پذیر تھے وہ سکندر یونانی کے ایران فتح کرنے تک آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے رہے[۱]

یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو سائرس بادشاہ کے زمانہ میں یروشلم واپس چلے گئے تھے ان پر کیا گزری۔
اس سلسلے میں سراج الاسلام اپنی تصنیف "عہد قدیم مشرق و مغرب" میں ص ۱۳۵ پر لکھتا ہے۔

---

[۱] بعد کے حالات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حواشی تواریخ حافظ رحمت خانی۔ اشاعت سوم ۱۹۷۳ء

اسرائیلی حکومت سائرس کی مدد سے فلسطین پر اسرائیل کی حکومت دوبارہ قائم ہوگئی۔ یروشلم کی مسجد دوبارہ تعمیر کی گئی۔ عذرا نبی نے اسرائیلی تاریخ، روایتوں اور قانون کو ایک کتاب میں جمع کیا لیکن یہودیوں کی خوشی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ ایرانیوں کی حکومت کے زوال کے بعد یونانیوں نے سکندر کی قیادت میں ۳۳۰ء ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فلسطین رومیوں کے زیر اقتدار چلا گیا جو انتہائی سفاک اور ظالم تھے۔ یروشلم کا شہر اور مسجد تباہ کر دی اور یہود قیدی رومی سلطنت کے مختلف علاقوں میں منتشر کر دیئے گئے۔ اسی وجہ سے آج ان کا دنیا کے ہر حصہ میں وجود ملتا ہے۔ یہودیوں کو رومیوں کی غلامی میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریب ۱۹۰۰ سال کی جدوجہد کے بعد مئی ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی حکومت کا قیام پھر عمل میں آیا۔"

فلسطین پر رومی حملہ کے بارے میں فلپ کے حتی تاریخ شام میں لکھتا ہے کہ:۔

"حضرت عیسیٰؑ کے بعد رومیوں نے یروشلم پر حملہ کر کے پانچ ماہ تک محاصرہ جاری رکھا۔ آخر ستمبر ۷۰ء میں یروشلم شہر فتح کر لیا گیا۔ محصور شہر کے دردناک انجام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب رومی سپاہیوں نے شہر پر حملہ کیا تو محصور خاندانوں نے باہم سب کو مار دینے کا عہد کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ ان حالات کا نقشہ ایک ایسے مورخ کے قلم سے کھینچا گیا ہے جو خود جنگ میں شریک تھا۔ شوہروں نے انتہائی محبت کے ساتھ بیویوں سے معانقہ کیا، بچوں کو گود میں اٹھایا انہیں پیار کیا دونوں طرف بوسے دیئے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی لیکن وہ جو عزم کر چکے تھے اُسے

پورا کئے بغیر نہ رہے اور اُسے اس طرح پورا کیا گویا یہ سب کچھ اجنبیوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اگر دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو انہیں کن اذیتوں سے سابقہ پڑے گا... وہ بڑی بُری حالت میں تھے لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ بیوی بچوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا انہیں ایک کم درجے کا گناہ معلوم ہوا۔ شہر تباہ کر دیا گیا۔ ہیکل کو آگ لگا دی گئی نو سو پچاسی (۹۸۵) دیہات برباد ہوئے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ دس لاکھ یہودی اس جنگ میں تباہ ہوئے۔ بہت سے قیدی بنا لئے گئے اور انہیں روم لے جایا گیا۔ اس سے پیشتر اشوری اور کلدانی، یہودیوں کو جابجا منتشر کر چکے تھے۔ اس انتشار کی تاریخ میں ایک رومی باب کا اضافہ ہوا۔"

قرآن نے اس واقعہ کو تارۃً اُخریٰ کے نام سے یاد کیا ہے اور پہلے والے کو تَارَۃً اُولیٰ۔ یہ واقعہ بنائے بیت المقدس کے گیارہ سو ساٹھ سال بعد پیش آیا۔

مزید ثبوت کے لئے ملاحظہ ہو قرآن پارہ ۱۵ سورہ بنی اسرائیل آیات ذیل آخر تک وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ...
ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے۔

ایک ضروری یادداشت :۔ بخت نصر لوگ پہلے وقتوں میں بنی بخت کے نام سے موآب کے میدان یا ملکِ موآب جو شام کے علاقہ مشرق اُردن میں واقع تھا، میں آباد تھے، لہٰذا وہ باشندگانِ موآب اور بعض جگہ بنی بخت موآب کے نام سے یاد ہوتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو کتاب مقدس میں عزرا، نحمیاہ اور یرمیاہ باب ۴۸)

حضرت ابراہیمؑ آرامی تھے اور اپنے ہم قوموں سے آرامی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ اور وہی عبرانی قوم کے جدِ امجد بھی رطلپ کے حتی، تاریخ لبنان)

قومی نام اور وجہ تسمیہ

پختون

ان جلاوطن بنی اسرائیل میں بنی پخت یعنی اولاد پخت ایک معزز اور حکمران قبیلہ بھی تھا جو بنی یہودا میں بحوالہ سموئیل، وہ لوگ مسمیان یواب، اب یشی، عسائیل اور یشوع جو اولاد پخت کے نام سے یاد کئے جاتے تھے انہیں میں سے ایک نامور قبیلہ بنی پخت کے نام سے بن کر تعداد اور طاقت میں بڑھ گیا تھا۔ اسی طرح کتاب مقدس بائبل باب تواریخ میں درج ہے کہ "بنی پخت طاقت اور اقتدار بھی رکھتا تھا۔ حضرت داؤد کے عہد حکومت میں ان کے مورث یان اعلیٰ جو یواب، ابیشے، عسائیل اور یشوع تھے سب کے سب حکومت پر حاوی تھے اور ان کے مشورہ ہی سے سب کچھ ہوتا۔" وزارت عظمیٰ اور فوجوں کی کمان انہیں کے ہاتھوں میں تھی۔ اور حضرت سلیمان کے عہد حکومت میں بھی انہی کا زیادہ اثر تھا۔ دونوں زمانوں میں وزارت اور پوری فوج انہی کی سرپرستی میں تھی۔ جب یہ قبیلہ مشرق اردن میں سے سنحیرب اشوری کے ہاتھوں قیدی بن کر جلاوطن کیا گیا اور مشرق میں اُسے اسرائیلیہ کے پہلے جلاوطنوں کے ساتھ جو ان کے ہم نسل تھے بسایا گیا تو بنی پخت کی نامی گرامی شہرت کے سبب سارے جلاوطنوں کا قومی نام پختون ہوا اور اس نام کے تحت سارے قبیلوں نے اپنے اپنے نام ذیلی شاخوں کی شکل میں بھی قائم رکھے۔ بنی پخت یا اولاد پخت یعنی پختون (پشتون) قبیلہ کا وجود بنی اسرائیل میں نمایاں تھا۔ (بائبل، اردو مطبوعہ لاہور، صفحات ۴۶۲-۴۶۸-۴۷۱-۴۷۸-۴۸۲)

الغرض یہ قبیلہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے سیاسی اثر و اقتدار اور

---

* بحوالہ کتاب مقدس، یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ، بائبل سوسائٹی، انارکلی۔ لاہور۔ ان صفحات پر ملاحظہ کیجئے۔

طاقت و قوت سے تمام بنی اسرائیل میں معزز اور قابل فخر رہا ہے۔ ان کے اسی امتیاز اور عزت کی وجہ سے پختون کا نام ان تمام جلاوطن بنی اسرائیل کے لئے استعمال ہونے لگا جو مشرق میں آباد ہوئے۔

پٹھان

پختون اور افغان کے لئے پٹھان کے لفظ کا استعمال بھی عام ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ افغان جس وقت ہندوستان پر قابض ہوئے تو ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو بٹنی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور جو افغانوں کا دوسرا بڑا قبیلہ ہے۔ ان میں لودہی، سوری، اور سرداتی خلجی وغیرہ اسی قبیلہ سے متعلق ہیں۔ یہ لوگ شام کے اُس شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ جو دریائے اُردن کے مشرق میں بشان کے علاقہ میں واقع تھا اور بتھانا سے موسوم تھا۔ اس نسبت سے وہ یہاں مشرق میں آکر بٹنی کہلانے لگے۔ ہندوستان میں ان کو پٹھان سے موسوم کیا گیا اور وقت گزرنے پر اس قبیلہ کو ہی نہیں بلکہ عام افغان کو پٹھان کا نام دیا گیا جو امتیازی حیثیت سے ان کا قومی نام قرار پایا۔ ذیل میں ہم چند ہندوستانی مورخین کے بیانات پیش کرتے ہیں جنہوں نے افغانوں کو پٹھان کے نام سے یاد کیا ہے۔

محمد حسین اپنی تصنیف احکم التاریخ میں محمد غوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"خلجی نام قوم افغان ہے"

عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ رقمطراز ہے

"سلطان شہاب الدین محمد غوری کے سلسلۂ امرا میں ایک اور شخص محمد بختیار غوری بھی تھا جو خلجی کے نام سے مشہور ہے۔ وہ بلادِ غور کے اکابر میں سے تھا اور جملہ اوصاف حمیدہ کا مالک تھا۔"

تاریخ واقعاتِ ہند کا مصنف خلجی کے متعلق لکھتا ہے :

"جلال الدین خلجی ۱۲۸۸ء میں بادشاہ بنا۔ وہ پٹھان، سادہ مزاج اور رحم دل شخص تھا۔ وہ ۱۲۹۵ء میں فوت ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بھتیجا علاؤ الدین عظیم الشان بادشاہ ہوا جس نے سارے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں کر لیا وہ ۱۳۱۶ء میں فوت ہوا اور اس کی جگہ قطب الدین مبارک شاہ خلجی بادشاہ بنا۔"

غلجی اور غلجی یا غلزی اصل میں غرزی ہے یعنی پہاڑی لوگ، ہندوستان کے خلجی جو مدتوں سے وہاں حکمران رہے، نسلاً پختون یعنی پٹھان تھے اور یہ غلط ہے کہ غلجی چنگیز کے داماد خالج کی نسل سے ہے۔ یہ قول تاریخی صحت نہیں رکھتا۔ خلجی یا غلجی چنگیز سے تین قرن قبل بھی موجودہ افغانستان میں آباد تھے۔ (رسالہ پشتو اکیڈمی پشاور ماہ جنوری ۱۹۶۰ء ص۳۸)

مشہور مورخ کیرو لکھتا ہے :۔

"کوہ سلیمان کے غلجیوں اور لودیوں نے دہلی میں افغان حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔"

پشتو کے مشہور شاعر خوشحال خان کہتے ہیں :

بیا سلطان جلال الدین پہ سریر کیناست
چہ پہ اصل کښې غلجے دہ ولایت وو

علامہ احسان اللہ عباسی لکھتے ہیں :

"حسن ایک چھوٹے درجہ کا پٹھان تھا۔ خاندان تغلق کے زوال کی حالت میں یہ بادشاہ بنا اور اپنے خاندان کو بہمنی کہنے لگا۔" (تاریخ اسلام ص۳۹۹)

افغان. بخت نصر جو قیدی یروشلم سے بابل لایا تھا ان میں سے کچھ بابل، اور اس کے نواح میں اور بعض کو ملک ایران میں آباد کیا گیا تھا۔ ابتدا میں یہ لوگ موسایان اور سلیمانان کے نام سے یاد کئے جاتے تھے لیکن کچھ مدت بعد افغان کے نام سے موسوم ہوئے۔ ساسانیوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر جب یہ لوگ ملک ایران سے خراسان وغیرہ پہنچے تو انہیں افغان ہی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ دونوں جتھوں کے باہم ملنے پر پختون اور افغان دونوں نام اس علاقہ میں رائج ہوئے۔

عرب اب بھی انہیں سلیمانی کہتے ہیں۔

وجہ تسمیہ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ لفظ اوغان اور افغان کا ماخذ ایک عبرانی لفظ "اَب" ہے جو اعزازی اور تعظیمی اسم تھا اور یہ لفظ "اَب" معزز، بہادر، نامور وغیرہ کے لئے بنی اسرائیل میں استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً "یواَب" اب لیشے پسران ضرویا جو حضرت داؤد علیہ السلام کے بھانجے، ان کے وزیر اعظم اور سپہ سالار بھی تھے اور بنی پخت کے مورث اعلیٰ بھی ہیں۔

"عمینداب" یہ شخص ساتویں پشت میں حضرت داؤد علیہ السلام کا جدِ اعلیٰ ہے۔ اور اس کے باپ کا نام رام بن حصرون تھا۔

"اخی اب" یہ شخص عمری نام شاہ اسرائیلیہ کا بیٹا تھا اور اپنے باپ عمری کے مرنے کے بعد بہت ناموری کے ساتھ "اخی اب" نے سامریہ میں اسرائیل پر ۲۲ برس حکومت کی۔

دمشق کے دریا "ابانا" جس کا قدیم اور اصلی نام "بردی" ہے لیکن بنی اسرائیل نے اسے اسم تعظیمی "ابانا" سے موسوم کیا یعنی بڑا معزز دریا۔

البیرونی لکھتا ہے کہ:۔ "ان زبانوں (یعنی عبرانی اور سریانی) میں لفظ "اب" کے ساتھ خطاب کرنا لفظ "سیّد" کے ساتھ خطاب کرنے کے برابر ہے۔ (کتاب الہند شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۱ء جلد اول باب ۳ صفحہ ۳۷)

بنی اسرائیل میں ایسے نامور اور معزز لوگ بہت تھے جن کے ناموں کے ساتھ لفظ "اَبْ" اعزاز اور تعظیم کے طور پر شامل کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ اس زمانہ میں خان کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اگرچہ لفظ "اَبْ" مفرد ہے لیکن جلاوطنی کے بعد اس لفظ کو دوسرے ملک کے لوگوں اور خاص کر ایرانیوں نے جمع کے لئے یوں استعمال کیا "ابان، اباکان، اب گان، اب غان، اوغان، اپاکان، اور آخر میں عربی طرز پر افغان استعمال کیا گیا۔ اور پھر اس جمع کے لفظ کو مزید جمع کے لئے افغانان اور ملت افاغنہ بھی استعمال کیا جانے لگا۔ مثلاً لفظ "اَبْ" واحد بمعنی معزز اور اس کی جمع اَبَانْ بمعنی معززین بروزن کَبْ لفظ واحد بمعنی مچھلی اور اس کی جمع کَبَانْ بمعنی مچھلیاں اور لفظ لَبْ واحد بمعنی ہونٹ جس کی جمع لَبَانْ ہے۔ اسے اس طرح بولنا ہوگا۔ اب، ابان۔ کب، کبان۔ لب، لبان۔

مولوی میر احمد عرف میراں بخش مصنف تاریخ صوبہ سرحدی پشاور، تاریخ کابل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:۔

"لفظ افغان عربی لفظ ہے، اور لفظ اوغان فارسی، لیکن ماخذ دونوں کا عبرانی زبان ہے"۔

پختو زبان کے مشہور ماہر مسٹر راورٹی نامی ایک انگریز اپنی کتاب "افغانی انگلش ڈکشنری" میں لفظ افغان کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"افغان اس طاقتور قوم کا نام ہے جو افغانستان میں رہائش پذیر ہے اور غالباً یہ ان اسرائیلی قبائل کی اولاد ہیں جو گمشدہ تھے"۔

نتیجہ تحقیق

میں خود بھی انتہائی تحقیق و جستجو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بلاشک و شبہ

بختون، پشتون، روہیلہ، سلیمانی، پٹھان اور افغان سب ایک ہی قوم کے مختلف نام ہیں، یہ ان گمشدہ اسرائیلیوں کی اولاد ہیں جنہیں اشوریوں اور بابل والوں نے باری باری شام کے علاقوں سے مشرق کی طرف جلاوطن کیا تھا اور جن کا ذکر کتاب مقدس اور کئی دیگر مشہور تاریخی کتابوں میں اکثر آتا ہے۔

افغان یا بختون کو آپ کسی نام سے یاد کریں وہ اصلاً سامی ہیں اور نسل ابراہیمی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وہ قوم ہے جو پہلے شریعت موسوی پر اور پھر دعوت عیسوی پر قائم تھی اور جب ان تک خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام پہنچی تو اس پر لبیک کہتے ہوئے مشرف بہ اسلام ہو گئے اور دین اسلام کی تبلیغ میں کٹھن مرحلوں سے گزرتے ہوئے اسے دنیا کے مختلف ملکوں تک پہنچا دیا۔ کاش اس قوم کے نوجوان اس نکتہ کو سمجھ سکیں کہ یہ اس کی قومی خصوصیت اور اس کے بزرگوں کا تعامل ہے۔ یہ بختونوں کی روشن تاریخ ہے جو صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کا کوئی گوشہ تاریکی میں نہیں۔ اس کی تاریخ کا ہر دور اور اس کے واقعات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ ایک دو کا بیان نہیں یہ ایک قوم کا بیان ہے جو لاکھوں انسانوں کا مجموعہ ہے اور وہ تواتر سے پشت بہ پشت گواہی دیتے چلے آرہے ہیں۔

تاریخ افغانان کے چند مزید پہلو

شام سے جلاوطنی کے بعد سائرس کے وقت سے بختون ایرانی سلطنت کے مختلف مقامات میں بڑی عزت کے ساتھ سرسبز اور شاداب زمینوں پر آرام سے رہائش پذیر تھے پھر ایک ایسا زمانہ بھی آیا کہ ساسانیوں کے ظلم و ستم اور تاتاریوں کی یلغار سے تنگ آ کر ہجرت پر مجبور ہوئے اور اکثر و بیشتر اس پہاڑی علاقہ میں جا کر آباد ہوئے جو دشت لوط یا بادیہ اسے ان سے مشرق کو اور ہرات،

غور، دریائے فرہ اور زرنج کے مغرب میں مرو اور نیشاپور سے جنوب کی طرف کرمان اور مکران تک پھیلا ہوا تھا۔ وہاں پر وہ صحرانشین بن کر پہاڑوں کے غاروں میں دشمنوں کی نظروں سے دور، جنات کی طرح مستور، شہریوں کی نگاہوں سے پوشیدہ طور پر وقت گزارنے لگے۔ یہ جگہ ان کے لئے زیادہ محفوظ اور حصار کا درجہ رکھتی تھی (بالکل اسی طرح ان کے بعض ہم نسل شمالی ایران کے پہاڑی علاقوں میں بھی موجود اور سر چھپانے پر مجبور تھے) اس دوران میں خاتم النبیین حضرت محمدؐ رسول اللہ کے مبعوث ہونے کی خبر انہیں ملی، جیسا کہ محمد احسان اللہ عباسی اپنی تاریخ اسلام میں افغانستان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ :۔ "یہاں کے لوگ اپنے آپ کو اسرائیلی کہتے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اس قول کو ترجیح نہ دی جائے۔ یہود مدینہ ان افغانوں سے برابر خط و کتابت رکھتے تھے اور جب وہ لوگ مدینہ میں مسلمان ہوئے تو اپنا ایک شخص یہاں بھی دعوت اسلام کے لئے بھیجا"[1]۔

فلپ کے حتی کے مطابق ایک سیاح جس کا نام "بنیمین" اور تطیلہ کا رہنے والا ہسپانوی یہودی تھا اور اس کو تاریخی حقائق کا زیادہ اندازہ تھا۔ وہ علاقہ جات پشت یا پخت، غرجستان، قوہستان، غور، وغیرہ میں ان پہاڑی افغانوں کے پاس جو یہاں رہتے تھے، آیا تھا اور کافی وقت گذارنے اور تحقیق کے بعد ان کے متعلق اس نے لکھا کہ "نیشاپور یعنی مشرقی ایران کے پہاڑوں میں جو یہودی رہتے ہیں وہ ابتدائی جلا وطنوں کی اولاد ہیں" (تاریخ شام)

بنیمین کا مقصد یہودی سے مراد نسل یہود اور عبرانی قوم ہے نہ کہ مذہب یہود، کیونکہ اس وقت جب وہ آیا تھا یہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور شریعت محمدی پر قائم تھے وہ اپنے آپ کو نسلاً بنی اسرائیل اور جہت دین سے

---

[1] تاریخ اسلام الوقت پریس، گورکھپور، باب ہشتم، فصل چہارم۔ ص ۴۶۵

مسلمان کہتے تھے۔ ابتدا میں لفظ یہودی کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ فلاں شخص یہودا قبیلے یا یہودا کی نسل سے متعلق ہے، پھر یہ لفظ اُن عبرانیوں کے لیے بولا جانے لگا جو اسیری و جلاوطنی سے نجات پاکر واپس وطن پہنچ گئے تھے۔ آخر میں پوری اسرائیلی قوم کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ اب اسرائیلی سے مراد وہ شخص ہے جو اسرائیل یعنی یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہو۔ مزید تشریح کرتے ہوئے سیّد سراج الاسلام لکھتے ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ اپنے اہل و عیال اور چند دیگر نفوس کے ساتھ اُر سے ہجرت کر کے کنعان کی طرف چلے گئے، اہلِ کنعان نے اُن کو عبری (عبرانی) کا نام دیا۔ (ابراہیمؑ کے جدِّ اعلیٰ کا نام عبر تھا) عبرانی قوم عرصہ تک خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتی رہی۔ چراگاہوں اور عمدہ زمینوں کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ عبرانی عرصہ تک کنعانیوں کے ساتھ پُرامن زندگی بسر کرتے رہے۔

یعقوبؑ کے زمانہ میں جو ابراہیمؑ کے پوتے تھے کنعان اور نواحی علاقہ میں قحط سالی کی وجہ سے عبرانیوں کو مصر میں پناہ لینی پڑی۔ یعقوبؑ کا دوسرا نام اسرائیل تھا اسی مناسبت سے ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی، یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودا یا جودا (جوذا) تھا اس لیے عبرانی، اسرائیلی، یہودی (اور جوذ) ایک ہی قوم کے مختلف نام ہیں۔ بنی اسرائیل ایک عرصہ تک مصر میں دریائے نیل کے قریب گوشن کے ضلع میں امن و امان سے رہتے رہے لیکن اپنے تمدّن اور مذہب کی وجہ سے وہ بُت پرست مصریوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہو سکے۔ جب بنی اسرائیل کی طاقت کافی بڑھ گئی اور مصریوں کو یہ خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں یہ لوگ ہمارے بتوں اور تمدّن کو تباہ و برباد نہ کر دیں تو ان کو غلام بنا لیا گیا اور سخت مصائب و پریشانیوں کا شکار بنایا جاتا رہا۔ آخر کار اُن کی قوم میں موسیٰؑ پیدا ہوئے، موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر آزاد کرا لیا۔" (عہد قدیم ص ۵۲۹)

وَقَطَّعْنَاهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ج سورہ اعراف

مشرق میں بنی اسرائیل

شام سے جلاوطنی کے بعد ممالک مشرق میں بنی اسرائیل کی موجودگی اور رہائش پذیر ہونے کے ثبوت میں مثال کے طور پر مزید چند واقعات کا بیان کرنا بہتر ہوگا۔

"اسرائیلی قبائل بہت ہی سرگردانی کے بعد موجودہ افغانستان کی زمین پر دکھائی دینے لگے تھے"۔ (ٹوبوسکن بحوالہ یوسفی)۔

پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی اپنی کتاب تاریخ ایران جلد اول میں ایرانی مؤرخ حسن پیرینہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

"قدیم تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو اس وقت آرمینیہ کے بادشاہ ہائک دوئم نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس مہم میں جو یہودی اسیر کرکے آرمینیہ لائے گئے ان میں شامبات نامی یہودی کا ایک کنبہ (قبیلہ) بھی تھا۔ شامبات کے بیٹے کا نام باگارات تھا۔ اہل آرمینیہ لکھتے ہیں کہ اس کنبے کے افراد بہت دانشمند تھے۔ اس لئے انہوں نے بڑے بڑے رتبے حاصل کئے پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ یہی لوگ آرمینیہ اور گرجستان (جرجستان) کے بادشاہ بنے"۔

عبدالجبار شاہ اپنی تصنیف بنی اسرائیل میں تاریخ قدیم بخت نصر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:۔

"بنی اسرائیل بخارا۔ مرو اور خیوا کے متعلقہ علاقوں میں بڑی تعداد میں موجود تھے"۔

فاضل کرنل ایچ مجل کی رائے کے مطابق ۵۰۳ - ۵۲۰ء میں کاسمس نے ذکر کیا ہے کہ

"چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں جیحون کے کنارے پر عیسائی آبادی
تھی ۔ عربوں نے بخارا میں بھی ایسا ہی پایا۔"

آرمینس ویمبرے (ہنگری) پروفیسر پر تھ یونیورسٹی اپنی تصنیف تاریخ بخارا کے مقدمہ میں بخارا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں!۔

"مغرب کی سمت سروان کا ضلع اور شہر پہاڑوں کے درمیان واقع
تھا۔ آب و ہوا غیر معتدل مگر باشندے (یعنی سروانی) بہت صحتمند
اور جفاکش تھے۔ زردگرد جو ساسانیوں کے زمانہ میں عیسائیوں کی
مشہور قیام گاہ تھا یہاں سے دس فرسخ دور تھا اسی طرح یہاں پر
برک (برکی) اور کیشی (کالسی) بھی مشہور مقامات تھے جو اضلاع جیحون
اور سیحون) کے منبع کے نزدیک ہیں۔"

اسی کتاب کے باب اول میں اسلام سے پہلے کے دور کے زیر عنوان وہ ایک جگہ لکھتے ہیں؛۔

"متعاقب صدی میں اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ شاپور کے عہد میں
عیسائیوں کو تنگ کیا گیا اور طوس و مرو میں تین سو چونتیس بڑے
پادریوں کے اسقف خانے تھے۔"

تاریخ بخارا کے ان اقتباسات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دریائے جیحون و سیحون اور طوس و مرو کے علاقوں میں جہاں کہیں بھی عیسائیوں کا ذکر آیا ہے وہ یہی افغان قبائل تھے۔ عربوں کی آمد کے وقت ان عیسائیوں کا حکمران ماہویہ سوری تھا جو ایران کے بادشاہ یزدگرد کے تحت مرزبان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور ان کا دارالحکومت مرو شہر تھا۔ یزدگرد نے عربوں کے خلاف جب مرو پر چڑھائی کی تو ماہویہ سوری نے عربوں کی حمایت کی۔ کہا جاتا ہے کہ مرو سے شکست

کھا کر واپسی پر یزدگرد کو قتل کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ماہویہ سوری نے اپنے تمام ہم قوم افغانوں کے ساتھ جو مذہب عیسائیت پر تھے مسلمان ہو کر عربوں کا پورا اعتماد حاصل کر لیا اور خلیفۂ وقت کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط کر لئے جیسا کہ تعلیقات پٹہ خزانہ کابل صـ ۲۲۲ پر یوں درج ہے:۔

"ماہویہ سوری در عصر حضرت علی بہ کوفہ رفت و از طرفِ حضرت خلیفہ برائے جمع جزیہ و خراج و مالیات وغیرہ بحیثیتِ مرزبان آنجا شناختہ شد۔"

ماہویہ سوری کے متعلق امام بلازری اپنی تصنیف فتوح البلدان حصہ دوم میں لکھتے ہیں:۔

"کہتے ہیں۔ علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مرو کا مرزبان ماہویہ کوفہ آیا۔ حضرت علیؓ نے اس کے لئے زمینداروں اور اساورہ اور دشلارین کے نام فرمان لکھا کہ "آئندہ وہ اسی (یعنی ماہویہ) کو جزیہ ادا کیا کریں۔"

کہتے ہیں کہ اس فرمان پر اہل خراسان نے عہد توڑ دیا لیکن ماہویہ نے فوجی طاقت سے اس بد امنی کو دبا کر امن و امان قائم کر لیا۔ اور جیحون پار کے علاقہ پر بھی فوج کشی کر کے تورانیوں کو مضبوطی سے قابو میں لایا اور تمام شورش کو کچل دیا۔ ماہویہ کے نسب کے متعلق کہ وہ افغان نژاد تھا۔ تعلیقات پٹہ خزانہ صـ ۲۲۳ میں یوں درج ہے:۔

"ماہویہ در اوائل اسلام مرزبانِ "مرو" بود کہ وے را ماہویہ سوری میگفتند۔

فردوسی کا ایک شعر ہے ؎

"ہیونی بر انگند بر سان باد — بہ نزدیک ماہوئی سوری نژاد"

آگے لکھا ہے۔

"ای مرزبان معروف سوری بعد از کشتن یزدگرد بدامنۂ حکمرانی خود را بہر سو وسعت داد و بلخ و ھری و بخارا لشکر فرستاد چنانچہ فردوسی اشارت میکند۔

بہ مہتر پسر داد بلخ و ھری — فرستاد بر ہر سوئی لشکری
چو لشکر فراوان شد خواستہ — دل مرد بے بر شد آراستہ
سپاہ را درم داد و آباد کرد — سر دودۂ خویش برباد کرد
یکے نامور پیش او اندرون — جہاں دیدہ ئے نام او کرسیون
بشہر بخارا نہادند روئے — چناں ساختہ لشکر جنگجوئے

الغرض ماہویہ سوری نے یزدگرد کے قتل کے بعد اپنی حکومت کے دائرہ کو چاروں طرف وسعت دینے کے لئے بلخ و بخارا اور ہرات پر لشکر کشیاں کیں اور اپنی حکومت کو مزید وسعت دی۔ حضرت علیؓ کی خلافت کے دنوں میں ماہویہ سوری کوفہ گیا تھا۔ حضرت علیؓ نے اُسے جزیہ کے جمع کرنے اور خراج و مالیات کا بھی مرزبان مقرر کیا۔ فردوسی شاہنامہ میں اُسے سوری نژاد کہتا ہے۔ سوری افغانوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے جس میں محمد سوری اور شیر شاہ سوری پیدا ہوئے۔ جیسا کہ سالنامہ کابل کے ایک مضمون سے پتہ چلتا ہے۔ مضمون کے الفاظ یہ ہیں:۔

"سلسلہ شاہان محلی غور افغانستان منسوب بسلسلۂ سوری ہائے پشتانہ، حتیٰ ماہوئی افغان سوری یکے از شاہان ہمیں سلسلہ و حکمران مرو بود ... در عہد خلیفہ ثالث آخرین شاہ فارس یزجرد در مرو از طرف ماہوئی افغان سوری حکمرانِ آں ولایت کشتہ گردید"

(بحوالہ سالنامہ کابل سال ۱۹۴۳ء، ص ۱۸-۱۹-۲۲)

علامہ احسان اللہ عباسی مصنف تاریخ اسلام لکھتے ہیں:
"ایک وسیع مقام کا نام غور ہے، یہاں کے باشندے صحیح قول یہ ہے کہ افغان تھے ... ان کو قومیت کے اعتبار سے سوری اور ملک کے اعتبار سے غوری لکھنا چاہیئے۔" (ص ۴۸۲)

کتاب پٹہ خزانہ میں درج ہے:-
"ہمیں سوری تاریخی است کہ با لودی ہا قرابت تامی داشتہ و در لودی ہا شاہانِ معروفی مانندِ شیخ حمید وسلطان بہلول وسلطان ابراہیم وغیرہ گذشتہ اند، و در سوری ہا ہم شہنشاہ معروف شیرشاہ سوری و عادل خان و اسلام شاہ و عدلی وغیرہ بہ آمدند۔"
(پٹہ خزانہ تعلیقات ص ۲۲۲)

سید عبدالجبار شاہ لکھتے ہیں کہ:-
"جوزی فس یا یوسی بس جس نے ۹۳ء میں یہودیوں کی قدیم تاریخ لکھی ہے اپنی گیارہویں کتاب میں نحمیاہ نبی کے ساتھی قیدی واپس جانے والے یہودیوں کے ضمن، بیان کرتا ہے کہ" دس قبیلے دریائے فرات سے اُس پار اب تک آباد ہیں۔ ان کی تعداد شمار سے باہر ہے"۔
دریائے فرات سے اُس پار مشرق کو فارس اور مشرقی علاقے افغانستان کشمیر اور تبت اور چین ہیں۔

ایک فرانسیسی سیاح فرائر نامی جب ہرات کے علاقہ میں سے گذرا تو اس نے لکھا ہے کہ:-
"اس علاقہ میں بنی اسرائیل بکثرت آباد ہیں اور اپنے یہودی مذہب کے ارکان کے ادا کرنے میں پورے آزاد ہیں۔"

بنی اسرائیل کی یہاں پر موجودگی کا ایک اور اہم ثبوت اُن کے انبیاء علیہم السلام کی موجودگی ہے جو ان کو وقت بہ وقت وعظ و نصیحت کرتے تھے اور ان کے ساتھ رہتے تھے۔ جسے ہم مختصر طور پر پیش کرتے ہیں۔

مصنف زبدۃ الاخبار، ہرات کے متعلق عبدالرحمٰن قامی کی تاریخ قدیم ہرات ابوالمعاص مصری کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ :-

"خراسان میں بہترین مقام ہرات ہے اور ہرات پر ستر انبیاء علیہم السلام نے دعائے خیر کی ہے۔"

بلخ میں کئی انبیاء علیہم السلام دفن ہیں جن میں سے ابن بطوطہ نے ایک نبی کے متعلق لکھا ہے کہ :-

"یہاں پر حزقیل نبی کا مزار ہے اس پر ایک قبہ بنا ہوا ہے جس کی ہم نے زیارت کی ہے۔"

ایک اور نبی کے متعلق جغرافیہ خلافتِ مشرقی میں درج ہے :-

"ساوا کا شہر جو ہمدان اور مرو کے وسط میں خراسان والی شاہراہ پر واقع تھا اس کے چار میل مغرب میں حضرت سماؤل نبی کا مزار تھا۔"

مولف لب لباب کا بیان ہے کہ :-

"کیقباد پسر خورس کے زمانہ میں بلخ اور اس کے اطراف میں بنی اسرائیل کے انبیاء حزقیل۔ الیاس۔ الیسع اور شمائل علیہم السلام بہ یک وقت موجود تھے۔"

ایک اسرائیلی پیغمبر باجوڑ کے جنوب میں رنگ بزنگ کے مقام پر دفن ہے۔ جو غازی پیغمبر کے نام سے مشہور ہے۔

اسی طرح دو اسرائیلی انبیاء علیہم السلام کی قبریں علاقہ بونیر میں ایک باجکٹہ میں

اور دوسری لیگانڑی کے مقام پر موجود ہے اور زمانہ قدیم سے وہاں کے لوگ ان کے مزاروں پر اظہار عقیدت کرتے آئے ہیں۔ ایک پیغمبر کا مزار تیمر گرہ سے تین میل کے فاصلہ پر کہنہ ڈھیر کے راستے میں موجود ہے۔

کتاب مقدس بائیبل میں لکھا ہے کہ :۔

"توما رسول جو حضرت عیسیٰ کا حواری تھا خراسان (یعنی افغانستان وغیرہ) میں ایک مدت تک تبلیغ کرتا رہا۔ بعد میں مدراس چلا گیا اور وہاں شہید ہو کر میلا پور مدراس میں دفن ہوا جس کی آخری آرام گاہ وہاں موجود ہے اور اس پر بڑا گرجا بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض حواری کشمیر میں بھی جلاوطن اسرائیلیوں کے پاس پہنچے تھے۔"

قاضی محمد یوسف لکھتے ہیں :۔

"کشمیر شہر سری نگر علاقہ خانیار حضرت بل میں حضرت یوز آسف نبی کا مزار ہے جس کے شمال میں مکانات جنوب میں راستہ عام اور میدان ہے، مشرق میں قبرستان ہے، مغرب میں وہ کوچہ ہے جو جامع مسجد سکندر بادشاہ کی طرف جاتا ہے اور درمیان میں ایک مستطیل عمارت ہے جو چار دیواری کے اندر ہے۔ کمرہ کے اندر ایک چوبی پنجرہ ہے جس کے اندر حضرت یوز آسف نبی کی قبر ہے۔ اور باہر غلام گردش میں جنوب کی طرف سید نصیر الدین کی قبر ہے جو چوبی پنجرہ سے باہر ہے ... کشمیر کے تمام مسلمان بالاتفاق یہی کہتے ہیں کہ یہ بنی اسرائیلی نبی ہیں۔ اور شام کے شہزادہ نبی کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں"۔

مولوی ذکاء اللہ دہلوی اقبال نامہ اکبری جلد پنجم میں لکھتے ہیں :۔

"اودھ (اجودھیا) ہند کے بڑے شہروں میں سے ہے یہ شہر

راجہ رامچندر جی کی راجدھانی ہے۔ اس کے پاس دو قبریں چھ چھ سات سات گز کی لمبی ہیں جن کو عوام الناس حضرت شیث و حضرت ایوب کی خوابگاہ جانتے ہیں۔ فیض آباد کا شہر اس کے پاس ہے۔" [۱]

ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ (جلد دوم) میں لکھتا ہے:۔

"کنجی گری جسے زمانہ حال میں ڈنگ نور کہتے ہیں اور کوچین (ہندوستان کے مشرقی حصے) کی ریاست میں واقع ہے اس شہر میں یہودی زمانہ قدیم سے رہے ان کے بعد نصرانی بھی رہے۔ کہتے ہیں کہ توما حواری ۵۲ء میں یہاں یہودیوں کی ہدایت و ارشاد کے لئے آئے تھے۔"

"حضرت عیسیٰ کے حواری رسول تھوما اور برتھولما اور متی رسول مشرق کو ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کو آئے۔ افغان جو بنی اسرائیل ہیں مذہب عیسوی میں داخل ہوئے۔ حضرت محمدؐ کے ظہور سے قبل مشرقی ممالک میں عیسائیت موجود تھی اور پھیلی ہوئی تھی قیس عبدالرشید وفد کے ساتھ دربارِ رسالت میں تشریف لے گیا اور مسلمان ہو گیا اور اس وقت وہ نصرانی تھا۔" (تاریخ کلیسا بحوالہ قاضی محمد یوسف فاروقی)

---

[۱] ضروری وضاحت:۔ مذکورہ بعض انبیاء علیہم السلام کے ناموں سے موسوم ان سے قبل یا بعد مختلف ادوار اور مقامات پر دوسرے انبیاء کا مبعوث ہونا خلاف قاعدہ نہیں۔ کیونکہ یہ فخر صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حاصل تھا۔ جن کے نام پر ان سے قبل کوئی بھی اسی نام سے موسوم نہ تھا۔ جیسا کہ ایک بلیغ اشارہ قرآن کی اس آیت سے ملتا ہے۔ یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُہٗ یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ٥
(سورہ مریم پارہ ۱۶)

الله

تحقیقِ جدید

ایران میں تیسری صدی کے ساسانی دور کے کتبے ملے ہیں۔ اس عہد میں ایرانی حکومت سندھ سے فرات تک وسیع تھی۔ ان کتبوں میں شرقاً غرباً سلطنت کے مذاہب کا ذکر ہے۔ پہلا مذہب یہودی دوسرا بدھ تیسرا برہمن اور چوتھا ناصر یعنی نصاریٰ کا ذکر ہے۔ مغرب کے عیسائیوں کو کرسچن کا نام دیا گیا ہے۔ ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھوں اور برہمنوں کے ممالک میں یہود و نصاریٰ آباد ہیں۔ گویا تیسری صدی عیسوی میں بدھوں اور برہمنوں کے علاقہ میں "یہودی" اتنی بڑی تعداد میں آباد تھے کہ اُن کو اولیت حاصل تھی۔ سلطنتِ ساسانیہ کے بلادِ شرقیہ میں پہلے نمبر پر "یہودی" کا ذکر ہے۔[1]

لکھا ہے "سرسوتی ندی کے پوتر بریما ورت کے ماسوا سارا جگت ملیچھ اچھاریہ حضرت موسیٰ کے پیروؤں سے بھرا پڑا ہے"۔ (پرتی سرگ پرب، کھنڈ ۱۔ ادھیائے ۵ شلوک ۳۰) اس حوالے سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے برہمنی علاقہ (جو سرسوتی یعنی دریائے ستلج سے مشرق میں دریائے برہم پتر تک واقع ہے) کے ماسوا سب جگہ بنی اسرائیل آباد ہیں۔ سارے جگت میں قدیم ہندوستان، کشمیر، افغانستان اور ایران کے علاقے شامل ہیں (بحوالہ خطوط جناب عبدالقادر نواں کوٹ لاہور)

ہندوؤں کے اٹھارہ پُران ہیں، اس میں سے نویں نمبر پر "بھوشیہ پُران" ہے، اس میں بنی اسرائیل کے بلادِ شرقیہ میں آباد ہونے کا ذکر ہے۔ کئی نبیوں کا مختصر حال بیان کرتے ہوئے حضرت موسیٰ کا ذکر ہے۔[2]

الغرض، مذکورہ بالا یہود و نصاریٰ اُن گمشدہ جلاوطن بنی اسرائیل کی اولاد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا، اور پختون و افغان وغیرہ کے ناموں سے مشہور ہوئے۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی کی ۱۹ ستمبر ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:

اسرائیلی ٹیم کا دورہ کشمیر، انبیاءؑ کی قبروں کی تلاش

نئی دہلی ۱۸ ستمبر (اپ پ) ایک اطلاع کے مطابق اسرائیل کی ایک گیارہ رکنی تحقیقاتی ٹیم نے حال ہی میں جموں و کشمیر کا دورہ کیا ہے۔ یہودی ٹیم نے یہ دورہ بھارت اور کشمیر کے ماہرین کے اس مبیّنہ دعوے کے بعد کیا کہ (بعض) اسرائیلی انبیاء علیہم السلام کی قبریں کشمیر میں ہیں۔ اسرائیلی ٹیم نے کشمیری حکام اور ماہرینِ اراضیات سے مفصل تبادلہ خیالات کیا، اور سرینگر سے ۵ کلومیٹر دور درگاہِ حضرت بَل کے اردگرد کا وہ علاقہ بھی دیکھا جہاں بقول بھارتی و کشمیری ماہرین کے متذکرہ انبیاء علیہم السلام کی قبریں بتائی جاتی ہیں۔۔

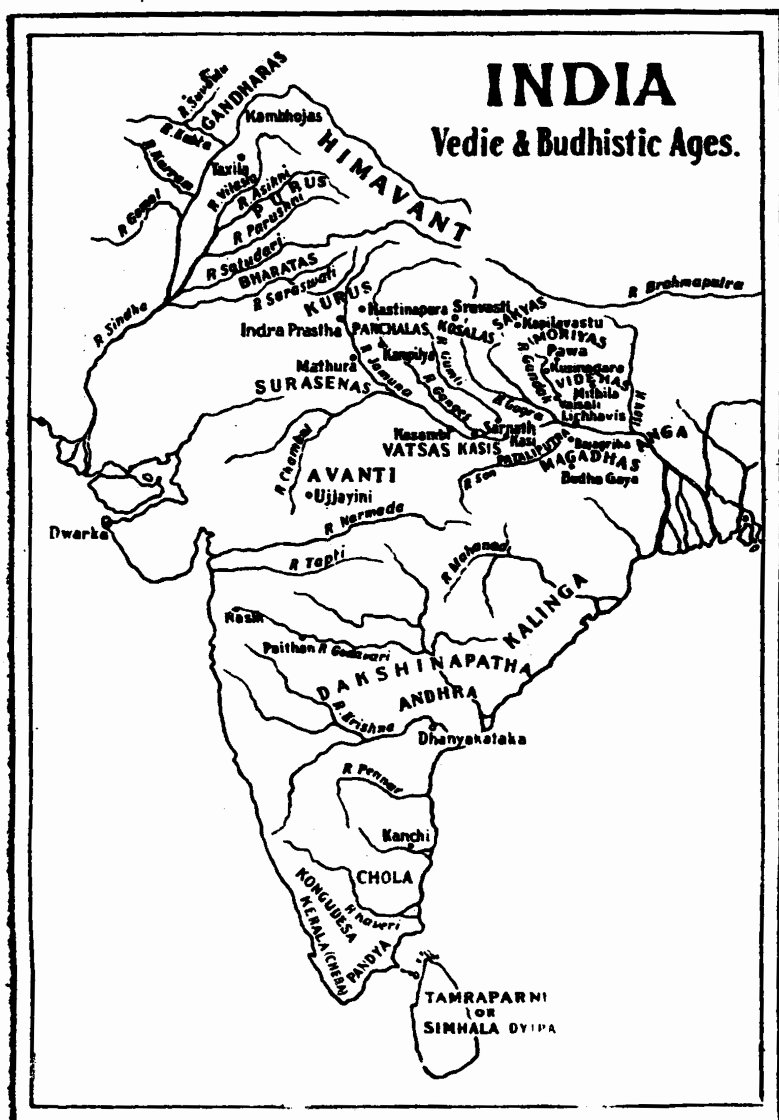
---

[1] ان کتبوں کا ذکر امریکہ کے ایک مصنف رچرڈ۔این فرائی نے اپنی کتاب دی ہیریٹیج آف پرشیا کے صفحہ ۲۰۰ پر کیا ہے۔

[2] بھوشیہ پران بزبان سنسکرت یونیورسٹی لائبریری لاہور میں موجود ہے۔

دریں اثناء کانگریس کے اخبار "قومی آواز" میں شائع ہونیوالی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیلی ٹیم نے محض تحقیق کیلئے دورہ کیا اور یہ دورہ سرکاری نہیں تھا۔

ویدی اور بدھ دور کے ہندوستان کا نقشہ





انسانی مشکلات کا حل زیادہ وعظ و نصیحت سے نہیں بلکہ زیادہ علم و آگاہی اور صحیح تر واقفیت سے ہو سکتا ہے۔

بعثت نبوی اور پختون

افغان وفد دربارِ رسالت میں

افغانوں میں تواتر سے وراثتی اور سماعی روایات کے مطابق بادیۂ ایران کے مشرق یا خراسان اور سجستان کے مغربی پہاڑوں اور دشتوں سے ان کے اجداد میں سے ایک وفد جو کہ اس وقت حضرت موسیٰ کے اُمتی اور عیسیٰؑ کے پیروکار تھے، قیس عبدالرشید کی قیادت میں مکہ، مدینہ جا کر ایمان لائے اور وہاں سے واپس آکر اپنی قوم کو قرآن کی تعلیم دینے لگے۔ اس واقعہ کے متعلق پوری قوم افغان متفق ہے اور انہیں اس کی صحت کا پختہ اعتقاد ہے ان کے علماء و مشائخ اور مشاہیر ہمیشہ سے مذکورہ وفد اور اسلام قبول کرنے کے متعلق یاد دہانی کے طور پر وعظ و نصیحت کرتے چلے آئے ہیں۔ تیرہ سو سال تک اس قوم کے کسی بھی فرد نے اس واقعہ کی صحت سے انکار نہیں کیا۔ دنیا میں کسی قوم کا ایسا متفق علیہ بیان اور مجموعی قومی اعتقاد کسی ایک واقعہ کی تصدیق کے لئے بلاشبہ ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض غیر افغان مورخ یہ اعتراض کرنے لگے ہیں کہ افغانوں کے قیس عبدالرشید کی قیادت میں افغانوں کے وفد کے دربارِ رسالت میں جانے کے واقعہ کا چونکہ تاریخی ثبوت موجود نہیں اس لئے اسے درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا خیال ہے کہ دربارِ رسالت میں جتنے وفود گئے ان کا احادیث میں صریحاً ذکر موجود ہے، سوائے افغان وفد کے۔ یعنی

کتب احادیث میں اس وفد کے جانے کے متعلق کہیں ذکر نہیں لہٰذا افغانوں کا یہ دعویٰ قابل تسلیم نہیں۔"

خبروں کی صحت معلوم کرنے کا ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ نہایت فہم و درایت اور احتیاط سے کام لیا جائے۔ وفد پر یہ اعتراض اُس وقت سے شروع ہوا جب کہ افغانوں کو آرین ثابت کرنے کے متعلق ایک نظریہ قائم اور منصوبہ تیار کیا گیا۔ دوسری طرف سے اس اعتراض کا جواب آج تک میرے سننے میں نہیں آیا جیسا کہ یہ اعتراض کسی نے سنا ہی نہیں یا اس کو کچھ اہمیت نہیں دی گئی ہو، یا جواب دینے سے قاصر رہے ہوں۔ یہ ایک ایسا معمہ ہے جسے اگر حل نہ کیا گیا تو پوری افغان قوم اور اُن کے علماء و مشائخ اور مشاہیر کے اس دعوے اور روایت کے ساقط الاعتبار ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور ان کے اس بنیادی اعتقاد کو جو اس وفد کے ذریعہ سے اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں ہے کمزور پڑ جانے کا احتمال ہے۔ حالانکہ پختونوں کی تاریخ کے ایک مسلمہ واقعے سے انکار کے لئے یہ استدلال درست نہیں۔ اصولاً حدیث کے بیان سے تو استدلال کیا جا سکتا ہے۔ حدیث کے سکوت سے استدلال درست نہیں۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ان معترضین کو افغانوں کی تاریخ کے ایک واقعہ سے انکار کے لئے تو حدیث کی کتابیں یاد آئیں لیکن تاریخ کے مسلمات کے خلاف اپنے اس نظریے کے اثبات کے لئے مجموعہ ہائے احادیث یاد نہیں آئے کہ پختون آرین نسل سے تعلق رکھتے ہیں اگر ان کے نزدیک پختونوں کی تاریخ کے کلیات و جزئیات کی تصدیق کے لئے کتب احادیث سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے تو ان کے اپنے نظریئے کے اثبات کے لئے احادیث سے استدلال کی ضرورت کیوں نہیں؟

الغرض وفد پر اعتراض کے ثبوت میں معترض نے جو دلیل پیش کی ہے وہ ایسی نہیں کہ اس سے افغانوں کے وفد کا واقعہ جھوٹا ثابت ہو سکے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ کتب احادیث میں دنیا کے سارے واقعات درج ہوں۔ بلکہ قرآن مجید کا اندازِ بیان بھی یہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالٰے فرماتے ہیں

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ط (المؤمن آیت ۷۸)

اور پھر فرماتے ہیں۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ط وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (النساء، آیت ۱۶۴)

جس کا مطلب یہ ہے:

اور کچھ رسول ہیں کہ جن کا ذکر ہم نے تم سے پہلے کر دیا ہے اور کچھ رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے تم کو نہیں سنایا اور اسی طرح اللہ نے موسٰی سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایسے بے شمار واقعات اور حالات ہیں جس کا ذکر کتب احادیث میں نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کسی صحیح واقعہ یا چیز کا وجود ہی نہیں۔ مثلاً کتب احادیث میں 'حرا' 'جودی' اور طور نامی پہاڑوں کا ذکر موجود ہے لیکن کوہ ہمالیہ' پامیر' کے مور اور رہابن وغیرہ پہاڑوں کا ذکر تو کہیں درج نہیں' تو کیا اب اس دلیل کو مانا جائے گا کہ ان پہاڑوں کا کہیں وجود نہیں' حالانکہ ان مذکورہ پہاڑوں کا وجود ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

حضورِ رسالت میں جنوں کا وفد

مذکورہ واقعات اور بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک

وفد کے متعلق، جس کا ذکر قرآن اور کتب احادیث میں "جنّ" کے نام سے آیا ہے، ایک بات آتی ہے وہ یہ کہ شاید اس ذکر جنّ سے قیس کا وفد مراد ہو اور اسے بوجہ صحرانشینی اور وحشی و مستور زندگی گزارنے کے "جنّ" کے صفتی نام سے موسوم کیا ہو۔ اس لئے کہ لفظ جنّ کے معنی میں ستر و پوشیدگی کی صفت کا اعتراف تمام اہل لغت نے کیا ہے۔ صاحب لغات القرآن نے لکھا ہے کہ جنّ "جَنّ" سے مشتق ہے۔ چونکہ یہ عام طور پہ نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں اس لئے ان کا نام جِن ہوا (جلد ۲ صفحہ ۲۵۵) صاحب بیان اللسان نے اس کے معنی میں لکھا ہے "ہر چیز جو حواس سے پوشیدہ ہو"۔ (صفحہ ۱۶۷) اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار (ڈی۔بی میکڈانلڈ) نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس لفظ کے معنی، مشتق، اطلاقات اور اقسام کی بحث کی ہے۔ وہاں بھی مستور رہنے اور پوشیدہ ہونے کے معنی موجود ہیں (مطبوعہ لاہور، جلد ۷ صفحہ ۴۵۹-۴۶۳)

سر سید احمد خاں نے سورہ جنّ کی تفسیر کے شروع میں لفظ جنّ کے اشتقاق و مادہ اور معنی پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"لفظ جنّ لفظِ اِجتنان سے مشتق ہے جس کے معنی چھپے ہوئے کے ہیں اور عربی زبان کے محاورے میں جو چیز پوشیدہ ہو اس پر جنّ کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ پیٹ کے بچے کو بھی جَنِین اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ پیٹ کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے"۔

آخری جملے میں سر سید کا اشارہ سورہ نجم کی آیت ۳۲

"وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ"

کی طرف ہے۔ لفظ جنّ کے اشتقاق و معنی پر روشنی ڈالنے کے بعد سورہ جنّ کی پہلی آیت میں "نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ" کا ترجمہ انہوں نے "چند چھپے ہوئے

شخص" کیا ہے۔ (مقالات سرسید، حصہ دوم، صفحہ ۸ ۱۳۷-۱۳۷)
مولانا غلام رسول مہر نے اس لفظ کے معنی کے ساتھ اس کی اصل کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ لفظ اصلاً آرامی ہے جس کے معنی ہیں چھپا ہوا، مستور"
(تاریخ شام (ترجمہ اردو) صفحہ ۱۵۴ حاشیہ)

بعض اہل علم نے اس کی اصل عبرانی بتائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ستر و پوشیدگی اور غیر مرئی ہونا نوع جن کی صفت ہے۔ اس لئے شاید اس وفد کو بھی اس صفتی نام سے یاد کیا گیا ہو نہ کہ اس سے مراد "نوع جن" ہو، جیسا کہ عربوں کا محاورہ، بلکہ دوسرے لوگوں کا بھی یہی قاعدہ ہے کہ جس شخص میں کسی دوسری چیز کی کوئی صفت موجود ہو خواہ وہ اچھا ہو یا برا تو اس چیز کے صفتی نام سے وہ موسوم کیا جاتا ہے مثلاً اسد اللہ، سیف اللہ، ابو جہل وغیرہ اسی طرح اگر ایک آدمی بے وقوفی کا کام کرے، طاقت کا مظاہرہ کرے یا کسی خصلت کا اس سے اظہار ہو تو اسے گدھے، شیر یا کتے کے صفتی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص گدھا، شیر یا کتا ہے اور نیز ایسے شخص کے متعلق بھی جو دیکھنے میں شاذ و نادر آتا ہو اسے پشتو زبان میں "پیرے" یعنی جن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور لڑکی کو جنئی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ پردے میں رہتی ہے اور عام لوگوں کی نظروں سے مستور ہے۔ اسی طرح لڑکے کو پشتو زبان میں ہلک کہتے ہیں جو عبرانی لفظ ہَلّلُوْیَا سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے پیدائش پر خوشی کے ساتھ اظہار۔

واضح ہو کہ ان مذکورہ صفاتی ناموں سے موسوم کرنے کا یہ مطلب ہرگز

نہیں ہوسکتا کہ گویا سب سے وہ نوع یا جنس نہیں جس کا صفتی نام کسی شخص یا اشخاص پر رکھا گیا ہو، بلکہ وہ نوع اپنی جگہ قائم اور موجود ہوتی ہے۔ اس نوع کی صفت سے کسی شخص کا متصف اور موسوم ہونا نہ تو خلافِ قاعدہ ہے نہ غیر ممکن۔ جیسا کہ قرآن میں ذکر ہے کہ :۔ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَانٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝
(القصص پارہ ۲۰)

ایک مجوسی وفد کی حقیقت بطور مثال

قبل ازیں اسی طرح جیسا کہ ذکر ہوا، افغانوں کے ایک وفد کو کتاب مقدس بائیبل میں مجوسی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس وقت افغانوں کو مشرق یعنی موجودہ افغانستان اور اس کے اطراف میں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا علم ہوا جیسا کہ ان کو اپنے علمائے تورات اور انبیاء علیہم السلام کی طرف سے ان کی ولادت کے متعلق بشارت ہوئی تھی کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش پر ایک ستارہ نمودار ہوگا۔ انہوں نے جب وہ ستارہ نمودار ہوتے دیکھ لیا تو ان کا ایک وفد بیت المقدس میں اس غرض سے گیا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کا دیدار کرے اور اس وفد میں بقول علامہ احمد حسین الہ آبادی مترجم تاریخ ابن خلدون، چیدہ چیدہ حکماء اور علمائے تورات) جو حکمت و نجوم و ہیئت میں کامل اور اپنے مذہب کے مقتدا اور پیشوا مانے جاتے تھے شامل تھے۔ وہ لوگ مجوسی نہ تھے یعنی مجوسی عقیدہ اور مذہب سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن مجوسیوں کے ملک اور ان کی سلطنت کے حدود میں رہتے تھے اس لئے ان کو مجوسی کے نام سے یاد کیا گیا۔

واضح رہے کہ افغان اپنے ہم نسل اور ہم قوم پیغمبر حضرت عیسیٰؑ پر بھی ایمان لا چکے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے انہیں تورات پر صحیح عمل کرنے کی پُر زور تلقین کی

تھی اور اُس کی تصدیق کی۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق وصیت اور خوشخبری بھی سنائی اللہ فرماتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ط (الصّف، آیت ۶)

افغان قوم کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ حضرت عیسٰی سے قبل حضرت موسیٰ کو بھی اپنی قوم بنی اسرائیل ہی کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اور افغان علماء اس خصوصیت کے لئے دیگر اثبات کے علاوہ قرآن سے بھی استدلال کرتے ہیں مثلاً اللہ فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۵ۙ (ابراھیم آیت ۵)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ ط (الصّف آیت ۵)

ذیل میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے تفہیم القرآن اور غلام احمد پرویز کے مفہوم القرآن کے مضامین درج کرتے ہیں جس سے افغانوں کے اس دعوے کو تقویت ملتی ہے کہ ان کا ایک وفد دربار رسالت میں حاضر ہوا تھا۔ کیونکہ افغان قوم میں وہ سارے صفات موجود ہیں جن کا ذکر ان مضامین میں کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اقوام عالم میں صرف افغان ہی ان خصوصیات کے حامل اور اپنی منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ نیز یہ کہ مذکورہ بالا اور مندرجہ ذیل آیات قرآن کا بیان اور مفہوم بھی یکساں ہے جس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ گروہ یا جماعت جس کا ذکر کیا جا رہا ہے قوم بنی اسرائیل ہی کے افراد تھے نہ کہ کسی اور قوم کے، قارئین سے التماس ہے کہ وہ خالی الذہن ہو کر انصاف

کے ساتھ اس پر غور کریں۔

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں مری بات

چوں مسلماناں اگر داری جگر ، در ضمیر خویش و در قرآں نگر

صد جہان تازہ در آیات اوست، عصرہا پیچیدہ در آنات اوست

وَإِذْ صَرَفْنَآ إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوٓا أَنصِتُوا ۖ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ۝ قَالُوا يَا قَوْمَنَآ إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ يَا قَوْمَنَآ أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ وَمَن لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِن دُونِهِ أَوْلِيَآءُ ۚ أُولَٰٓئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلَىٰٓ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۚ بَلَىٰٓ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

(الاحقاف، آیت ۲۹ تا ۳۳)

مودودی صاحب کی تحقیق

مودودی صاحب نے ان آیات کا ترجمہ اور اس کی تشریح و تفہیم یہ کی ہے۔

(اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں آپ قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انہوں نے جا کر کہا "اے ہماری قوم کے

لوگو، ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف۔ اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پہ ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں سے درگذر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا۔ اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچا لیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور کیا ان لوگوں کو یہ سجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے ہیں اور ان کو بناتے ہوئے جو نہ تھکا، وہ ضرور اس پہ قادر ہے کہ مُردوں کو جلا اٹھائے؟ کیوں نہیں، یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے"۔

اس آیت (۲۹) کی تفسیر میں جو روایات حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زبیر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرات حسن بصری، سعید بن جبیر، زرّ بن جبیش، مجاہد، عکرمہ اور دوسرے بزرگوں سے منقول ہیں وہ سب اس بات پہ متفق ہیں کہ جنوں کی پہلی حاضری کا یہ واقعہ، جس کا اس آیت میں ذکر ہے، بطن نخلہ میں پیش آیا تھا..... اس (آیت ۳۰) سے معلوم ہوا کہ یہ جن پہلے سے حضرت موسیٰ اور کتب آسمانی پہ ایمان لائے ہوئے تھے۔ قرآن سننے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء دیتے چلے آ رہے ہیں، اس لیے وہ اس کتاب اور اس کے لانے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہ بھی ایمان لے آئے۔

...... معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جنّوں کے پے در پے وفود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے لگے اور آپ سے ان کی رُو در رُو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس بارے میں جو روایات کتب احادیث میں منقول ہوئی ہیں، ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں کم از کم چھ وفد آئے تھے۔

ان میں سے ایک وفد کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رات بھر غائب رہے۔ہم لوگ سخت پریشان تھے کہ کہیں آپ پر حملہ نہ کر دیا گیا ہو۔ صبح سویرے ہم نے آپ کو حراء کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے پر آپ نے بتایا کہ ایک جنّ مجھے بلانے آیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ آکر یہاں جنّوں کے ایک گروہ کو قرآن سُنایا (مسلم، مسندِ احمد، ترمذی، ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن مسعود ہی کی ایک اور روایت ہے کہ ایک مرتبہ مکہ میں حضور نے صحابہ سے فرمایا کہ آج رات تم میں سے کون میرے ساتھ جنّوں کی ملاقات کے لیے چلتا ہے؟ میں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگیا مکہ کے بالائی حصہ میں ایک جگہ حضور نے لکیر کھینچ کر مجھ سے فرمایا کہ اس سے آگے نہ بڑھنا۔ پھر آپ آگے تشریف لے گئے اور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے اشخاص ہیں جنہوں نے آپؐ کو گھیر رکھا ہے اور وہ میرے اور آپؐ کے درمیان حائل ہیں (ابن جریر، بیہقی۔ دلائل النبوۃ۔ ابونعیم اصفہانی)

ایک اور موقع پر بھی رات کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور مکہ معظمہ میں حجُون کے مقام پر جنّوں کے

ایک مقدمہ کا آپ نے فیصلہ فرمایا۔ اس کے سالہا سال بعد ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں جاٹوں کے ایک گروہ کو دیکھ کر کہا جِنّوں کے مقام پہ جِنّوں کے جس گروہ کو میں نے دیکھا تھا۔ وہ اِن لوگوں سے بہت مشابہ تھا۔ (ابن جریر)
(تفہیم القرآن جلد چہارم ص ۶۱۸)

پرویز صاحب کی تحقیق

پرویز صاحب کے قلم سے ان آیات کا ترجمہ اور مفہوم یہ ہے :۔

(۲۹) (اے رسول! اگر یہ شہری آبادیاں تمہاری دعوت کی مخالفت کرتی ہیں تو اس سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے ۳۴/۲۸۔ جن میں شہری اور دیہاتی مہذب اور غیر مہذب، صحرانشین، سب شامل ہیں۔ دیہاتی اور صحرانشین بدو اس کی طرف متوجہ ہوتے جا رہے ہیں۔ (تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے تمہاری طرف صحرانشینوں کی ایک جماعت کو متوجہ کیا تھا تاکہ وہ قرآن کو سنیں (۷۲/۱) چنانچہ جب وہ تمہاری مجلس میں جہاں قرآن کا بیان ہو رہا تھا، آئے تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ وہ اسے نہایت خاموشی سے سنیں۔ جب وہ بیان ختم ہو گیا تو وہ اپنی قوم کی طرف واپس گئے تاکہ انہیں ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کریں۔

(۳۰) انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا کہ ہم ایک ایسی کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد (محمدؐ پہ) نازل ہوئی ہے۔ وہ ان تمام باتوں کو سچ کر دکھانے والی ہے جو کتاب موسیٰ میں بیان ہوئی تھیں۔ وہ حق کی راہ نمائی کرتی ہے۔ اور انسان کو وہ راستہ دکھا دیتی ہے

جو اُسے سیدھا، اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

(۳۱) (انہوں نے کہا کہ) اے ہماری قوم کے لوگو! تم اس داعی الی الحق کی دعوت کو قبول کرو اور جس طرح وہ کہتا ہے اس کے مطابق خدا پر ایمان لاؤ۔ وہ تمہاری لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہیں الم انگیز تباہی سے بچالے گا۔

(۳۲) یاد رکھو! جو شخص اس کی دعوت کو قبول نہیں کرے گا (اور غلط راستے پر چلتا رہے گا خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے، اس کا انجام تباہی اور بربادی ہوگا) روئے زمین پر کوئی قوت ایسی نہیں جو خدا کے قانون کو شکست دے سکے۔ (اس لئے اس کا ایسا انجام ہو کر رہے گا) ایسے شخص کا، خدا کے سوا کوئی کارساز او سرپرست نہیں ہوگا۔ جو لوگ اس کی دعوت کو قبول نہیں کرتے وہ کھلی گمراہی میں ہیں۔

(۳۳) (یہ بات، اس وحشی قبیلہ کے افراد کی سمجھ میں تو آگئی۔ لیکن یہ مکہ کے مہذب ترین قبیلہ قریش کے افراد ہیں کہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی) کیا انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے کائنات کے اس قدر محیّر العقول سلسلہ کو پیدا کیا۔ اور اس سے وہ ذرا بھی تھکا نہیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر سکے ۵۰/۱۵ بیشک وہ اس پر قادر ہے۔ اس نے ہر بات کے لئے محکم قوانین مقرر کر رکھے ہیں جن پر اُسے پورا پورا کنٹرول ہے۔ انہی قوانین کے مطابق مُردوں کو زندگی مل جاتی ہے"۔ (مفہوم القرآن جلد سوم ص ۱۱۸۱)۔

مباحث پر آخری نظر

حضرت موسیٰؑ کے بعد جو رسول بھی اُمتِ موسیٰ میں آئے وہ سب حضرت موسیٰؑ کے تابع اور تورات کے مطیع تھے۔ حضرت عیسیٰؑ ان میں سلسلۂ انبیاء بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر اور خلیفہ تھے۔ خدا وند کریم فرماتے ہیں:

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا (الاحقاف آیت ۱۲)

قرآن سے قبل انبیاء بنی اسرائیل میں صرف حضرت موسیٰؑ کی کتاب حق امامت کی سزاوار تھی۔ کسی اور نبی کا صحیفہ امام کہلانے کا حق نہ رکھتا تھا۔ الغرض گروہ جن کا یہ قول اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى (الاحقاف آیت ۱۲)۔ یعنی ہم نے ایک عظیم الشان کتاب شریعت (قرآن کریم) کو سنا جو حضرت موسیٰ کی کتاب شریعت کے بعد نازل ہوئی ہے۔ حالانکہ حضرت موسیٰ کے بعد بے شمار نبی بنی اسرائیل میں آئے تھے اور یہی وفدِ جن اور اس کی قوم اس سے قبل حضرت عیسیٰ کی دعوت اسلام قبول کر کے ان پر ایمان لا چکے تھے۔ مگر وہ ان کے صحائف کو کالعدم قرار دیتے ہیں اور قرآن سے قبل صرف حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں ہزارہا نبی ہوئے مگر صاحب شریعت صرف حضرت موسیٰؑ تھے۔ باقی سب رسول مطیع تورات اور تابع موسیٰ تھے۔ تورات کے بعد اور قرآن سے قبل کے تمام صحائف تورات ہی میں شمار ہوتے تھے جیسا کہ البیرونی لکھتے ہیں:- "جب عبرانی اور سریانی زبانوں میں جن میں قرآن کے قبل کی آسمانی کتابیں ہیں۔ اس پر نظر ڈالتے ہیں تو تورات اور اس کے بعد کی انبیاء کی کتابوں میں جن کی شمار تورات کے اندر ہے۔ لفظ "رب" کو عربی زبان کے لفظ "اللہ" کے مطابق پاتے ہیں۔ تورات موسیٰ میں ہے" موسیٰؑ کے ربّ کا یہ قول ہے" (کتاب الہند حصہ اول ص ۳۴)

مختصر یہ کہ حضرت موسیٰؑ اُمتِ موسویہ کے شارع اور مطاع نبی تھے اور ان کے بعد جس قدر نبی اور رسول حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ تک آئے وہ

سب تورات اور حضرت موسیٰؑ کے تابع تھے۔ بیشک وہ صاحب وحی تھے مگر وہ کوئی جدید شریعت لے کر نہیں آئے۔ البتہ ان کی وحی میں شریعت موسوی کی تصدیق اور تائید اور مشکلات کا حل تھا اور لوگوں کو صحیح راستے پر ڈالتا تھا۔

الغرض گروہ جنؑ یا فدِجنؑ کا یہ بیان کافی سمجھ داری اور حقیقت پر مبنی ہے اگرچہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے متبع تھے۔ مگر وہ اہل علم اور دین کے راز سے پوری طرح واقف تھے اور یہ کارنامہ صرف بنی اسرائیل ہی کے لیے موزوں اور مناسب ہوسکتا ہے جو سمجھ داری میں لاثانی ہیں جیسا کہ قرآن میں ذکر ہے: وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ۔ اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے ان کو جہاں والوں کے مقابلے میں پسند کرلیا ہے (سورۂ دخان)

ایک ضروری وضاحت:

قوم پختوں یا افغان، جیسا کہ اس کتاب میں ذکر ہوچکا ہے، پہلے یہودیت اور بعد میں عیسائیت پر قائم ہوچکے تھے۔ ان کے نزدیک دونوں مذاہب ایک ہی شریعت رکھتے تھے جو اللہ کی طرف سے ان کو اپنے پیغمبروں کے ذریعے پیش کی گئی تھی۔ وہ خالص اسلام ہی تھا اور یہودیت اور عیسائیت کی جو شکل آج ہمارے سامنے ہے وہ ایسا ہرگز نہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کے مبعوث ہونے کی خوشخبری دی تھی اور اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے حضرت محمدؐ کے مبعوث ہونے کی بشارت دی تھی۔ اسی سبب سے افغان قوم کے علماء بخوبی جانتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے بعد حضرت محمد خاتم النبیین پیدا ہوں گے لہٰذا یہ لوگ ہمیشہ آپ کی بعثت کی خبر سننے کے منتظر رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جوں ہی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کی بعثت کی خبریں اپنے اپنے وقت پر سنیں، ان کی تصدیق و توثیق کے لیے اپنے وفود بھیجے تھے اور تصدیق ہوتے ہی ایمان لے آئے تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مذاہب کے متعلق مختصراً کچھ ضروری وضاحت کردی جائے۔

یہودیت: سید سراج الاسلام لکھتے ہیں:

"دراصل یہودیت کی اساس دو نظریوں پر قائم ہے ایک خدائے واحد کا اقرار اور

دوسرے یہودی قوم کو سب سے افضل اور برتر تسلیم کرنا۔ یہودی مذہب شرک کا مخالف ہے اور وہ عیسائیوں اور زردشتیوں کی طرح تثلیث پرستی اور ثنویت پر بھی عقیدہ نہیں رکھتا ہے، وہ خدا کی ذات سے کسی دوسری ہستی کو منسوب نہیں کرتا بلکہ خدا کو ایک بلند تر اور افضل طاقت سمجھتا ہے یہودی مذہب دنیا کے قدیم مذاہب میں سے ہے اور عیسائیت واسلام کی طرح الہامی مذہب ہے لیکن یہودی مذہب کی کہانی اُن کے عروج و زوال کی کہانی ہے، حکومتوں کے قیام اور ان کی تباہی کی داستان ہے جس کا آغاز ابراہیمؑ سے ہوتا ہے جنہوں نے وحدانیت کا نظریہ دیا اور ایک خدا کی عبادت کی تعلیم دی، ابراہیم کے نعرۂ توحید سے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی ابتدا ہوتی ہے"۔ عہد قدیم صفحہ ۵۴

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"قرآن مجید نے عرب کے یہودیوں کے ذمائم اخلاق کو تو کھول کھول کر بیان کیا ہے، لیکن ان کے اعتقادات پر کوئی خاص حملہ نہیں کیا، صرف ایک موقع پر یہ آیت ہے۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ ۔ (ترجمہ) یہود نے کہا عزیر خدا کے بیٹے ہیں"۔ (سورۂ توبہ، آیت ۳۰)

عزیر سے مراد عزرا کاہن ہیں، جنہوں نے توراۃ کو اپنے اعجاز سے دوبارہ زندہ کیا۔ معترضینِ اسلام کا بیان ہے کہ یہودیوں میں عزیر کی ابنیت کا کوئی عقیدہ نہیں ہے۔ اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ سراسر خلافِ واقعہ ہے، اِس اعتراض کا جواب تو جیسا بیضاوی نے لکھا ہے، یہ ہے کہ قرآن نے اپنی یہ آواز مدینہ میں یہودیوں کے اندر بلند کی اور کہیں سے ان کی تکذیب اور خلافِ واقعیت کی صدا نہ اٹھی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ عرب کے یہودیوں میں یہ اعتقاد تھا"

میرے نزدیک اصل یہ ہے کہ یہودیوں میں ابنیت کا تخیل نہایت قدیم ہے "تکوین کے چھٹے باب میں ہے کہ "خدا کے بیٹوں نے دیکھا کہ انسان کی بیٹیاں خوبصورت ہیں"! ابن اللہ کے معنی عبرانیوں کے محاورہ میں خدا کے محبوب اور پیارے کے تھے"۔ (ارض القرآن جلد دوم ص ۱۸۷)

سید سلیمان ندوی کا یہ بیان کہ ابن اللہ کے معنی عبرانیوں کے محاورے میں خدا کے محبوب اور

پیارے کے ہیں. قرآن کی اس آیت سے مطابقت رکھتا ہے۔
قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ (ترجمہ) ان سے کہو اے بنی اسرائیل بزعمِ خویش اگر واقعی صرف تم ہی خدا کے پیارے ہو اور خدا کے عزیز ترین دوست ہو تو اس کی راہ میں مرنے کی تمنا کرو یہی تمہارے دعوے کی صداقت کی دلیل ہو گی۔ (سورہ جمعہ، آیت ۶)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں:

"یہود توراۃ میں پڑھ چکے، اور اپنے پیغمبروں کی زبانی سُن چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ ایک زمانہ میں اپنے اس عہد کو "بنی اسرائیل" کے بھائیوں "بنی اسمٰعیل" میں پھر تازہ کرے گا، اور اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ (محمدؐ) یثرب میں آئے گا، اور یہ (مدینہ) اس کا دار الہجرت بنے گا، اور اس کی دعوتِ الٰہی کا مرکز قرار پائے گا۔ اور یہ کہ "بت پرستوں" کے مقابلہ میں اُس کی مجاہدانہ زندگی کامیاب ہو گی، اور ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ و موسیٰؑ کے اعلانِ حق کو دوبارہ اُسی کے ہاتھوں سربلندی نصیب ہو گی۔ اور اس طرح وہ نبیِ منتظر کے انتظار اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کے لیے زندگی بسر کرتے تھے چنانچہ "یسعاہ نبی کے صحیفہ میں" صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اس نبی کا ظہور سلع پہاڑ کے قریب ہو گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ "مدینہ" کی آبادی ایسی جگہ واقع ہے جس کے مشرق میں جبلِ اُحد ہے اور مغرب میں جبلِ سلع اور درمیان میں وادیِ مدینہ ہے۔" (قصص القرآن جلد اوّل ص ۵۶۰)

حضرت عیسیٰؑ:

حضرت عیسیٰؑ جن کا انجیل میں نام یسوع لکھا ہے، وہ حضرت موسیٰؑ سے پورے تیرہ سو سال بعد بیت اللحم نامی گاؤں میں خدا کے حکم پر مریم کے بطن سے بے باپ کے پیدا ہوئے۔ واضح ہو کہ حضرت عیسیٰ ناصری کا ایک لقب المسیح بھی ہے یعنی جس

کی بعثت کی خبر حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی اور بنی اسرائیل جس کی آمد کے تیرہ سو سال سے منتظر تھے۔ مسیح کے معنی عبرانی زبان میں "برگزیدہ اور چنا ہوا" کے ہیں۔

حضرت عیسیٰ مسیح نے اپنا پیغام رائج الوقت آرامی زبان میں پیش کیا جو ان کی مادری زبان تھی۔ عبرانی زبان یہودیوں جلاوطنی کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ اور اس کی جگہ آرامی نے لے لی تھی، عبرانی کی حیثیت محض مقدس زبان کی رہ گئی تھی اور یہودی خود سرکاری خط و کتابت میں آرامی زبان ہی استعمال کرتے تھے۔

انجیل کا نزول، قانونِ تورات کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا یعنی نزولِ تورات کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دین حق میں پیدا کر لی تھیں انجیل نے تورات کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو ان گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی، اور اسی طرح تکمیل تورات کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کا فراموش شدہ پیغام ہدایت، حضرت عیسیٰ ہی نے دوبارہ یاد دلایا۔

عیسائیت

حضرت عیسیٰؑ کے گرد اُن کے ہم نسل حواریوں کی ایک جماعت جمع ہو گئی جو آپ کی تعلیم کی علم بردار اور آپ کی دعوتِ اصلاح کی مبلغ تھی۔ اس جماعت کے افراد اور یہودیوں میں کچھ خاص فرق نہ تھا اس لئے کہ شریعت کے احکام دونوں کے لئے قریباً ایک ہی تھے۔ عیسائیت کی بنیاد یہودیت پر رکھی گئی ہے اس لئے یہودیوں کی مقدس کتاب کو عیسائیوں میں الہامی درجہ حاصل ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اسی کی تعلیم دی اور توحید پرستی کی طرف لوگوں کو بلایا۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا عین مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام تھا، لیکن بعد میں مسیح کی تعلیم یہودیت کے دائرہ سے نکل کر غیر یہود تک جا پہنچی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت پر غیر یہودی چھا گئے جس کی وجہ سے عیسائیت اپنی تعلیم سے ہٹ کر کچھ کی کچھ

ہوگئی اور ۳۲۵ء میں نیقیہ کی مشہور کونسل منتخب ہوئی تو عیسائیت ایک بالکل جداگانہ اور یہودیت سے الگ مذہب کی صورت میں منتقل ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ عیسیٰؑ کی الوہیت اور خدا کے بیٹے کا تصور بھی شامل ہوگیا۔ دراصل یہودیت کی اساس دو نظریوں پر قائم ہے ایک خدائے واحد کا اقرار اور دوسرے یہودی قوم کو سب سے افضل اور برتر تسلیم کرنا۔ یہودی مذہب شرک کا مخالف ہے اور وہ عیسائیوں اور زرد شتیوں کی طرح تثلیث پرستی اور ثنویت پر بھی عقیدہ نہیں رکھتا ہے۔ وہ خدا کی ذات وصفات میں کسی دوسری ہستی کو شریک تسلیم نہیں کرتا، اس کے نزدیک خدا ایک اعلیٰ و افضل اور قادر مطلق ہے حضرت عیسیٰؑ نے یہودیت کے مروجہ عقائد اور حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات کے عین مطابق سرمایہ داری اور معاشی طبقہ واریت، خودغرضی اور مطلب پرستی کی سختی سے روک ٹوک کی اور اسے برا ٹھیرایا۔ حضرت عیسیٰؑ نے ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم بھی نہیں دی تھی یہ چیز بعد میں عیسائیت میں داخل کی گئی بلکہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی طرح دنیا سے کنارہ کشی کو سختی سے منع کیا تھا۔ اخلاقیات کا جو درس موسیٰؑ نے دیا تھا اسی کی تعلیم عیسیٰؑ نے دی، اس میں سرِ مو فرق نہ تھا۔

الغرض عیسائیت یہودیت کی ایک نئی شکل ہے، ان کے عقائد وعبادات وہی ہیں، ان کی تعلیمات موسوی ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ بعد کے عیسائیوں نے اس کو ایک الگ اور مستقل مذہب کی شکل میں پیش کیا۔

حواری

عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ "نصاریٰ حضرت مسیح کے حواریوں کو شاگرد کہتے ہیں۔ یہ تعبیر بے اصل نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے "حبور" عبرانی لفظ ہے، جس کے معنی شاگرد کے ہیں۔

اور اس کی جمع "حبوریم" آتی ہے۔ یہی حبوریم ہے جو عربی میں جا کر حواری اور حواریین کہلایا" (قصص القرآن جلد چہارم ص۱۸۷)

خدا پرستی کا اعلان

عیسائیت کے موجودہ اعتقادات اور مذہبی شکل حضرت عیسیٰؑ کے بہت بعد کی تبدیلی ہے۔ آرمینیا اور گرجستان (یا غرجستان) میں مقیم افغان قوم کے اکابر نے جو اس وقت عیسائی مذہب رکھتے تھے ایک مراسلہ ۴۴۰ء میں ایران کے مجوسی بادشاہ کو لکھا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ اعتقاداً عیسائیت کی حقیقی تعلیمات پر قائم تھے۔ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی تاریخ ایران میں اس واقعے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"بہرام گور کی وفات پر اس کا بیٹا یزدگرد دوم ۴۴۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت ایرانی دارالحکومت میں یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ جب تک گرجستان (غرجستان) اور آرمینیا میں عیسائیت کا زور رہے گا، ایران کا تسلط برقرار نہیں رہ سکے گا۔ آخر اُمرائے سلطنت کے مشورے سے بادشاہ کی طرف سے آرمینیا کے اُمراء کے نام فرمان جاری کیا گیا جس میں زرتشتی مذہب کی دعوت تھی۔ اس فرمان کے پیش نظر آرمینیا اور گرجستان (وغیرہ) کے عیسائیوں کا ایک عام اجلاس ہوا جس میں طے ہوا کہ مراسلے کا جواب سختی سے دیا جائے۔ چنانچہ ایک مراسلہ یزدگرد کو بھیجا گیا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"ایک ایسا مذہب جس کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ بے سروپا ہے۔ چند بے عقل آدمیوں کے اوہام باطلہ کا نتیجہ ہے اور جس کی تفاصیل آپ کے جھوٹے اور مکار عالموں نے ہمیں پہنچائی ہیں، ہرگز اس قابل نہیں کہ انہیں سنا یا پڑھا جا سکے۔ ہم ہرگز آپ لوگوں کی طرح

عناصر، سورج، چاند، اور آگ کی پرستش نہیں کرتے اور زمین
و آسمان پر آپ کے جتنے معبود ہیں، ہم ان میں سے کسی کو نہیں
مانتے، بلکہ خدائے واحد و برحق کی عبادت کرتے ہیں جو زمین اور
آسمان اور ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے جو ان کے اندر
ہیں " تاریخ ایران ص ۴۲۲ - ۴۲۵

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت بھی کر دی جائے کہ آرمینیا کے عیسائی جنہوں نے شاہ ایران یزدگرد کی دعوت کے جواب میں مراسلہ لکھا تھا وہ افغان قوم کے اکابر تھے اور بنی اسرائیل کے ایک اسیر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں وہی مصنف اسی کتاب میں بحوالہ ایک مشہور ایرانی مورخ حسن پیرینا، ان الفاظ میں حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"آرمینیا قدیمی روایات اور داستانوں کی رو سے کبھی دنیا کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ چار بڑے دریا دجلہ، فرات، آرس، اور کر بہتے تھے۔ اور طوفانِ نوح کے بعد یہ ملک بنی نوعِ انسان کا گہوارۂ دوم سمجھا جاتا تھا... پھر وہ وقت بھی آیا کہ اشوریوں نے آرمینیا کو اپنی سلطنت کا جز بنا لیا۔ پھر بابل کے حکمرانوں نے اُسے فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ قدیم تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو اُس وقت آرمینیا کے بادشاہ ہائک دوئم نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس مہم میں جو یہودی اسیر کر کے آرمینیا لائے گئے اُن میں شامبات نامی ایک یہودی کا بھی کنبہ (یعنی قبیلہ) تھا۔ شامبات کے بیٹے کا نام "باگارات" تھا اہل آرمینیا لکھتے ہیں کہ اُس کنبے کے افراد بہت دانش مند تھے

اس لئے انہوں نے بڑے بڑے رتبے حاصل کئے۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ یہی لوگ آرمینیا اور گرجستان (غرجستان) کے بادشاہ بنے۔" (تاریخ ایران جلد اول صفحہ ۲۴۷ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور)۔

ایک مزید ثبوت

سرفراز خان عقاب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:-

"متعدد مورخین مثلاً کلپروٹ، کروسکی، جیکویر اور رینگز کا بیان ہے کہ افغان قوم درحقیقت آرمینیوں کی ایک شاخ ہے، جو پہلے شروان میں رہتی تھی۔ آرمینیا کے لوگ کہتے ہیں کہ افغان ہم سے نکلے ہیں، کیونکہ البانیہ کے لوگ اوغان کہلاتے تھے۔ یہ اوغان آرمینیا سے ہندوستان کی طرف گئے تھے[1] اور وہاں عیسائیت کی جگہ مذہب اسلام قبول کیا اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ افغان حدود ایران میں لوٹ کھسوٹ کرنے کی پاداش میں شاہ ایران نے ان کو وہاں سے منتقل کر کے مشرقی خراسان (یعنی موجودہ افغانستان اور اس کے اطراف) کو نکال بھیجا تھا۔"
(تاریخ خٹک)

میری رائے کے مطابق کلپروٹ وغیرہ کا بیان قابل اعتماد ہے۔ اس لئے کہ وہاں پہ جن مقامات میں افغان رہتے تھے وہ مقامات ذیل کے ناموں سے شمالی ایران میں موجود تھے جن کے نام یہ تھے۔ شروان۔ میمون۔ میانج۔ زمن جان۔ برلیس۔ موش اور روان۔ اُورمیہ۔ دریائے صافی۔ مراغہ۔ کندسروان۔ سوران اور لودگان

---

[1] اس زمانہ میں ہندوستان کی حدیں مغرب میں لمغان، کابل، بامیان اور قندھار تک تھیں جس کی راجدھانی وے ہندیا لاہور تھی۔

وغیرہ (بحوالہ جغرافیہ خلافتِ مشرقی) ۔ یہ سب علاقے اب بھی شمالی ایران میں موجود ہیں اور انہی ناموں سے معروف ہیں۔ ابتداء میں یہ مقامات اُن افغان قبائل کے مسکن رہے ہیں جو بخت نصر کے ہاتھوں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ اور اِس وقت بھی ان ہی ناموں سے یہ قبائل مُلکِ افغان میں موجود ہیں جن کے قبائلی نام علی الترتیب یہ ہیں ۔ قبیلہ شروانی یا شیرانی ۔ ماموں یا میموں ۔ میانہ ۔ زمن ۔ بڑلیس ۔ موستوانی ۔ اُورمڑ ۔ صافی ۔ خشی قبائل اور غور یا خیل ۔ سروانی ۔ سورانی اور لودی وغیرہ ۔

انگریز محقق لکھتا ہے کہ :۔ "اسرائیل قبائل بہت ہی سرگردانی کے بعد افغانستان کی سرزمین پر دکھائی دینے لگے تھے"۔ (ٹریوسکن بحوالہ یوسفی) ۔

اور یہ قبائل ابتداء ہی سے ملتِ ابراہیمی پر قائم اور مسلمان تھے ۔ اور اسوقت بھی وہی حالت ہے ۔

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (البقرہ آیت ۱۳۵)

ترجمہ :۔ اور پیروی کرو ملتِ ابراہیمؑ کی جو حنیف تھا ۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا (الحج آیت ۷۸)

اس نے تمہارا نام پہلے ہی سے مسلمان رکھا ہے اور اس قرآن میں بھی تمہارے لیے یہی نام پسند کیا گیا)

اور قرآن میں یہ بھی ذکر ہے کہ :۔ " اور اہل کتاب میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق پر قائم ہے ۔ وہ رات کے حصوں میں اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں ۔ اور برابر سجدہ کرتے ہیں ـــــ (سورۃ آل عمران ۱۱۳)

اسمہٗ احمد

افغانوں نے اپنے اس عقیدۂ وحدانیت اور مسلمانی کو برقرار رکھا اور حتیٰ کہ حضرت محمدؐ نبی آخرزمان مبعوث ہوئے اور انہوں نے آپؐ پر ایمان لاکر اپنے عقیدۂ وحدانیت اور سابقہ اسلام کی از سرِ نو تجدید کرلی ۔ صاحب اعلام القرآن کی تحقیق کیمطابق حضرت محمدؐ کی پیدائش ملکِ عرب میں بمقام مکہ

معظمہ ماہ اپریل ۵۷۱ء میں اور وفات مدینہ منورہ میں بتاریخ ۸ جون ۶۳۲ء کو واقع ہوئی "

نسب

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نسب کے لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اور بنو ہاجرہ سے تھے بنی اسمٰعیل اور پھر اس میں قیداری اور بنو قریش سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ مختصر تفصیل بمطابق "ارض القرآن" یہ ہے :

ہاجرہ :- اصل میں عبرانی لفظ "ہاغار" ہے جس کے معنی بے گانہ اور اجنبی کے ہیں۔ اصل میں ان کا وطن مصر تھا، حضرت ابراہیمؑ اور سارا جب مصر گئے تھے تو فرعون (یعنی بادشاہ مصر) نے دیگر انعام و اکرام کے ساتھ یہ لڑکی بھی ان کے ساتھ کر دی تھی، اسی ہاجرہ سے اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے تھے اس وقت مصر میں حکمران قوت ایک سامی قوم تھی۔ جس سے حضرت ابراہیمؑ کے نہایت قریبی نسبی تعلقات تھے۔ لفظ "ہاجرہ" کا عبرانی ہونا بھی اس دعوے کی ایک مستحکم دلیل ہے۔ اس بنا پر فرعون (یعنی بادشاہِ مصر) کا ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں دینا خود اس بات کی قوی شہادت ہے کہ درحقیقت ازدواج سے نسبی تعلق کا استحکام مقصود تھا۔ اس تاریخی قیاس کی یہودی روایات سے کماحقہٗ تصدیق ہوتی ہے۔ سفرِ الیشار میں جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے۔ مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت ابراہیمؑ کا ہموطن تھا۔ ربی شلورم توراۃ کا مفسر، تکوین کی تفسیر میں لکھتا ہے :-

"ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھی۔ فرعون نے جب سارا کی کرامات دیکھی تو کہا کہ اُس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا دوسرے کے گھر میں بی بی بن کر رہنے سے بہتر ہے"۔ (ارض القرآن جلد دوم ص ۴۰)

اس سے آگے صاحب "ارض القرآن" لکھتے ہیں :

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ سارا کی خدمت گزار تھی اور یہ خود ہماری حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے ، اسمٰعیل عبرانی میں "شماع ایل" ہے ۔ شماع (سماع) سُننا اور ایل اللہ ، لفظی معنی خدا کا سُننا ، خدا نے چونکہ ابراہیمؑ کی دعا اور ہاجرہ کی فریاد سُنی تھی اس لیے اس نومولود کا نام شماعیل پڑا ۔ قیدار حضرت اسمٰعیل کا بیٹا تھا شہرت اور اعزاز میں اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ ممتاز تھا ۔ لفظ "قیدار" کے عبرانی میں معنی مایوسی اور غم کے ہیں ۔ عربی میں لفظ کدر و کدورت ہے (جو عبرانی لفظ قیدار کا معرب ہے) شاید حضرت اسمٰعیلؑ نے یہ نام باپ سے جدائی اور صحرا نوردی کے غم کی یادگار میں رکھا ہو ۔ قیدار بر بنائے روایاتِ توراۃ حجاز میں پیدا ہوا تھا ۔ قریشِ مکہ قیداری تھے فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان اولادِ قیدار سے تھا ۔ فہر کا لقب قریش تھا اس بنا پر اس کی نسل نے "قریش" اپنا خاندانی عَلَم قرار دیا ۔" (ارض القرآن حصہ دوم ص ۴۰)

رسول اللہ کا اسم مبارک محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر (یا قریش) بن مالک تھا ۔

ملکِ عرب :

عرب عبرانی لفظ "عربا" سے معرّب ہے عبرانی میں "عربا" بیابان اور میدان کو کہتے ہیں ، اور خود عربی زبان میں اس مفہوم قدیم کے بقایا موجود ہیں ۔ عرابہ کے معنی بدویت کے ہیں اور اعراب اہل بادیہ اور صحرانشینوں کے لیے اب بھی مستعمل ہے ۔ چونکہ عرب کا ملک ایک بیابان بے آب و گیاہ ہے اور خصوصاً ملک کا وہ حصہ جو حجاز سے بادیۂ عرب ، شام اور سینا تک پھیلا ہوا ہے ۔ اس لیے اس کا نام عبرانیوں کے ہاں "عربا" قرار پایا اور پھر رفتہ رفتہ وہاں کے باشندوں

کو عرب کہنے لگے۔ عرب کا ملک حدودِ طبعی کے لحاظ سے ایک جزیرہ نما ہے، لیکن اہلِ عرب اس کو ہمیشہ جزیرۃ العرب کہتے ہیں۔ یہ ملک وسعت کے باوجود زیادہ تر غیر آباد، خشک، شور اور ریگستان ہے۔ تمام ملک میں پہاڑوں کا جال ہے، جا بجا بے آب و گیاہ صحرا ہیں۔ حیوانات کے لحاظ سے عرب بہترین ملک ہے، عرب کے گھوڑے خوبصورتی اور تیز رفتاری میں دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اونٹ عرب کا خاص جانور اور عربوں کی زندگی کا حقیقی رفیق ہے۔

حجاز:

یہ بحرِ قلزم کے ساحل پر ایک مستطیل صوبہ ہے، جس کا نام توراۃ میں "فاران" بتایا گیا ہے اور جہاں سے حضرت محمدؐ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ مکہ یا بکہ جس کا تیسرا نام اُمّ القریٰ ہے، حجاز کا دارالحکومت ہے، یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبر ابراہیمؑ کا بنا کردہ، ایک نوجوان پیغمبر اسمٰعیلؑ کی ہجرت گاہ اور ایک یتیم پیغمبر محمدؐ کا مولد ہے۔

چند مماثلات:

یہودی مذہب اور اسلامی تعلیمات میں آج بھی متعدد قریبی مماثلات پائی جاتی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جو خدائی احکام اپنی قوم تک پہنچائے، وہ دس احکام خداوندی کہلاتے ہیں اور یہی توراۃ کا زبانی قانون کہا جاتا ہے۔ وہ دس احکام یہ ہیں:

(۱) یہواہ (اللہ) کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے، (۲) کسی قسم کے بتوں اور شکلوں کی پوجا مت کرو، (۳) یہواہ کا نام بے معنی اور بلا کسی مقصد کے مت لو، (۴) سنیچر کے دن آرام کرو اور اس دن کو مقدس جانو، (۵) اپنے ماں باپ کی عزت اور احترام کرو، (۶) کبھی قتل کے مُرتکب مت ہو، (۷) کبھی چوری نہ کرو، (۸) کبھی زنا نہ کرو، (۹) نہ جھوٹی قسم کھاؤ اور نہ جھوٹی گواہی دو، (۱۰) نہ دوسرے لوگوں سے حسد کرو اور نہ اُس کا لالچ کرو جو وہ رکھتے ہیں۔" (عہد قدیم ص۵۳۱)

"بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ عاشورہ عبرانی لفظ "عاشور" سے معرب ہے جو یہودیوں کے ماہ تشرین، یعنی یہودی سال کے پہلے مہینے کی دسویں تاریخ ہے جس دن کپور کا روزہ ہوتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس روزے کی تاریخ کا عربی مہینوں سے انطباق کیا گیا اور پہلے عربی مہینے کی دسویں تاریخ اس کے لئے مقرر کی گئی۔ اور جس طرح کہ یہودیوں کے پہلے مہینے کی دسویں تاریخ مقرر تھی۔ رسول اللہ نے ہجرت کے پہلے سال میں اسی تاریخ یعنی دس محرم کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور رمضان میں روزے مقرر ہوئے"

طبری لکھتے ہیں:۔

"مدینہ آ کر رسول کریم ؐ نے یہودیوں کو یوم عاشورہ میں روزہ رکھتے ہوئے دیکھا ان سے اس کی وجہ پوچھی، انہوں نے کہا کہ اس دن اللہ نے آل فرعون کو غرق کیا اور موسیٰ ؑ اور ان کے ساتھیوں کو فرعون سے نجات دی۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہم ان سے زیادہ موسیٰ ؑ کے حقدار ہیں، آپ نے روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی اس روز روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ جب اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے تو پھر حضور ؐ نے عاشورہ کے روزے کا نہ حکم دیا اور نہ اس سے منع فرمایا"۔

(طبری حصہ اول ص ۱۵۸)

یہی طریقہ نماز کا بھی رہا ہے۔ پہلے وقتوں میں مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے مگر بعد میں مسجد حرام یعنی مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم صادر ہوا۔ اسی طرح لڑکوں کا ختنہ، ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا، اور قربانی وغیرہ بھی ایسے رسوم ہیں جو ایک دوسرے سے قریب ہیں۔

ایک قوم کی سرگزشت

پٹھانوں کی تاریخ کے بارے میں حقائق کو صدیوں سے اس درجہ مسخ کرکے پیش کیا جاتا رہا ہے اور اس کے گرد غلط فہمیوں کے اتنے جالے بن دیئے گئے ہیں کہ وضاحتوں کے بعد وضاحتوں سے بھی تاریخ کا صحیح چہرہ پہنچانا نہیں جاتا۔ اس صورت حال کے بارے میں ابن خلدون کے بیان کردہ ایک واقعہ کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔ اگر یہ واقعہ اپنے اندر کوئی تاریخی صداقت نہ رکھتا ہو تب بھی فکر و بصیرت کا سروسامان اس میں موجود ہے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ :۔

"ایک وزیر پر جب بادشاہ کا عتاب ہوا تو اُس کو قید خانہ میں بند کر دیا گیا اور برسوں وہاں رہا۔ اس کا ایک لڑکا پیدا ہوا، اس نے بھی وہاں ماں باپ کے ساتھ پرورش پائی۔ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو ایک روز باپ سے پوچھنے لگا کہ یہ گوشت جو ہم کھا رہے ہیں کس چیز کا ہے۔ باپ نے کہا بکرے کا۔ بیٹا بولا، بکرا کیسا ہوتا ہے۔ باپ نے اس کا پورا حلیہ بیان کیا۔ لڑکے نے کہا، ابا جان کیا وہ چوہے کے مانند ہوتا ہے۔ باپ نے کہا سبحان اللہ کہاں بکرا کہاں چوہا۔ اسی طرح گائے اور بھینس کے گوشت کے بارے میں گفتگو چلی۔ وجہ یہ تھی کہ وزیر کے لڑکے نے قید خانے میں زندگی گزارنے کے سبب سوائے چوہے کے اور کوئی جانور دیکھا ہی نہ تھا اس لئے وہ ہر جانور کو چوہے

کی نسل سے جانتا تھا۔"

پٹھانوں کی تاریخ کے ساتھ بھی مورخین نے کچھ اسی قسم کا سلوک کیا ہے۔
شیخ سعدی نے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

بس نامور بہ زیر زمین دفن کردہ اند
کز ہستیش بہ روئے زمیں بہ نشان نماند

(دنیا میں ایسی نامور ہستیاں بھی پیدا ہوتی ہیں جن سے زمانہ مساعدت نہیں کرتا اس لئے وہ صفحہ دہر پر اپنا نشان چھوڑے بغیر فنا ہو جاتی ہیں)۔

اسی مضمون کو ایک پشتو شاعر نے بھی بیان کیا ہے لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کے شعر میں خیال کی بلندی، فکر کی گہرائی اور اسلوب کی دلکشی بہت بڑھ گئی ہے:۔

د بیر گلونہ را پیدا شی خو فنا شی نا لیدلی
خوشبوئی خپلہ تالہ کہری د صحرا پہ ہوا گانو

اس شعر کا مفہوم یہ ہے:۔
صحرا میں بہت سے پھول کھلتے ہیں اور اس سے پہلے کہ کوئی نگاہ ان کے نظارۂ جمال سے آشنا ہو یا وہ کسی مشامِ روح کو معطر کریں، یا وہ کسی حسین کے گلے کا ہار یا گیسوؤں کی زینت بنیں اپنی خوشبو کو صحرا میں بکھیر کر فنا ہو جاتے ہیں۔

الغرض جیسا کہ اس سے پہلے مقالے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ بنی اسرائیل یعنی افغان یا پختون دشمنوں سے تنگ ہو کر پہاڑوں میں آکر آباد ہو گئے تھے، ان کے متعلق روایت ہے کہ یہاں جب سرور کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث فرمانے کی اطلاع افغانوں

کو خبر پہنچی تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور قیس کی سرکردگی میں جو اس قبیلہ کے بزرگ ترین آدمیوں میں سے تھے، سربرآوردہ اشخاص کا ایک وفد دربارِ رسالت بھیجا گیا۔ اس وفد کے لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اور ان کی قوم کو دعا دی اور ہدایت فرمائی کہ وہ واپس جا کر اپنے قبیلہ میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ نیز قیس کا نام عبدالرشید رکھا۔ یہ لوگ خوشی خوشی واپس آئے اور اسلام کی تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔ رفتہ رفتہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ قیس نے ۴۰ھ میں ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ وصلی کے علاوہ اپنے پیچھے اصلی اولاد بھی چھوڑی لیکن سرافغان ان کا وارث ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

قیس عبدالرشید کا شجرہ نسب

قیس بن عیص بن سلول بن عتبہ بن نعیم بن مرہ بن جلندر بن اسکندر بن رمان بن عنین بن مہلول بن شلم بن صلاح بن قارود بن عثم بن فہلول بن کرم بن عمال بن خذیفہ بن منہال بن قیس بن علیم بن اشمول بن ہارون بن قمرود بن ابی بن صہیب بن طلل بن لوئی بن عامیل بن تارج بن ارزند بن مندول بن سلم بن "اب" (اسمِ تعریف) بن ارمیا بن سارول بن قیس بن عتبہ بن عیص بن روئیل (جس کا دوسرا نام زراح ہے) بن یہودا بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیم علیہم السلام بن تارخ جس کا دوسرا نام آذر ہے۔"

ممکن ہے کچھ نام درمیان میں بھول سے رہ گئے ہوں لیکن بہر صورت نسبی پہچان اور تعارف کے لئے اتنا ہی کافی سمجھنا چاہیئے۔

یہ لوگ چونکہ اہل کتاب تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر بھی ان کا ایک وفد یروشلم گیا تھا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے کے بعد

بعضوں نے اُن کی دعوت کو قبول بھی کر لیا تھا جس کی وجہ سے ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخرالزمان آئیں گے۔

چنانچہ وفد کے وہاں پہنچنے پر جب حقیقت ان پر واضح ہوگئی تو رفتہ رفتہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی اگر دیکھا جائے تو اُن کا مشرف بہ اسلام ہونا وقت کا تقاضا تھا۔ اس لئے کہ یہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے۔

مغرب کی طرف ساسانیوں کی حکومت تھی جو ان کے سخت دشمن تھے اور انہی کے ظلم وستم کی بدولت وہ ایران سے نکل کر یہاں پہاڑیوں میں رہنے پر مجبور ہوئے تھے۔ مشرق اور شمال کی طرف زابلستان، سیستان اور کابل تک تاتاری آرین مذہب اور نسل کے لوگ آباد تھے جن کی طاقتور حکومتیں قائم تھیں اور جنوب کی طرف مکران کا علاقہ تھا جس میں بلوچ قوم آباد تھی جو اگرچہ انکی دشمن نہ تھی بایں وجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی خبر سنتے ہی یہ اسلام کی طرف مائل ہوگئے اور ان میں ایک نئی زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ چونکہ وہ علاقہ جہاں یہ لوگ رہتے تھے۔ رکافی وسیع تھا۔ اسلئے یہ ضرور خیال کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کے اسلام قبول کرنے میں کافی وقت صرف ہوا ہوگا۔

حضرت عمرؓ کی خلافت کے دوران ابوموسیٰؓ نے خوزستان، فارس اور مکران پر حملے جاری رکھے اور جس وقت وہ سوس پہنچے تو اہل سوس قلعہ بند ہوگئے۔ ابوموسیٰ نے ان کا محاصرہ کیا جو کئی دن تک جاری رہا۔ جب اہل سوس کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہا تو انہوں نے امان چاہی اور ان کے مرزبان نے درخواست کی کہ ان میں سے ۸۰ آدمیوں کو امان دی جائے تو وہ شہر کا دروازہ کھول دے گا اور حکم تسلیم کرلے گا۔ ابوموسیٰؓ نے اس کی درخواست منظور کی

اس نے ۸۰ آدمی چن لئے مگر اپنے تئیں اُن میں شامل نہ کیا۔ جن لوگوں کو امان دی گئی وہ امان میں رہے۔ مرزبان کو قتل کر دیا گیا۔ ابوموسیٰ نے اُن کے قلعے میں ایک مقام دیکھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا پوچھا یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ دانیال نبی کی لاش ہے۔ حضرت دانیال کو بخت نصر بیت المقدس سے قیدیوں کے ہمراہ لایا تھا اور سوس میں معہ اہل خاندان کے نظر بند کر دیا تھا۔ انہوں نے یہیں وفات پائی اور تبرک کے طور پر ان کی لاش کو محفوظ رکھا گیا تھا۔ ابوموسیٰؓ نے یہ قصہ حضرت عمرؓ کو لکھا جواب آیا کہ کفن دو اور دفن کر دو۔

چنانچہ انہوں نے دانیال نبی کی میت کو دریائے کرخہ کے کنارے دفن کر دیا اور آگے بڑھ گئے۔ فارس فتح کیا اور کرمان کے آخر میں کوہ قفس پہنچ گئے یہاں ان کا مقابلہ ایرانی اور بلوچ قوم سے ہوا۔ کوہ قفس میں اُس وقت ختی افغان (پختون) قبائل آباد تھے۔ جنہوں نے ان کی اچھی طرح آؤ بھگت کی اور امداد کی اسلامی لشکر کے پاس راشن کی کمی تھی انہوں نے اونٹ اور بھیڑ بکریاں ذبح کرنے کے لئے پیش کیں۔ اسلامی لشکر کے سربراہ نے قیمت ادا کرنی چاہی اور اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کو لکھا کہ بخت (پخت) کے اونٹ ہمارے اونٹوں سے زیادہ موٹے ہیں ان کی قیمت کیا ادا کی جائے؟ جواب ملا کہ قیمت گوشت کے تناسب سے ادا کی جانی چاہیئے۔ چنانچہ اسی تناسب سے قیمت ادا کی گئی بخت سے مراد یہاں پخت (پختون) ہیں۔ تاریخ طبری (حصہ سوم خلافت راشدہ فتح کرمان) نے بھی یہ ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد اسلامی لشکروں کا کافروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہا جس میں یہ پختون ان کی امداد کرتے تھے۔ چنانچہ جب احنف بن قیس خراسان کے امیر مقرر ہوئے تو صغانیہ کے بادشاہ کے مقابلہ میں ان کے ساتھ

ایک ہزار افغانی اور چار ہزار عرب سپاہی تھے۔

جغرافیہ خلافت مشرقی نے تشریح کی ہے کہ جیرفت (کرمان) کے جنوب مشرق میں وہ کوہستانی علاقہ تھا جس کو جبل القفص کہتے تھے۔ چوتھی صدی ہجری میں اس کے بعید حصوں میں پہاڑی لوگ آباد تھے اور بلوص (بلوچ) کے قبیلے اس علاقے کی مشرقی سرحدوں پہ جسے بادیۂ ایران کا جنوبی حصہ سمجھنا چاہیئے آوارہ گرد رہتے تھے۔ اس دور افتادہ علاقہ کے ایک حصّے کو الخواش یعنی قبائل خواش (یا خاشی قبائل) کا وطن کہتے تھے۔ یہ قبیلے زیادہ تر شتربان تھے اور ایک ہی وادی میں رہتے تھے۔

یہاں گرمی کی وجہ سے نیشکر کی کاشت ہوتی تھی۔ جو سجستان اور خراسان کو دساور کی جاتی تھی یہ وادی اس پہاڑی ملک کا ایک ٹکڑا تھا جو بادیۂ ایران کے جنوبی سرے اور مکران کے درمیان تک گیا تھا اس پہاڑی ملک میں سات پہاڑ الگ الگ تھے۔ بیان ہوا ہے کہ ہر پہاڑ کا سردار جدا جدا تھا جو اس پہ حکمران تھا۔ ان پہاڑی لوگوں کے پاس اس زمانے میں گھوڑے نہ تھے عام طور پہ وہ کرد جیسے سمجھے جاتے تھے۔ کیونکہ وہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور مویشیوں کے مالک تھے۔ بالوں کے بُنے ہوئے خیموں میں رہتے تھے اور ان کے علاقہ میں شہر نہ تھے۔ اس پہاڑی علاقہ کے جنوبی حصّہ میں کھجور کے درخت خوب پھلتے پھولتے تھے۔ اسی علاقہ میں ایک اور شہر منوقان یا منوجان جو جیرفت سے پچاس میل جنوب میں واقع تھا اس شہر کے ایک حصّے کا نام کونین اور دوسرے کا نام زامان (زمن۔ زمند) تھا اور ایک قلعہ جو اب تک باقی ہے ان دونوں کے بیچ میں تھا۔ اور اسی قلعہ میں ایک مسجد تھی جو سیان کہلاتی تھی معلوم رہے کہ زامن۔ زمند ایک افغان قبیلہ ہے۔ جس کی یہاں رہائش تھی۔

جغرافیہ خلافت مشرقی کا مصنف آگے لکھتا ہے :۔

" جوئے سلیمان کا آباد و معمور شہر ریگان سے ایک مرحلہ مغرب میں واقع تھا۔ اس شہر کی زرخیز اراضی ایک ندی سے سیراب ہوتی تھی۔ جو شہر میں سے گزرتی تھی۔ شہر کے عین وسط میں ایک مسجد اور قلعہ تھا۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ یہ شہر جیرفت کے اعمال میں شامل تھا۔"

" ابن ہوکل ایک اور جگہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کرمان سے سجستان کے دارالحکومت زرنج کو جانے والی سڑک کے کنارے بالکل بیچ کی منزل پہ بادیہ ایران کا تنگ ترین حصہ ایک نخلستان تھا۔ یہاں ایک مختصر سی وادی ہے جس میں چشمے ہیں۔ ایرانی اسے نصرت آباد کہتے تھے۔ اور بلوچ اسے اسپی یا اسفی کہتے تھے۔ اس مقام کا ایک نام اسپینذ ابھی پڑھنے میں آیا ہے۔

یہ اسپی، اسفی اور اسپینذ ایک ہی نام ہے (یعنی اسیفزی) مقدسی نے اس مقام کو علاقہ سجستان میں شمار کیا ہے۔ ابن ہوکل نے مقام مذکورہ صوبہ کرمان کے متعلق بتایا ہے۔ اس علاقے میں بھی ایک شہر تھا اس کی آبادی بہت تھی اور یہاں قابل زراعت زمین بھی بہت تھی۔ جو نہروں (قنی) سے سیراب ہوتی تھی لیکن شہر کے گرد مکانات کے بالکل قریب تک صحرائے بے آب تھا۔"

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مؤلف " ہندوستان کا عہد وسطیٰ" لکھتے ہیں :۔

" ۶۴۴ عیسوی میں حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت عربوں نے پورا ایران، ہرات تک تسخیر کر لیا تھا اُس وقت مکران کے پہاڑی علاقوں میں افغان اور بلوچ آباد تھے۔ ان پہ بھی عربوں کا حملہ ہوا۔"

الغرض جب رفتہ رفتہ یہ لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تو ان میں نئی زندگی، نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا ہوا اور اسلامی لشکروں کے ساتھ وقتاً فوقتاً شمولیت سے اسے

اور بھی تقویت پہنچی۔ جس وقت محمد بن قاسم نے سندھ پہ حملہ کیا تھا۔ تو یہ لوگ کافی تعداد میں ان کے ساتھ تھے۔ اس سے اُن کو ملتان اور سندھ کے علاقے دیکھنے کا موقع ملا۔ جو ان کی صلاحیت اور بیداری کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی مالی حالت بھی سدھرتی گئی۔ جس سے اُن میں آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور انہوں نے اپنا اپنا سردار منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔ جن میں غور کی امارت بہ نسبت اوروں کے زیادہ مضبوط تھی۔ روایت ہے کہ اس دوران میں ان کو اپنے شجرہ ہائے نسب مرتب کر لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے اپنے قبائل کی تنظیم کی۔ انہوں نے اپنے آپ کو چار بڑے گروہوں میں تقسیم کیا۔ سڑابنی، غورغشتی، بتنی اور کرلانی۔ چار گروہوں میں تقسیم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اشوریوں نے دو جتھے سلطنت اسرائیلیہ اور یہودا کے لائے تھے۔ اور بابل والوں نے بھی دو جتھے لائے تھے لہٰذا اپنی تاریخ کے ان عظیم حادثات کو یاد رکھنے کے لئے انہوں نے گروہوں کی تقسیم بھی اسی انداز سے کی۔ شام اور اس کے اطراف سے جس طرح نکل کر یہ لوگ آئے تھے۔ اس سے ان کے چار گروہ یا قبیلے بن گئے۔ آگے چل کر ہر قبیلے کے نامور افراد کی نسبت سے ان کے خاندانوں نے شہرت پائی اور پھر مدت دراز کے بعد ان خاندانوں نے اپنے بزرگوں کے ناموں کی نسبت سے مستقل شکل اختیار کر لی جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ تنظیم نو کے تحت جب انہوں نے چار گروہ بنائے تو اس قومی وحدت، سیاسی نظم، فوجی قوت اور معاشی و اقتصادی خصوصیات کو برقرار رکھنے کے لئے قومی تاریخ کے جدید دور یعنی ظہور اسلام کے بعد کے اپنے اسلاف میں سے اپنا ایک مورث اعلیٰ اور مرکزی و قومی شخصیت کے تعین کا سوال زیر غور آیا۔

ایک ایسی قوم جو سینکڑوں سال سے جلاوطنی اور قید و بند کی زندگی گزار رہی

تھی۔ انتشار کی حالت میں مبتلا تھی اور در بدر کی ٹھوکریں کھا رہی تھی اُسے اپنے شجرہ ہائے نسب کے تحفظ کا کیا خیال آسکتا تھا لیکن جب وہ تاریخ کے نئے دور میں داخل ہوئے انہیں سنبھلنے کا موقع ملا اور اسلام کی بدولت ان کا انتشار تسبیح کے دانوں کی طرح وحدت فکری کے رشتہ سے منسلک ہوگیا تو انہیں فوراً اپنی معاشی، اقتصادی اور سیاسی حالت کی درستگی کے ساتھ اپنی تاریخ و نسب کے تحفظ کا خیال پیدا ہوا۔ یہ ان کا عظیم کارنامہ اور شدید قومی احساس کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی تنظیم نو کے تحت ایک نام پر اکٹھا ہونے پر آمادہ ہوئے۔ اس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔ ناآشنائی ختم ہوئی۔ محبت نے جنم لیا اور اپنی معاشی ترقی اور اقتصادی تحفظ کے لئے بیک آواز کمربستہ ہوگئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ لوگ خراسان اور وادی دریائے سندھ کے علاقوں میں جہاں سے بہت ہی کسمپرسی کی حالت میں نکل جانے پر مجبور کئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سرخرو کیا اور اسلام کی برکت اور یک جہتی کی بدولت انہوں نے وہ علاقے واپس لے لئے۔ ہندوؤں کو وہاں سے نکال کر قابض ہوئے اور سندھ، پنجاب و ہندوستان بلکہ بنگال و مدراس پر سینکڑوں سال حکومت کی۔ ان میں بڑے بڑے اولیاء، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے جنہوں نے تمام ہندوستان میں اسلام کو پھیلایا اور دین اسلام کی عظیم الشان خدمت انجام دیں۔ برصغیر کے طول و عرض میں ان کے سینکڑوں مزارات آج تک بلاتفریق ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری قوموں کے لئے زیارت گاہ اور مرکز عقیدت بنے ہوئے ہیں۔

پختونوں کی جدید تاریخ میں قیس عبدالرشید کی شخصیت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی بدولت، ان کی ہدایت سے، ان کی ترغیب سے سفر حجاز سے واپس آکر اسلام کی حقانیت اور بعثت نبوی کی تصدیق سے متاثر ہوکر پختون قوم دعوت

اسلام سے مشرف ہوئی تھی۔ اس لئے پختون قوم نے کافی غور وخوض کے بعد باہمی صلاح ومشورہ سے باہم متفق ہو کر قیس کو اپنا ایک قومی مورثِ اعلیٰ تسلیم کر لیا اور سب نے انہیں سے اپنے اپنے شجرہ ہائے نسب کو ملا لیا۔ اس سے اتفاق و مضبوطی پیدا ہوئی۔ اور آپ سے خاندانی عَلم قرار دیا۔

دوسری طرف مسلمانانِ عرب نے ہندوؤں، آریاؤں اور بدھ مت کے ماننے والوں کو جنگی چھیڑ چھاڑ سے کافی کمزور کر دیا تھا۔ وہ ان پر لشکر کشی کرتے اور فتح حاصل کر کے ان کو اپنا باجگزار بنا لیتے تھے۔ کچھ مدت بعد پھر بغاوت ہوتی اور وہ لشکر کشی کر کے پھر اُن پر فتح حاصل کر لیتے یہ سلسلہ جاری رہا۔ ادھر افغانوں کو اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ پہاڑوں سے نیچے اتر آئے اور مشرقی جانب توجہ کی اور میدانی علاقوں میں اپنی نوآبادیات قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ غوریوں کی ریاست مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ کچھ عرصہ بعد شیخ حمید لودی افغان جو لودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا برسر اقتدار آیا اور اُس نے ہندوؤں کا مقابلہ کیا۔ چنانچہ غیر افغانی مورخین فرشتہ اور ٹاڈ راجستان یہ حالات یوں بیان کرتے ہیں:۔

"حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن عامر کی سرکردگی میں ۳۱ھ میں کرمان کی طرف سے اور احنف بن قیس نے سیستان اور قوہستان وغیرہ اور نیشاپور پر قبضہ کیا۔ ان لوگوں (یعنی افغانوں) نے مسلمانوں سے موافقت کی۔ نیز ہرات، بادغیس، غور، غرجستان، مرو، طالقان اور بلخ بھی مسلمانوں کے تصرف میں آئے۔ اور قیس بن ہیشم خراسان میں اور احنف بن قیس مرو، طالقان اور نیشاپور میں اور خالد بن عبداللہ ہرات، غور اور غرجستان میں والی ہوئے۔ خالد بن عبداللہ معزولی کے بعد افغانوں کے ساتھ کوہ سلیمان میں متوطن ہوئے تھے اور اپنی بیٹی ایک معتبر

افغان کو جو مشرف بہ اسلام ہوا تھا کے نکاح میں دے دی تھی۔ القصہ قوم افغانان کا گروہ زراعت اور تحصیل فائدہ معاش میں مشغول ہوا۔ اور اسلام کے سبب انہیں امن و سکون نصیب ہوا سیاسی استحکام اور معاشی ترقی ہوئی۔ گائے، بیل، بکری، اونٹ اور گھوڑے وغیرہ ہر چیز بڑھ گئی اور جو اہل اسلام محمد بن قاسم کے ساتھ آکر ملتان میں متوطن ہو گئے تھے اُن سے روابط اور تعلقات کو مستحکم کیا اور جب اُن کی طاقت مزید بڑھ گئی اور قوم افغان کی اولاد بھی بکثرت ہو گئی تو انہوں نے ۱۴۳ھ میں قوہستان اور غرجستان وغیرہ کے علاقوں سے نکل کر ہندوؤں کے مقبوضات پر قبضہ و تصرف کا عزم کیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا بعد میں "لاہور" کے راجہ جے پال نے افغانوں پر لشکر کشی کی۔"

راجہ جے پال

چونکہ افغانوں کی تاریخ میں اس کی بڑی اہمیت ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "لاہور" کے راجہ جے پال کا چند لفظوں میں تعارف کرا دیا جائے۔ جے پال ہندوؤں کے برہمن خاندان سے تھا اس کے باپ کا نام است پال یا ست پال تھا اور بیٹے کا نام انند پال۔ سلطنت لاہور کو مشرق میں سرہند تک اور کشمیر سے ملتان تک اور شمال مغرب میں چترال اور لمغان سے کوہ سلیمان تک اپنے قبضہ و تصرف میں رکھتا تھا اور وہ اس مملکت کا خود مختار حکمران تھا بلکہ کابل اور قندھار بھی اس کے باجگزار اور زیر اثر تھے۔ اور بہت سے ہندو راجے اور راجے اس کے حکم بردار تھے۔ اس کا دارالحکومت لاہور تھا جو پشاور سے جانب مشرق چھپن (۵۶) میل کے فاصلہ پر دریائے سندھ سے جانب مغرب واقع تھا اور راجہ کے رہائشی محلات اور اس کی حفاظت کے واسطے چھوٹا سا ایک مضبوط قلعہ بھی دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر شہر "ہند" یا وے ہند، وہند، ہنڈ، انڈ) کے مقام پر تھا جو دریائے سندھ پر قلعہ اٹک سے سولہ

میل شمال کی طرف واقع تھا۔ اور قصبہ ہند سے جانب شمال مغرب قریب چار میل کے فاصلہ پر دار الحکومت شہر لاہور تھا۔ ان دونوں مقامات کے درمیان ایک بڑا شہر اَریانا آباد تھا۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے ایسے لگے ہوئے تھے کہ ایک ہی شہر دکھائی دیتا تھا۔ مقامات مذکورہ کے اب تک یہاں نہ صرف آثارِ قدیمہ موجود ہیں بلکہ یہ اِس وقت بھی سکونتی قصبے ہیں اور اب تک اُنہی پرانے ناموں سے موسوم ہیں۔ ان قصبوں میں قبیلہ ابا خیل منڈڑ یوسف زئی آباد ہیں۔

واضح رہے کہ اُس زمانے میں پنجاب کا لاہور نہیں تھا بلکہ اُس وقت پنجاب کا مرکزی مقام سیالکوٹ تھا۔ پنجاب کا موجودہ صدر مقام لاہور دریائے راوی کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں منڈکوہور یا کوہارو کے نام سے موسوم تھا۔ اس وقت اس مقام کی وہ اہمیت نہ تھی جو بعد میں ہوئی۔ یہ بھی معلوم رہے کہ یہاں گندھارا میں ہند اور لاہور جو درحقیقت ایک ہی شہر کے دو نام تھے، کے قرب وجوار میں کالنجر، کانگڑہ، نگرائی، (نگرکوٹ) بھڑوچ ٹانڈہ، جہابن، ڈیلور (ڈیلی) گوہاٹی، اجمیر، متھرا وغیرہ شہروں کے آثارِ قدیمہ انہی ناموں سے معروف، اگرچہ ویران اب بھی موجود ہیں۔ لہٰذا جب بھی لاہور کا ذکر سامنے آئے تو احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

سلطان محمود غزنوی کے غلام خاص ایاز کی قبر ضلع مردان میں مواضعات نواں کلی تہ لاندی اور کالوخان کے درمیان صوابی مردان سڑک کے جنوبی کنارے پر ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے اور یہ مقام لاہور سے پندرہ میل شمال کی طرف ہے۔ ایاز کی قبر عوام میں مشہور ہونے کے علاوہ ایک قلمی نسخہ میں جو اس زمانے کے ایک ایسے شخص کا لکھا ہوا ہے کہ جو خود اس موقع پر موجود تھا سلطان غزنوی اور جے پال کی جنگوں کا ذکر بالتفصیل موجود ہے۔ لکھا ہے کہ جنگ بھڑوچ سدوم

(ضلع مردان) میں فتح پانے کے بعد سلطان نے وہاں مرکز بنایا جہاں ایاز کی قبر ہے اور ایاز کو صوبہ دار بنا کر وہ غزنی واپس چلا گیا۔ پھر اس کے بیٹے مسعود نے بھی جب اپنے بیٹے مجدود کو لاہور میں چھوڑا تو ایاز کو اس کے ہمراہ بطور اتالیق مقرر کیا۔ ۹ ذوالحجہ ۴۳۳ھ کو مجدود نے وفات پائی اور اسی مہینے کے آخر میں ایاز بھی اپنی طبعی موت مرا اور ترلاندی کے شمال میں کچھ فاصلہ پر عام راستہ کے جنوبی کنارے اونچی جگہ دفن کیا گیا۔

یہ قلمی کتاب جناب عبدالقادر استاد کے پاس موجود تھی یہ شمس الدین ماسٹر کے بڑے بھائی اور موضع حمزہ کوٹ تپہ سدوم ضلع مردان علاقہ پشاور کے رہنے والے تھے۔ میں نے خود اپنی تسلی کے لئے حمزہ کوٹ جا کر عبدالقادر استاد سے ملاقات کی اور ہر قسم کا اطمینان اس بارے میں حاصل کیا۔ اس کے بعد میں نے یہ تمام حالات اللہ بخش یوسفی مرحوم کو بھیج دیئے تھے۔ جو انہوں نے اپنی تاریخ یوسف زئی افغان میں درج کئے۔

کچھ عرصہ بعد مجھے یوسفی صاحب مرحوم کا کراچی سے خط ملا جس میں کافی پریشانی کے ساتھ لکھا تھا کہ ایاز کی قبر تو لاہور (پنجاب) کے رنگ محل میں موجود ہے اور ایک پارٹی اس پر فلم بنا رہی ہے وغیرہ۔ میں نے انہیں ایک تسلی آمیز خط لکھا اور خود اپنے ایک دوست سردار خان ساکن موضع نطوفہ کو ساتھ لے کر لاہور روانہ ہوا۔ رنگ محل جا کر ایک خانقاہ میں مسجد اور اس کے صحن میں وہ قبر دیکھی اور اوپر دروازے پر کتبہ یوں لکھا ہوا تھا۔ "ملک ایاز غلام سلطان محمود غزنوی" اندر جا کر زیارت کی۔ باہر اسی خانقاہ کی چند دکانیں ہیں۔ انہیں میں سے دروازے سے شمال کی طرف عمر حیات صراف کی دوکان تھی۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ بھائی صاحب یہ کتبہ کیسا لکھا گیا ہے اور یہ قبر کس کی ہے؟ اس نے تعجب سے کہا

کہ جب تم نے کتبہ پڑھ لیا تو پوچھنے کی کیا بات ہے ؟ میں نے اس سے کہا کہ بھائی صاحب یہ کتبہ غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ سلطان محمود غزنوی اور ایاز کے وقت میں تو یہ لاہور پیدا ہی نہیں ہوا تھا اور انہوں نے تو اس لاہور کو دیکھا بھی نہیں تھا تو ایاز یہاں کیسے پہنچا اور اس کی قبر یہاں کیسے بنی تو وہ میری اس بات سے زیادہ برہم ہوا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اسی خانقاہ کی انجمن کا سیکریٹری (یعنی ناظم) ہے۔ میں اس کو نرم کرتا رہا اور سمجھاتا رہا کہ بھائی یہاں ملک ایاز ایک گورنر گزرا ہے جو آپ کے موجودہ گورنر امیر محمد خان جیسا زبردست اور سخت آدمی تھا۔ ملکہ رضیہ سلطانہ اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے ایک وفد ساتھ لے کر دہلی سے لاہور آئی تھی اور وہ بڑی منت سماجت سے راضی ہوا تھا اور رضیہ نے لاہور کے علاوہ ملتان کی گورنری بھی اس کے حوالہ کر دی تھی اور وہ ایک نیک و بزرگ شخص تھا۔ مختصراً یہ کہ میں نے ملک ایاز کی بہت تعریفیں کیں۔ بات راست آئی اور ہم کو دوکان میں بیٹھنے کے لئے کہا اور چاء منگوائی۔ پھر قصہ یوں شروع کیا میں تعجب سے سنتا رہا۔ بیان کیا کہ پاکستان بن جانے کے وقت فسادات کے دوران میں یہاں ہندوؤں کے اس اونچے مکان کو گرایا گیا جو جنوب کو واقع تھا تو اس کے ملبہ سے اصل کتبہ گر کر ٹوٹ گیا جس پر صرف "ملک ایاز" لکھا ہوا تھا۔ سیکریٹری نے صاف اقرار کیا اور تسلیم کیا کہ اصل کتبہ میں "غلام ایاز سلطان محمود غزنوی" نہ تھا۔ بلکہ ہم نے جب دروازہ دوبارہ بنایا تو میں نے خود از سر نو کتبہ تیار کر کے اس پر اپنے خیال سے اس طرح لکھا کیونکہ میرے خیال میں صرف وہی ایاز تھا جو سلطان محمود غزنوی کا غلام تھا اور ملک ساتھ اس لئے لکھا کہ پہلے کتبہ میں یہ لفظ موجود تھا۔ واضح رہے کہ اسی خانقاہ میں مشرق کی طرف سے داخل ہوتے ہی دائیں طرف ہموار زمین میں

سنگ مرمر کا ایک پرانا کتبہ ایک اور قبر پر " متولی خانقاہ ملک ایاز " کے نام سے اب بھی موجود ہے ۔ نہ کہ غلام ایاز سلطان محمود غزنوی ۔

سیکریٹری صاحب سے میں نے التماس کی کہ یہ کتبہ نکال کر اصل کتبہ کے مطابق دوسرا لگا دیں ورنہ اس غلط کام سے ساری تاریخ غلط ہو جائے گی ۔ اُس نے کہا کہ تم ایک خط لکھ کر مجھے دیدو اور انجمن کے اراکین کا ایک اجلاس بلا کر اس غلطی کا ازالہ کر دیا جائے گا ۔ وہاں سے واپس آ کر یوسفی صاحب مرحوم کو کراچی خط روانہ کیا ۔ کچھ عرصہ بعد جب میں دوبارہ کسی کام سے لاہور گیا تو رنگ محل جا کر یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ قبر پہ وہی پرانا کتبہ بدستور لگا ہوا تھا ۔ میں نے عمر حیات سے ملاقات کی اس نے بتایا کہ حکومت پاکستان نے اس خانقاہ کو محکمہ اوقاف کے حوالہ کیا ہے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا اور یہ غلطی جو ہو چکی ہے اس پہ سخت افسوس ظاہر کیا ۔ مجھے بھی انتہائی افسوس ہوا اور وہاں سے اُٹھ کر محکمہ اوقاف کے دفتروں کی خاک چھانی مگر بے سود ۔ بلکہ ہمارا مذاق اڑایا گیا ۔ اس قسم کی غلطی سے بعض اوقات سمجھدار لوگ بھی گمراہ ہو جاتے ہیں ۔ اس ضمن میں مزید تفصیلی بحث بعد کے اوراق میں کی جا رہی ہے ۔

لاہور اور جے پال کے سلسلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کتاب الہند ابوریحان البیرونی کی تحریر جو انندپال کے خط کے بارے میں ہے نقل کر دی جائے ۔ نیز اس خاندان کا ضروری تعارف کرا دوں ۔ البیرونی لکھتا ہے کہ :-

" منجملہ اُن راجگان (کشن) کے ایک کنک (کنشک) جس کی طرف برشاور (پشاور) کی بہار یعنی بدھ مت کی خانقاہ منسوب ہے اور کنک چیت کہلاتی ہے ۔ اس سلسلے کا آخری راجہ لگتورمان

(ساکا) تھا۔ اس کے وزیر کی جو ایک کلر برہمن تھا زمانے نے موافقت کی اور اس کو اتفاقاً اتنے دفینے (خزانے) مل گئے جن سے اس کو بہت مدد ملی اور طاقتور ہو گیا۔ اس کے ساتھ دولت نے اس کے آقا سے منہ پھیرا اس لیے کہ زمانہ قدیم سے اس کے گھر میں (یہ تحریک) چلی آتی تھی۔ راجہ لگتورمان کے اخلاق و عادات بگڑ گئے اور وہ برے کام کرنے لگا۔ وزیر کے پاس اس کی بہت سی شکائتیں پہنچیں اور اس نے سزا کے لئے راجہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ پھر برہمن وزیر کو خود اپنی بادشاہت کا مزا ملا۔ اس کا ذریعہ یعنی مال اس کے پاس موجود تھا وہ ملک (وسلطنت) پر قابض ہو گیا۔

اس کے بعد برہمنوں نے بادشاہت کی (جن میں کلر کے بعد) پہلا راجہ سامند رتھا پھر کملو ہوا' اس کے بعد بھیم راجہ ہوا پھر (راست پال) اس کے بعد جے پال' اس کے بعد انند پال پھر (جے پال ثانی) اس کے بعد تروجن پال ہوا جو ۴۱۲ھ میں قتل کیا گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا بھیم پال بادشاہ ہوا۔ اس خاندان کا یہ آخری بادشاہ تھا۔ اور اس کے مرنے کے بعد ہند (وے ہند) اور لاہور یعنی ہندی لاہوری بادشاہت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اس خاندان میں کوئی آگ سلگانے والا بھی باقی نہ رہا اس خاندان کے لوگ وسعت ملک و دولت کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے شریفانہ اخلاق اور احسان وسلوک کرنے کے دلدادہ تھے۔ ہم کو انند پال کا خط سلطان محمود غزنوی کے نام اس وقت جب کہ دونوں کے تعلقات نہایت کشیدہ تھے بہت پسند آیا۔ اس نے محمود غزنوی کو لکھا تھا۔ کہ "ہم نے سنا ہے کہ ترکوں نے آپ کے مقابلے میں بغاوت

کی ہے اور خراسان میں پھیل گئے ہیں۔ اگر آپ منظور کریں تو پانچ ہزار سوار اور اس سے دوگنا (دس ہزار) پیادے اور ایک سو ہاتھی کے ساتھ ہم خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور اگر فرمایئے تو اپنے بیٹے کو اس سے دوگنا تعداد کے ساتھ روانہ کردیں ہماری اس پیشکش کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم آپ کو اس ذریعہ سے خوش کریں بلکہ بات یہ ہے کہ ہم آپ سے شکست کھا چکے اور یہ نہیں چاہتے کہ آپ پر ہمارے سوا دوسرا کوئی غالب آئے۔"

یہ تو تھا راجہ جے پال اور ان کے خاندان کا تعارف۔ اب پھر فرشتہ اور ٹاڈ کے شروع مضمون پر واپس آتا ہوں۔

الغرض راجہ جے پال کے ساتھ افغانوں کی جنگ و جدل اور مقابلوں نے کافی شدت اختیار کرلی اور اس چھیڑ خانی میں کافی عرصہ گزر گیا اور آخر میں افغانوں کی قیادت شیخ حمید نے سنبھالی۔

سخت مقابلے اور کئی لڑائیاں ہوئیں اور اسی طرح پانچ مہینے میں ستر لڑائیاں پشاور اور کرمان کے درمیان ہوئیں اور افغانوں کی مدد کے لئے دیگر مسلمان بھی آئے تھے۔ اور لاہور کے راجہ نے بھی کافی زور لگایا تھا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑوں کی گکھڑ قوم سے جو اس وقت کافر تھی راجہ لاہور کی مخالفت پیدا ہوگئی اور گکھڑ کافروں نے قرب وجوار اور پڑوس کے سبب سے افغانوں کی مخالفت چھوڑدی۔ راجہ نے افغانوں سے صلح کی اور چند علاقے افغانوں کے لئے چھوڑ دیئے۔ افغانوں نے کوہستان پشاور میں ایک حصار تیار کرکے خیبر نام رکھا تاکہ سامانیوں کے حملوں سے راستہ محفوظ رہے۔ افغان ولایت یعنی سلسلہ کوہ سلیمان پر مسلط ہوئے اور ولایت لاہور خیبر کے سبب

سے محفوظ رہا۔ راجہ جے پال نے بھاٹیہ (قوم بھٹی) کے راجہ سے جو جے پال کے ماتحت تھا، مشورہ کر کے یہ طے کیا۔ کہ شیخ حمید کی جو کہ افغانوں کے درمیان صاحب اقتدار شخص ہے امارت تسلیم کر لی جائے۔ چنانچہ شیخ حمید نے ولایت لمغان اور ملتان کے نظم و نسق کو اپنے ذمہ لے لیا۔ اور علاقہ ہائے مذکور میں اپنی طرف سے حاکم مقرر کئے۔ اس تاریخ سے افغانوں نے مسندِ امارت پر قدم رکھا اور صاحب جاہ و اقتدار ہوئے۔ کافی عرصہ گذرا خیبر سے مغرب کی طرف حکومت کی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ حکومت غزنی کی وراثت ساسانی الپتگین کو پہنچی۔ سبکتگین اس کا سپہ سالار تھا۔ اور اکثر اوقات لمغان و دیگر افغان مقبوضات پر تاخت لاکر لوگوں کو زیر کرتا تھا۔ اور تباہی مچا کر افغانوں کو تنگ کرتا تھا۔ جب الپتگین فوت ہوا اور سبکتگین اس کا قائم مقام ہوا اور شیخ حمید نے اختلاف میں صلاح و فلاح نہ دیکھی تو اس کو پیغام دیا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اسلام کی شرکت کے سبب سے نہایت یکجہتی ہے اور کافروں کے مقابلے میں یکجان ہونا بہتر ہے سبکتگین نے شیخ حمید کی تجویز کو پسند کرتے ہوئے منظور کیا اور جے پال کی شکست کے بعد بہت ہمدردی سے پیش آیا اور ملتان کی جاگیر شیخ حمید کے نام حسب سابق مقرر رکھی اور افغانوں کو بحال سابق رہنے دینے کا وعدہ کیا۔ افغانوں اور سبکتگین کے درمیان تعلقات معمول پر آئے اور اچھے رہے۔ شیخ حمید کے بعد اس کا لڑکا نصیر ملتان میں حکمران رہا اور نصیر کے بعد اس کا لڑکا ابوالفتح داؤد ملتان کا حکمران ہوا۔ اس دوران ملتان میں بکثرت افغان آباد ہوئے۔ سلطان محمود نے اپنے باپ سبکتگین کے خلاف عمل کیا اور افغانوں کے قبائل کو مقہور اور معزول کر کے ان میں سے سرکشوں (بہادروں) کو تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔"

نور احمد چشتی اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی میں لکھتے ہیں کہ :-

"سبکتگین اپنے آپ کو از نسل شاہان ایران بیان کر کے بادشاہ یزدجرد (جو ماہویہ سوری مرزبان مرو کے زمانہ میں ایک چکی میں قتل ہوا تھا) کو اپنا دادا کہا کرتا تھا۔ وہ اپنے پہلے ہی سن جلوس ۹۷۷ء عیسوی میں ہند پر چڑھ آیا۔ اس وقت لاہور میں راجہ جے پال حاکم تھا۔ افغانوں کے ساتھ سبکتگین کی خوب بن (یعنی اختلاف) آئی ہوئی تھی اس باعث سے ان کو علاقہ ہند میں آنے سے بہت مزاحمت ہوئی۔ اس کے بعد سبکتگین نے افغانوں کو کسی طرح راضی کیا اور اپنے ساتھ ملا کر ہند کے کئی قلعے فتح کئے اور لاہور اپنے قبضہ میں کر لیا اور ان سے بہت سا مال غنیمت لے کر اپنے ملک واپس چلا گیا" (تحقیقات چشتی ص ۱۴۴)

علامہ احسان اللہ عباسی اپنی تصنیف تاریخ اسلام میں لکھتے ہیں کہ :-

"کوئی برا مانے یا بھلا مؤلف کے نزدیک گو محمود (غزنوی) نے ہندوستان پر حملے بہت کئے اور غازی لقب پایا۔ مسلمانوں کے نزدیک اپنے کو موقر دکھایا۔ لیکن سمجھدار لوگوں نے اس وقت یہی رائے قائم کی تھی کہ نقدی طمع کے خیال سے یا حکمرانی کے شوق میں محمود کفرستان میں مارا مارا پھرتا ہے لیکن دین اسلام کو اس سے ترقی نہیں ہوتی اور نہ وہ مذہب کو ترقی دینے کے لئے کوئی کوشش کرتا۔ بعض مورخین نے اس کی مذہبی باتوں کو تقیہ یا حکمت عملی سے تعبیر کیا ہے۔ امام حسین کے خون کا بدلہ لینے کے پردہ میں جس طرح عراق میں لوگوں نے حکومتیں کیں اسی طرح محمود بھی مذہبی جہاد کے نام سے مسلمانوں کو اپنا جان نثار بنائے رہا۔ ورنہ اسلام پھیلانے سے اس کو کوئی غرض

نہ تھی ۔" (تاریخ اسلام ۔ الوقت پریس ۔ گورکھپور ۱۸۹۵ء ص ۳۸۱)

سلطان محمود کے زمانے میں افغانوں کی کارروائیاں تاریخ کے صفحوں پر زیادہ تر نمایاں ہونے لگی تھیں ۔ خلافت مشرقی کے مصنف لکھتے ہیں کہ :-

"گو اس سلطان کو ان لوگوں کے ساتھ خونریز لڑائیاں کرنے کے مواقعے پیش آتے رہے " تاہم یہ ان کی فوجی خدمات کی بہت قدر کرتا تھا ۔ چنانچہ ہندوستان کی فتوحات کا بڑا حصہ ان لوگوں (یعنی افغانوں) کی شجاعت و جوانمردی کے باعث اس کو نصیب ہوا تھا ۔"

شیخ حمید کے ابتدائی دور میں افغان قوم کو پہاڑوں سے نکل کر میدانی علاقے پر قبضہ کرنے کا موقع ہاتھ آیا ۔ لیکن محمود غزنوی کی مداخلت کے سبب اس کام میں رکاوٹ پیدا ہوگئی ۔ پھر غوریوں کے عہد میں انہیں پہاڑوں سے نکلنے کا دوبارہ موقع ملا اور وہ اپنے سامنے والے علاقے پر قابض ہوگئے ۔ خاشی قبائل اور غوریا خیل کوہ قفص سے اتر کر غوریا خیل، ارگنداب، ترنک، مقر اور قرہ پر قابض ہوگئے ۔ جو قندھار سے جنوب مغرب میں واقع تھے ۔ اور زمند قبائل علاقہ زمنداور پر قابض ہوگئے ۔ بعد میں یہ لوگ علاقہ پشین میں آباد ہوئے تھے ۔ لیکن بعد میں کابل کی طرف منتقل ہوئے ۔ خیخے یا خاشی قبائل دریائے نیشک پر جس کا نام بھی بعد میں دریائے خاشی ہوا، قابض ہوگئے ۔ یہ علاقہ بھی نیشکے کا علاقہ کہلاتا ہے اور اس کا صدر مقام گرٹکو یہ تھا ۔ شمال کی جانب گگیانی اور ترکانی قبائل اور جنوب کی طرف جہاں دونوں دریاؤں کا دوآبہ ہے اور علاقہ نیشک کے نام سے مشہور ہے اس پر یوسفزئی قابض ہوگئے ۔

کوہِ قفس کی تشریح یوں ہے کہ قفس کے معنی ہیں قید خانہ یا پنجرہ ۔ قید خانہ اس لئے تھا کہ یہ لوگ قید کی صورت میں دنیا سے الگ تھلگ سینکڑوں سال رہے

ادھر اُدھر جانا اُن کے لئے محال تھا۔ پنجرہ اس لئے کہ جس طرح پنجرہ میں کوئی پرندہ بند کر دیا جائے تو وہ موذی جانوروں سے بچ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جیسے جیسے وہ قید و بند میں رہے اس کے ساتھ ساتھ محفوظ بھی رہے۔

جغرافیہ خلافت مشرقی "خاش اور گرڑکویہ" کی تشریح یوں کرتا ہے۔

"دریائے خاشی علاقہ غور کے پہاڑوں سے نکل کر دریائے فرہ اور ہلمند کے بیچ سے گزرتا ہوا جھیل ذرہ میں گرتا ہے۔"

ابن حوقل نے اِس دریا کا نام نہر نیشک لکھا ہے۔ نیشک اس معمور مقام کا نام تھا جو زرنج کے بالکل مشرق میں واقع تھا۔ خواش اس علاقہ کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اور یہاں کی کھجوریں مشہور تھیں۔ وہ علاقہ جو دریائے خاشی کے کناروں سے ملا جلا گیا تھا۔ علاقہ نیشک کہلاتا تھا۔ نیشک کے علاقہ کا بڑا شہر گرڑکویہ تھا۔ یہ شہر زرنج سے شمال میں ایک منزل پر تھا۔ زرنج کے شمالی دروازے کا نام اسی شہر کے نام پر باب گرڑکویہ (یا گاڑکے) تھا اور یہ علاقہ بہت زرخیز تھا۔

لہ غوری سہری پختی	دہ یوسفزو وو کوم ملکونہ
ملک ئے نیشکے میینہ ئے گادکے	غوریاخیل کاتراوسہ پیغوہ رونہ
غوریا خیلہ! پیغور مہ کرہ!	تہ اُدخیبنے یئ سرہ وروزہ
خیبنے ستالہ لاسہ راغے	ھالئہ تہ زودوے پہ سرونہ

یہ وہی مقام اور علاقہ ہے جہاں سے یوسفزئی اور ان کے متعلقین کابل کی طرف چلے گئے تھے۔ افسوس کہ میں یہ تحقیق نہ کرسکا کہ یوسفزئی اور ان کے قریبی قبائل کے اجداد قفس کے پہاڑوں میں کب اور کہاں سے آئے تھے۔ کہاں سے میری مراد سرزمین ایران، ماوراء النہر (جیحون پار) خراسان، زابلستان اور وادی دریائے سندھ ہے۔ البتہ میرا یہ قیاس ہے اور زیادہ ان لوگوں کی روایت

بھی ہے کہ ان لوگوں نے بخت نصر کے ہاتھوں جلا وطنی کے بعد مراغہ میں جو شمالی ایران کے علاقہ آذربائیجان میں واقع تھا، منتقل ہو کر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور صدیاں گزاریں اور وہاں خوش بھی تھے لیکن عرصہ دراز کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا ہوگا کہ ان کو مجبوراً یہ علاقہ چھوڑنا پڑا ہوگا اور اپنے خویش و اقارب سمیت مشرق کی جانب کوچ کر کے دریائے سیحون کے جنوب میں فرغانہ کے نسیا زیریں میں مقیم ہو گئے ہوں گے۔ اور ان کے مسکن مراغہ کی نسبت سے یہاں ایک چھوٹا سا شہر مرغینان کے نام سے مشہور ہوا۔ یہی مراغہ کے لوگ یعنی مرغینان کے بارے میں جغرافیہ خلافت مشرقی لکھتا ہے :-

"صوبہ فرغانہ کا وہ حصہ جو دریائے سیحون کے جنوب میں تھا علاقہ نسیا یا نسائیہ کہلاتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ بلند تھا اور کچھ نیچا اور اس اس لحاظ سے ایک حصّہ کو نسائیہ بلند اور دوسرے کو نسائیہ پست کہتے تھے۔ نسائیہ بلند پہاڑیوں میں واقع تھا جس میں خوقند یا خواکند کا شہر تھا۔ اور نسائیہ پست میں مرغینان کا چھوٹا سا شہر تھا"

قیاس غالب ہے کہ ختی قبائل کے علاوہ بقایا کند اور زمند قبائل بھی شمالی ایران سے ادھر آنے والوں میں تھے۔ کاسی قبائل پہلے سے یہاں آباد تھے۔ لہٰذا یہ نووارد بھی اپنے ہم نسل لوگوں کے پاس جگہ بہ جگہ آباد ہوئے ہوں گے۔ واضح رہے کہ دونوں دریاؤں سیحون و جیحون جو اسرائیلی رکھے ہوئے نام ہیں، کے درمیانی علاقہ میں انہیں افغان قبائل کے ناموں سے پہاڑ، دریا، شہر اور دیہات موسوم ہوئے۔ مثلاً نہر کاسان، زامین (زمند) کا بڑا شہر، کاسی غر (کاشغر)، کش کا شہر، کسانیہ یا کشانی جو صوبہ سغد کا سب سے آباد شہر تھا۔ شاؤغر دریائے سیحون کے کنارے واقع تھا اور یہاں قریب متصل ایک مقام کا نام یسّی تھا۔ جو حضرت

داؤد کے والد بستی کے نام سے موسوم تھا۔ اور یہ مقام شاؤغر کے دامن میں واقع تھا۔ اور بستی شہر سے شمال میں ایک دن کی راہ پر سوران (یعنی سوری/سورانی خاندان) کا ایک بڑا شہر تھا۔ اور اس کے کچھ فاصلہ پر برکی شہر تھا جس میں قبیلہ اُزمڑ کی رہائش تھی۔ سیحون کے بائیں ہاتھ خجند سے ایک فرسخ جنوب کی طرف کند کی بستی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں غور یا خیل کی کسی شاخ کی سکونت تھی اور اس علاقہ میں تون نام کا ایک شہر بھی تھا۔ نیز شہر خاشت اور دریائے خراش وغیرہ بہت نشانات ایسے ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لوگ وہاں رہتے تھے آخر میں جب حالات خراب ہوئے ہوں گے تو ان لوگوں نے وہاں سے ترک سکونت کر کے جنوب کی طرف روانہ ہو کر جگہ بہ جگہ عارضی قیام بھی کیا ہو گا۔ اور عرصہ دراز کے بعد نیشاپور کے جنوب میں غرجستان، غور، پشت یا پخت، قہستان اور کوہِ قفس وغیرہ محفوظ پہاڑوں میں اپنی برادری کے لوگوں کے پاس پہنچے ہوں گے۔ واللہ اعلم کہ ان حالات میں ان پر کیا کیا گزر چکا ہو گا۔

الغرض جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ افغانوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ہندوؤں کو نکال کر دم لیں گے۔ اور اس مقصد کے لئے مدتوں تک ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ جاری رکھی کسی حد تک وہ اپنے اس منصوبے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ اس وقت ان کی قیادت شیخ حمید کے ہاتھ میں تھی۔ جو ایک بہادر قائد کے علاوہ مدبر رہنما بھی تھا۔

جن علاقوں پر وہ قابض ہوئے گرفت مضبوط رکھی۔ افغانوں کو قندھار کے علاقہ میں بسایا اور ان کی تنظیم کی۔ شیخ حمید کے بعد اس کے لڑکے نصیر کے وقت میں کوئی نئی فتوحات تو نہ ہو سکیں۔ البتہ اس نے اپنے باپ کے مقبوضات کو قائم رکھا۔ اس کے بعد نصیر کا لڑکا ابوالفتح داؤد ملتان میں حکمران رہا۔ اور

قندھار، غور وغیرہ پر امیر محمد سوری افغان حکمران تھا۔ اس کے دور حکومت میں سلطان محمود غزنوی نے سر اٹھایا اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے پہلے افغانوں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ جس کے نتیجے میں افغانوں کو ہندوؤں کے انخلا میں رکاوٹ پڑی اور اس میں کافی عرصہ گزرا۔ سلطان محمود نے خراسان کا تمام علاقہ فتح کیا۔ دریائے سندھ سے باجوڑ تک سب علاقہ اس کے قبضے میں تھا۔ مگر ہندو اپنی اپنی جگہ پر بطور اس کی رعایا کے مسلط رہے۔ اس وقت افغانوں کے مساکن کے بارے میں کتاب الہند البیرونی (جلد اول ترجمہ سید اصغر علی انجمن ترقی اردو ہند دہلی سنہ ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۷۰) میں درج ہے:۔

"ہندوستان کے پچھم (مغرب) کے پہاڑوں میں مختلف افغانی قبیلے رہتے ہیں۔ جن کا سلسلہ ملکِ سندھ کے قریب ختم ہوتا ہے۔"

محمد غوری کے دورِ حکومت میں افغانوں کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا۔ کہ ہندو جو اس وقت غور سے جانب مشرق ڈیرہ اسماعیل خان تک اور جانب شمال کل علاقہ خراسان، باجوڑ، دیر، سوات، وادی دریائے سند، گندھارا یعنی علاقہ پشاور، کوہاٹ، بنوں میں مسلط ہیں ان کو نکال کر ان کی جگہ افغانوں کو بسایا جائے۔ تاکہ پنجاب و ہندوستان پر پیش قدمی کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو اور کمک بآسانی پہنچ سکے۔ کیونکہ پہلے ہندوؤں نے بہرام غزنوی کی حمایت میں غوریوں سے بمقام غور و غزنی سخت مقابلہ کیا تھا اگرچہ سخت شکست کھائی تھی۔ ہندو یہ نہیں چاہتے تھے کہ غزنویوں کے بدلے افغانوں کی سیاسی حکومت قائم ہو جائے۔ کیونکہ اس میں ان کو نقصان تھا۔

چنانچہ اس ارادے کی تکمیل کے پیش نظر غوریوں نے [illegible] میں پشاور کے علاقہ پر مکمل طور پر مع لاہور شہر کے قبضہ کیا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔

غوری نے کئی جتھے اشنغر کے مقام پر جہاں ہندوؤں کا ایک پرانا قلعہ تھا، لیجا کر بسانے اور نو آبادیات قائم کرنے کا آغاز کیا اس افتتاح پر کافی خوشیاں منائی گئیں۔ چراغاں کیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگی گئیں کہ رب الکریم نے انہیں اپنا ملک واپس دیا۔ اس سلسلے میں تاریخ خانجہانی و مخزن افغانی میں یوں درج ہے :۔

"سلطان شہاب الدین (محمد غوری) این جماعت افغاناں را در کوہستان روہ وکوہ سلیمان و اشنغر وسواد و باجور از حدود کابل تا دریائے نیلاب (سندھ) از نواحی قندھار تا سرحد ملتان آباد ان ساخت۔ و روہ عبارت است از کوہ مخصوص کہ ابتدائے طول آں از سواد (سوات) و باجور تا قصبہ سیوی از توابع بکر (بھکر) وباعتبار عرض از حسن ابدال (مرگلہ) تا کابل، وقندھار در حدود ایں کوہ واقع است وکوہ سلیمان وکوہ اشنغر درمابین ایں کوہ است وشہری کہ درکوہستان بعد از درآمدن ایشاں آباداں کردہ شد اشنغر بود۔"

اور اس بارے میں تاریخ شیروانی نامہ کے مصنف عباس خان شیروانی لکھتے ہیں کہ :۔

"بارہویں صدی کے آخر میں غزنیوں کے جانشین سلطان شہاب الدین محمد غوری نے سیاسی وجوہ اور ملک کے مفاد کی بنا پر قندھار سے لے کر ملتان تک پٹھانوں کو بسایا۔"

یہاں سے محمد غوری نے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ اس پیش قدمی اور پشاور کے علاقہ پر قبضہ کے دوران ہندو اپنے اپنے مسکنوں سے نکل کر دریائے سندھ عبور کرتے گئے۔ اور اپنے مسکن اور بت وغیرہ جن کو وہ پوجتے تھے بطور یادگار وہیں چھوڑ گئے جو اب تک آثار قدیمہ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان آرین قبائل

میں ۷۵ قبیلے وہ تھے جو اپنے آپ کو راجپوت کہتے تھے۔ اور ۸۵ قبیلے اور تھے جو مختلف ناموں سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان کے کئی گاؤں اب بھی انہی ناموں سے موسوم ہیں مثلاً بھٹی کوٹ، سن بھٹی، متھرا، بلوگرام نوگرام ڈنڈی کوٹ گوہاٹی سنتاپور، است گرام، سونی گرام، کالنجر، اجمیر اور ڈیلی وغیرہ۔

افغانوں کا یہ منصوبہ نہایت کامیاب رہا اور محمد غوری کے زیر قیادت وہ پنجاب پر قابض ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان، بنگال اور آسام تک جا پہنچے۔

سلطان شہاب الدین غوری کے متعلق تاریخ واقعات ہند میں یوں درج ہے:۔

"اب تک کوئی بادشاہ تخت دہلی پر جم کر نہ بیٹھا تھا بلکہ صرف لاہور و ملتان غزنویوں کے تصرف میں رہا جب کبھی فوج شاہی آگے بڑھ آتی تھی ہندو لوگ روپیہ دے کر ٹال دیا کرتے تھے اور ہندو راجہ بدستور اپنی اپنی راجدھانی میں حکومت کرتے تھے۔ اور جس قدر کہ خاندان غزنی کی طاقت کم ہوتی جاتی تھی ہندو راجاؤں کی طاقت بڑھتی جاتی تھی۔ مگر اب ایک ایسا بلا کا جھونکا آیا کہ ہندوستانی راجاؤں کو ان کے تختوں سے اڑا لے گیا اور مسلمان بادشاہ دہلی پر مسلط ہوئے"۔ (ص ۵۲)

علامہ احسان اللہ عباسی لکھتے ہیں:۔

"خواجہ معین الدین اجمیری سنجری (وفات ۶۳۳ھ) کے ہند میں بس جانے اور مریدوں کے جابجا پھیل جانے کے بعد غوری نے ہندوستان پر حملہ کر کے پرتھی راج کو شکست دی ... ایک صورت یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ غوریوں نے جن کا ارادہ تمام ہندوستان فتح کرنے کا تھا خواجہ صاحب اور ان کے مریدین کو ہندوستان میں بطور ہراول دستہ روانہ کیا... خواجہ صاحب کے خلیفہ بختیار کاکی خواجہ صاحب کی حیات میں ہی دہلی

میں مقیم ہو چکے تھے۔" (تاریخ اسلام ص ۵۳۶)
واضح ہو کہ خواجہ معین الدین اجمیری اور بختیار کاکی نسلاً دونوں افغان ہیں۔ ایک قبیلہ سجر سے جسے سجکزی بھی کہتے ہیں اور دوسرا قبیلہ بختیار سے ہے جو شیرانی کی شاخ ہے۔ ان کے یہ قبیلے اب بھی افغانستان میں موجود ہیں۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی کے متعلق مولوی محمد حسن شعری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔
"شیخ احمد سرہندی کابلی الاصل تھا اور وہ کابل میں پیدا ہوا تھا" (زبدۃ الاخبار ص ۱۶۳)

غوریوں کی اصلیت

منہاج سراج جوزجانی نے اپنی تالیف طبقات ناصری میں جو اس نے ۶۵۸ھ میں لکھی ہے غوری خاندان کو ضحاک تازی کی نسل سے ظاہر کیا ہے چونکہ مؤلف کا خاندان غزنوی کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ اس لئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اس بیان کو سیاسی بنا پر غلط رنگ دے کر خاندان غزنوی کے انتقامی اثرات کے تحت غیر مصدقہ مواد جمع کر کے تاریخ کی غلط بنیاد ڈالی۔ اور چونکہ اس سے پہلے اس ضمن میں کوئی کتاب نہیں چھپی۔ جس سے صحیح حالات کا علم بعد کے مورخین کو ہوتا۔ لہٰذا افغان قوم کے مورخین تک نے اس پر کچھ غور نہیں کیا۔ منہاج سراج نے یہ حوالہ تاریخ مبارک شاہ کا دیا ہے تحقیق کرنے پر یحییٰ بن عبداللہ سرہندی سامنے آتا ہے۔ جس نے تاریخ مبارک شاہی لکھی ہے مگر اس میں ضحاک تازی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

عبدالحیٔ حبیبی نے طبقات ناصری پر حواشی قلم بند کئے ہیں۔ اس نے منہاج سراج جوزجانی کا تعارف جس رنگ میں کرایا ہے وہ قابل غور ہے۔ اس نے بہ تفصیل لکھا ہے کہ وہ کون تھا اور واضح کیا ہے کہ خاندان غزنوی کے ساتھ اس کے رشتہ داری کے تعلقات تھے۔ نیز حبیبی نے اس بات کی تردید کی ہے کہ غوری

ضحاک تازی کی نسل سے ہیں۔

معلوم رہے کہ افغانوں میں ساہاک، سہاک، صحاک، ضحاک نام بہت ہیں جو اضحاق، اسحاق کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ ابتدائی دور اسلام میں دنیائے عرب میں بھی ضحاک نام کے بہت آدمی گذرے ہیں۔ مثلاً ضحاک بن قیس الفہری، ضحاک بن علوان ضحاک بن سفیان، ضحاک بن قیس الشیبانی وغیرہ۔

ابوزہرہ مصری لکھتا ہے کہ:۔

"خراسان میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے وقت ایک شخص الضحاک بن مزاحم گزرا ہے۔ جو فقیہ اہل خراسان تھا"۔

فتوح البلدان میں بھی ان کے متعلق یوں لکھا ہے کہ۔

"ضحاک بن مزاحم صاحب تفسیر اُن مسلمانوں کے ساتھ تھے۔ جو سمرقند میں فاتح کی شکل میں داخل ہوئے"۔

افغانستان میں ایک قصبہ اب بھی ضحاک کے نام سے موجود ہے۔ اغلب ہے کہ یہ نام اُنہی کے نام سے منسوب ہو کیونکہ وہ خراسان کے رہنے والے تھے۔

افغان قوم نے ہمیشہ غوریوں کو افغان ہی سمجھا ہے اور غوری خود بھی اپنی نسل کو افغان ہی کہتے چلے آئے ہیں۔ جیسا کہ شیر شاہ نے اپنے آپ کو افغان ہی کہا ہے

ابن بطوطہ جس کی حیثیت ایک سیاح کی تھی اور دوسرے ملک کا باشندہ تھا۔ اس نے غوری خاندان والوں کے ساتھ ہرات میں کافی وقت گزارا۔ ان کے قاضیوں اور مشائخ سے تبادلہ خیال کیا۔ اپنے سفرنامہ جلد اول مؤلفہ ۷۴۷ھ میں لکھتا ہے کہ:۔

"یہ ایک ہی قبیلہ کے لوگ ہیں۔ جنہیں الغوریہ کہتے ہیں۔ اور یہ لوگ غور الشام کی طرف منسوب ہیں۔ اور ان کی اصل بھی اسی سے ہے"۔

معلوم رہے کہ شام کے علاقہ شرق اردن میں وادی غور ایک علاقہ ہے جہاں سے ابتداً یہ لوگ جو بنی اسرائیل کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ جلاوطن ہو کر آئے تھے۔ اور وہاں غوریا کے نام سے ایک اسرائیلی پیغمبر بھی گذرے ہیں۔ جن کی نسبت سے یہ وادی ہے۔

ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے حصہ اول کے ابتدائی حصہ میں انبیاء کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"یہوشع۔غوریا۔ اموص۔ اشعیا۔ اور یونس بن متی علیہم السلام بنی اسرائیل کے ایک وقت کے انبیاء تھے"۔

کتاب "پٹہ خزانہ" کے مولف تاریخ سوری کے حوالہ سے سلاطین غور کو سہاک کی اولاد سے بتاتے ہیں نہ کہ ضحاک تازی"

منہاج سراج مذکور نے سہاک سے ضحاک لکھ کر ایک افسانوی شخصیت ضحاک تازی سے ان کو منسلک کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے اور افغانوں کی تاریخی روایات اور حقیقت کے خلاف ہے۔ بلکہ ابن خلدون نے جو پانچ نام انبیاء علیہم السلام کے بیان کئے ہیں۔ ان میں ایک نبی کا نام "غوریا" ہے۔ لہذا سلاطین غور کے متعلق یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نسبت انہی غوریا کی طرف ہے۔ الغور کی وادی بھی غوریا نبی سے منسوب ہے اور غوری نسباً بھی ان ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن بطوطہ نے غوریا خاندان کے سلطان اور قاضیوں اور مشائخ سے سن کر اپنی کتاب میں یہ رائے قائم کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غوری نسل ضحاک سے نہیں بلکہ از نسل سہاک بادشاہ سے ہیں جو یعقوبؑ کی نسل سے تھا اور شامبات اسرائیلی کے خاندان سے آرمینیہ کا حکمران تھا۔

مصنف پٹہ خزانہ، تاریخ سوری کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:۔

"یہ (غوری) امراء عرصہ دراز سے علاقہ غور، باشتان اور بست"
میں آباد تھے۔ اور یہ لوگ "سور" نامی اس خاندان سے ہیں جو سہاک
کی نسل سے ہیں۔"

مصنف تاریخ پٹہ خزانہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس خاندان کی مادری زبان پشتو تھی اور اُن میں پشتو زبان کے شعراء بھی موجود تھے۔ اس نے اپنی تاریخ میں محمد سوری کے سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مرنے پر شیخ اسعد سوری کا ایک مرثیہ بھی درج کیا ہے۔ شیخ اسعد اس کا قریبی رشتہ دار تھا اور اس جنگ میں اس کے ساتھ شریک تھا۔ متذکرہ بالا مرثیہ تاریخ پٹہ خزانہ میں درج ہے۔ واضح رہے کہ یہ مرثیہ ایک ہزار سال پہلے کا ہے :-

" نه له غرجه بیاراځي کاروان دَمشکو
نه را درومي غورته بیا جو پي دَشار
دا په څه چه "محمد" ولاړله نړیه
په وېرنه ئې سُو غور ټول سوګوار
ته په ننګه وے ولاړ په ننګ کښې مړ سوے
هُم پرے ننګ دے په ننګ دے کاځان جار
که سوري دے په ننګ وېرکاندے وېر من سول
هُم به وياړي ستا په نوم ستا په هتبار
په جنت کښې دے وي تون زمونږ واکمنه
هُم په تا دے وي هدیه لورے دَغفار

گستاؤلی بان تمدن ہند میں لکھتے ہیں کہ :-

"خاندان غزنوی نے ۹۹۶ء سے ۱۱۸۶ء تک غزنی اور لاہور میں حکومت

کی، ۱۱۸۶ء میں شہاب الدین محمد غوری نے ان کی جگہ لی اور ایک افغانی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔"

کتاب آئینہ حقیقت نما میں درج ہے کہ:۔

"شنسب بن حریق جو علاقہ غور کا رئیس تھا، حضرت علی کے زمانہ میں مسلمان ہوا۔ اُس کی اولاد افاغنہ شنسبی کہلائی۔ انہیں میں لودی، سوری وغیرہ افغان شامل ہیں۔ محمد سوری اسی شنسب کی اولاد سے تھا اور اس کی چھٹی پشت میں سیف الدین محمد سوری پہلا غوری بادشاہ بنا جس کے بعد علاؤ الدین حسین جہان سوز اور شہاب الدین محمد غوری وغیرہ بادشاہ بنے۔"

تاریخ افغانستان (پشتو) کا مصنف احمد جان ص۸۰ پر غوری خاندان کے متعلق لکھتا ہے کہ:۔

"غوری خاندان کے شجرۂ نسب پر مونٹسٹوارٹ الفنسٹن، ڈی جنگسر، پروفیسر ڈارن اور دوسرے قابل ترین مورخین نے بحث کی ہے ان کی غالب اور مضبوط رائے یہی ہے کہ غوری خاندان کی اصل و نسل پختون ہی ہے۔"

یہی مورخ اسی کتاب میں ص۹۵ پر مزید لکھتا ہے کہ:۔

"چنگیز مغل کے مرنے کے بعد جس کی موت ۱۲۲۷ء میں واقع ہوئی، کچھ عرصہ بعد افغانوں کی ایک نئی سلطنت غزنی میں قائم ہوئی اور اس سلطنت کے حکمران بھی غوری خاندان والے تھے۔ اس کا پہلا بادشاہ شمس الدین غوری تھا اور اس کے بعد رکن الدین بادشاہ بنا اور اس کے بعد فخر الدین، لیکن یہ تینوں بادشاہ مغلوں کے زیر اثر تھے اور

ان کا چوتھا بادشاہ غیاث الدین غوری خود مختار بادشاہ بنا۔ اُس کے بعد سب بادشاہان یعنی شمس الدین، ملک حافظ معز الدین سلطان حسین، اور غیاث الدین غوری (ثانی) آزاد اور خود مختار بادشاہ تھے لیکن آخری بادشاہ سلطان غیاث الدین غوری کے زمانہ میں افغانستان کی آزادی اور بادشاہی دونوں بے موقع ختم ہوئیں۔ یعنی تیمور لنگ کے ہاتھوں ۱۳۸۴ء میں"

بحوالہ سالنامہ کابل ۱۳۱۵ھ ص ۳۶۶ ۔ اس مذکورہ غوری خاندان نے ۶۴۳ھ سے ۷۸۳ھ ہجری تک ہرات میں حکمرانی کی"۔

واضح رہے کہ ابن بطوطہ اسی غوری سلطنت کے زمانہ میں ان کے ہاں ہرات وغیرہ میں آیا تھا اور ان کی اصلیت اور نسب کے بارے میں اُس نے انہیں سے دریافت کیا تھا۔

محمد حسین فاروقی اپنی تصنیف احکم التاریخ میں محمد غوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"غور کے تند خو اور قوی ہیکل افغان بہادروں اور دلاوروں کی مدد سے غزنی کو فتح کر لیا"۔

اور آگے ص ۲۹۴ پر لکھتے ہیں :۔

"خلجی نام قوم افغان ہے"۔

عبد القادر بدایونی اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں :۔

"سلطان شہاب الدین محمد غوری کے سلسلہ امراء میں ایک اور شخص محمد بختیار غوری بھی تھا جو خلجی کے نام سے مشہور ہے؛ یہ شخص بلادِ غور کے اکابرین میں سے تھا وہ جملہ اوصاف حمیدہ کا مالک تھا۔

وہ سلطان محمد غوری کے دورِ حکومت میں قطب الدین ایبک کے ہمراہ ہندوستان میں رہا، جہاں سے اُسے اودھ کی مہم سونپی گئی، جس میں اس نے فتح حاصل کی اور بہار و منیر کی جانب بڑھا اور اُسے بھی مسخر کر لیا۔ یہ پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے بنگال پر چڑھائی کی اور ہندوؤں کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ ان فتوحات میں سلطان نے اُسے شاہی خلعت سے نوازا۔"

آئینِ اکبری میں اس کے متعلق یوں درج ہے کہ:

"محمد بختیار خلجی پہلا مسلمان حکمران تھا۔ جس نے بنگال پر چڑھائی کی اور ہندو راجہ بنگال کا تختہ الٹ دیا، لکھنوتی کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کے بعد سے ہی بنگال کی سرزمین دہلی کے مسلمان بادشاہوں کے تحت رہی۔"

الغرض تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ خاندان غوری خود افغانی النسل تھا، ہندوستان میں عہدِ مغلیہ سے پہلے کی اسلامی حکومت کو مورخین نے دورِ افغانیہ کے نام سے یاد کیا ہے کیونکہ ہندوستان کو افغانوں ہی نے فتح کیا اور افغانوں کی قوم ہی سلطنت اسلامیہ کی اصل طاقت تھی۔

ایک ضروری وضاحت:۔ بعض مورخین نے افغان مشائخ و علماء کے نسب کے بارے میں شکوک پیدا کیے ہیں، حالانکہ وہ نسلاً اور نسباً افغان تھے۔ مثال کے طور پر دو تین کا ذکر ضروری ہے۔

امام اعظم نسلاً افغان تھے:۔ ڈاکٹر ابوالفضل بخت روان (پشاور یونیورسٹی) لکھتے ہیں: "دمشق یونیورسٹی کے اکاڈیمی آف عربی زبان کے عضو ڈاکٹر شتوز مستشرق اپنے مقالہ "اللغۃ العربیہ فی افغانستان" میں رقم طراز ہیں کہ:

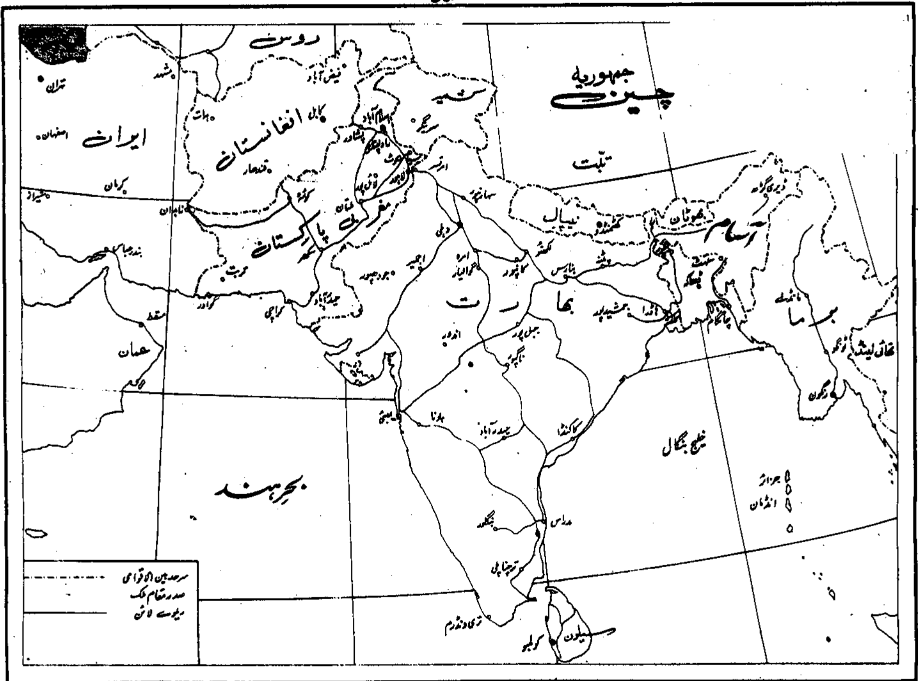
"ابوحنیفہ نعمان بن ثابت جو حنفی مذہب کے بانی ہیں، نسلاً افغان تھے اُن کے دادا کابل کی فتح کے وقت گرفتار کر کے کوفہ میں داخل کر دیے گئے۔"

(بحوالہ مجلۃ العلمی العربی، دمشق جلد ۳۰ جز ۳، جنوری ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۶۷)

ہے میری جرأت اصل اب بھی یہی
دل یہ کہتا ہے کہ دیکھیں تو سہی
جن میں اترا تھا ہمارا کارواں
اب بھی ممکن ہے کہ خالی ہو مکاں

اگرچہ

آسمان تہ لار د ختو نشتہ
خلمی ورنبیژی د ریښمو پہ تالونہ



امام ابوحنیفہ رح

امام اعظم ابوحنیفہ کے کارنامے سب جانتے ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت ان کی پیرو اور معتقد ہے۔ ان کے نسب کی بے شمار مورخین نے تحقیق کی ہے خصوصاً سید سلیمان ندوی۔ محمد ابوزہرہ مصری۔ علامہ شبلی نعمانی۔ رئیس احمد جعفری مشکوٰۃ شریف کے مرتب شیخ ولی الدین ابی عبداللہ اور نفحتہ العرب کے مصنف مولانا اعزاز علی وغیرہ۔

ان کا سن ولادت ۸۰ھ ہے اور اس پر جملہ مورخین و محققین کا اتفاق ہے۔ محمد ابوزہرہ لکھتے ہیں:

۱۔" امام اعظم کے والد ثابت بن زوطے فارسی تھے۔ اس بنا پر آپ نسباً فارسی ہیں۔ ان کے دادا کابل کے باشندہ تھے جو اس دیار کے مفتوح ہونے پر قید ہو کر آئے۔ اور بنی تیم بن ثعلبہ کے کسی خاندان کے غلام بن گئے۔ پھر آزاد ہو گئے مگر نسبت ولاء کے لحاظ سے تیمی کہلاتے رہے۔ یہ روایت امام اعظم کے پوتے عمر بن حماد بن حنیفہ نے کی ہے۔

۲۔ لیکن انہی عمر کے بھائی اسمٰعیل نے کہا ہے۔ کہ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہیں۔ وہ کہتے ہیں بخدا ہمارا خاندان کبھی غلام نہیں رہا۔

۳۔ مذکورہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ امام اعظم کا نسب نامہ بیان کرنے میں ان کے دونوں پوتے مختلف ہیں۔ اگرچہ یہ اختلاف ظاہری ہے۔

۴۔ عمر کے بیان کے مطابق ثابت کے والد کا نام زوطے ہے

اور اسمٰعیل کے قول کے مطابق نعمان ہے۔ عمرؔ اُن کے قید ہونے اور غلام ہونے پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں اور اسمٰعیل کلیتاً غلامی کی نفی کرتے ہیں۔

۵۔ ہمارے نزدیک ان ہر دو روایات کے مابین وجہ تطبیق یہ ہے کہ زوطے یا نعمان ان شہروں کے فتح ہونے کے بعد غلام بنائے گئے۔ مگر انہیں از راہ احسان رہا کیا گیا۔ جیسا کہ مسلمانوں نے بعض مفتوحہ علاقوں کے سربرآوردہ اشخاص کے حفظ ناموس نیز اسلامی سماحت کا ثبوت دینے اور ان کے قلوب کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی غرض سے اُس دور میں بار ہا کیا۔

۶۔ ثقہ اور محقق علماء کی روایات کے مطابق امام اعظم فارسی تھے۔ عرب یا بابلی نہیں تھے"۔

رئیس احمد جعفری کہتے ہیں:۔

۱۔" امام ابو حنیفہ کا فارسی الاصل ہونا اس قدر مشہور ہے کہ تمام ثقہ مورخین اس پر متفق ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ بابلی تھے۔ چنانچہ خطیب مولف تاریخ بغداد' لکھتے ہیں:۔ "امام ابو حنیفہ اہل بابل سے تھے" اور کبھی کہتے ہیں "بابلی کا قول یہ ہے"۔

۲۔ بعض متعصب احناف نے دعویٰ کیا ہے کہ امام عربی نژاد تھے۔ اور کہا ہے کہ زوطے بن یحییٰ بن زید بن اسد کی اولاد سے تھے اور بعض کا قول ہے کہ ارشد الانصاری کے بیٹے تھے۔ مگر یہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ یہ مشہور ہے۔ کہ امام اعظم فارسی نژاد تھے اور

شرفاء فارس کی طرف منسوب۔ ان کے جد اول بابل کے رہنے والے تھے۔ جیسا کہ ہم نے اس کتاب میں بیان کیا ہے۔

۳۔ امام صاحب کے والد کے مقام سکونت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے ترمذ بعض نے نسا اور بعض نے انبار لکھا ہے۔ مگر صحیح یہ ہے۔ کہ وہ ان سب مقامات پر رہائش پذیر رہے ہیں۔ آخر کار انبار (سرپل) میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

۴۔ اس بنا پر بعض مورخین نے امام ابوحنیفہ کا زاد بوم بھی انبار کو ہی قرار دیا ہے۔ لیکن علماء کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ امام کا مقام پیدائش کوفہ ہے اور یہی ان کے والد کی آخری رہائش گاہ تھی۔ امام کے والد کو حضرت علی کا شرف ملاقات حاصل تھا۔ اور حضرت علی نے ان کے لئے برکت کی دعا کی تھی۔"

سید سلیمان ندوی نے لکھا:۔

"امام صاحب کے جد زوطے بن ماہ بمقام انبار (سرپل) کابل کے علاقہ میں شاہ کابل کی لڑائی کے دوران گرفتار ہوئے۔ بنی تیم کے قبیلے کے ہاتھ آئے اور وہ ان کو کوفہ لے گئے اور وہیں ان کا مسکن رہا۔ وہاں ان کا بیٹا ثابت تولد ہوا اور ان سے امام ابوحنیفہ پیدا ہوئے۔ امام اعظم عجمی ہیں اور کابل کے علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔"

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:۔

"نعمان نام، ابوحنیفہ کنیت، امام اعظم لقب، شجرہ نسب یہ ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطے بن ماہ یہ امر جیسا کہ ناموں کی ترتیب سے ظاہر ہے۔ عموماً مسلّم ہے کہ امام اعظم عجمی النسل تھے۔ البتہ اس میں

اختلاف ہے۔ کہ کس نسل سے تھے۔ اور عرب میں کیوں کر آئے"۔
مشکوٰۃ شریف اور لفحتہ العرب دونوں کا بیان یہ ہے کہ امام اعظم اہل کابل سے تھے"۔
ایسی کئی اور تحریریں مختلف مورخین کی موجود ہیں۔ مگر طوالت کی خاطر انہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اور اپنی رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

امام اعظم ان سب اوصاف کے ساتھ کہ وہ بابلی، عجمی، فارسی، مرزبان، ایرانی اور کابلی تھے وہ افغان نژاد بھی تھے۔ جن کا نسبی تعلق قبیلہ غلزئی کی ذیلی شاخ ماہی خیل یا ماہلہ سے تھا۔ اور ان کے والد ثابت بن زوطے بن ماہ تھے۔ ایک صاحب نے امام صاحب کے جد اعلیٰ کا نام مرزبان لکھا ہے لیکن زوطے بھی اپنے قبیلے کا رئیس تھا۔ مرزبان نام نہیں بلکہ ایران میں رئیس کو کہتے تھے۔

ان کا فارسی الاصل ہونا اس لئے غلط ہے کہ جس جگہ یہ گرفتار ہوئے وہ علاقہ پارسیوں کا مقبوضہ علاقہ تھا۔ اور آخری وقت میں شاہ ایران یزدجرد بھاگ کر یہاں رہا حتیٰ کہ یہیں قتل ہوا۔ اس وجہ سے یہاں کے رہنے والوں کو وطن کی نسبت سے فارسی یا ایرانی کہا جانے لگا۔ جیسے ہندوستان میں کسی جگہ کا باشندہ بھی ہندوستانی کہلاتا ہے۔ اس کو نسب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاہم امام اعظم کے پوتے کا بیان کہ وہ فارسی الاصل تھے، اگر ان کا مطلب وطن سے نہیں نسب سے ہے تو وہ بھی درست ہے۔ کتاب مقدس باب گنتی میں ذکر ہے:۔

"یہوداہ کے بیٹوں میں سے عیرؔ اور اونانؔ تو ملک کنعان ہی میں مر گئے اور یہوداہ کے اور بیٹے جن سے ان کے خاندان چلے، یہ ہیں یعنی سیلا جس سے سیلانیوں کا خاندان چلا اور فارص سے فارصیوں کا خاندان چلا اور زارح جس سے زراحیوں کا خاندان چلا، فارص کے بیٹے یہ ہیں یعنی حصرون جس سے حصرونیوں کا خاندان چلا۔ یہ بنی

یہوداکے گھرانے میں ان میں سے چھہتر ہزار پانچ سو آدمی گنے گئے۔"

افغان قوم میں غلزئی قبیلہ ایک بڑا قبیلہ ہے۔ جس کی ذیلی شاخ ماہی خیل (ماہلہ) ہے قندھار سے ساٹھ ستر میل شمال کی طرف قلات غلزئی میں جو ایک بڑا شہر ہے اور اس کے گرد و نواح کے وسیع رقبے میں اب بھی ماہی خیل (ماہلہ) قبیلہ آباد ہے اور یہی ماہی (ماہلہ) امام کا مورث اعلیٰ ہے زوطے انبار میں گرفتار ہوا اس انبار کو اب سرپل کہتے ہیں۔ جو میمنہ (یعنی الیہودیہ) اور بلخ کے درمیان ہے امام کو بابلی اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ بابل کے پاس بھی ایک قصبہ تھا جس کا نام انبار تھا۔ اور جس وقت بخت نصر بنی اسرائیل کو قیدی بنا کر لایا تو اس نے انہیں وہاں آباد کیا تھا۔ وہاں سے جب یہ لوگ ادھر آئے تو وہ انبار نام ساتھ لے آئے تھے۔ اور یہاں کی اُس آبادی کا نام بھی رکھا۔ اس لئے اگر ان کے اجداد کو بابلی کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اُسی جگہ سے آئے تھے۔ اگر کابلی کہا جائے تو یہ بھی وطن کی نسبت سے صحیح ہے۔ کیونکہ وہ علاقہ کابل کا تھا۔ ہُمایا[ا] ماہ (ماہلہ) جو زوطے کا والد تھا۔ وہ بھی اصل میں ماہی ہے۔ اور افغان قوم اس کو حیٔ کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت ماہلہ سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ اب بھی اس نام کے افغانی قبیلے موجود ہیں۔ افغان قوم کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ نام کو بگھاڑتے ہیں۔ مثلاً ضابطہ خان سے زوطے۔ ثابت خان سے ثابتے وغیرہ اس لئے یہ نام بھی افغانوں ہی کے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کا شجرہ نسب

امام ابوحنیفہ کا شجرہ نسب" نعمان بن ثابت بن زوطے بن ماہ ہے۔ اسی لفظ" ماہ" سے ماہلہ، مالہ یا قبیلہ ماہی خیل (مٹی خیل) معرض وجود میں آیا جو قبیلہ غلزئی کی ایک شاخ ہے واضح رہے کہ اصل نام ماہ تھا اور یہ ایک ماہ تک اُس وقت رئیس قبیلہ کے لئے بولا جاتا تھا۔ لہذا یہ سابقہ نشانی لفظ لہ مخفف

[ا] ہُمابن ترکی بن سہاک بن ابراہیم غلزئی (تاریخ خان جہانی ومخزن افغانی)

ہے لویک یا لاویک سے یعنی ماہ لہ مخفف از ماہ لویک یا لاویک یعنی رئیس قبیلہ۔

امام اعظم کی سیرت و کردار کے تجزیے سے بھی ان کا افغان ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ اس بات کو سب مانتے ہیں کہ ان میں حد درجہ کی مضبوطی اور شجاعت تھی۔ اور اسی وجہ سے ان کو اپنی زندگی میں کافی زحمت اٹھانی پڑی۔ یہ صفت صرف افغان قوم ہی میں پائی جاتی ہے۔ ان کے کردار نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے محسوس کیا کہ یہ ضرور افغان نسل سے ہو سکتے ہیں۔ اسی بنا پر میں نے ان کے نسب کی تحقیق بڑی جانفشانی اور محنت سے کی۔

یہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ افغان قوم نے حتیٰ الوسع اپنی نسل کو چھپائے رکھا خدا جانے اس میں کیا مصلحت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظم نے بھی اپنا شجرہ ظاہر نہیں کیا۔ اس کی ایک اور مثال ایک افغان بزرگ شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل کی پیش کی جاتی ہے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ اسرائیلی لکھا کرتے تھے منتخب التواریخ میں ان کے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے۔ عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

"شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی۔ شیخ اسحاق کاکو (افغان) کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی زندگی مختلف کیفیتوں سے گزری۔ انہوں نے نہایت مفید اور بلند مرتبہ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیف "جواہر القرآن" پر ایک شرح بھی لکھی ہے۔

اکبر اعظم نے ان کو بلا کر گفتگو کی۔ اور ان سے پوچھا تم کس قوم کے ہو۔ انہوں نے برجستہ کہا۔ 'لکھنے والوں کی قوم سے'۔ یہ بے تکلفی بادشاہ کو بڑی پسند آئی اور رخصت کیا"[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

میں نے پہلی بار لاہور میں ان سے ملاقات کی تھی۔ کسی موضوع پر

ملتان کی بربادی ۔ لاہور کے آباد ہونے، سلاطین لنگاہ، خاص طور سے سلطان حسین کا قصہ انہوں نے اس دلچسپ انداز میں بیان کیا کہ میں ان کی فصاحت اور واقعات کے تجزیہ و تنقید سے حیران رہ گیا ۔ گفتگو کی یہ حلاوت اور شیرینی میں نے مشکل ہی سے کسی میں پائی وہ نہایت فیاض طبع انسان تھے ۔ کوئی سائل ان کے در سے محروم نہیں جاتا تھا ۔

تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا ۔ ان کے جنازے میں چھوٹے بڑے ہزاروں آدمی شریک تھے اور بڑی عقیدت سے کاندھا دے رہے تھے"۔

الغرض امام اعظم، عباسی خلیفہ کے ہدفِ جور اور نشانۂ ستم بننے کے بعد فوت ہوئے تھے ۔ جبکہ منصور نے عہدۂ قضاء پیش کیا اور انہوں نے نہایت جرأت کے ساتھ اسے ٹھکرا دیا ۔

اور بلاشبہ خود امام ابوحنیفہؒ کو اپنی شرافت نفس کا احساس تھا گو اس کے ساتھ ہی اپنے شرف نفس پر اصرار کا جذبہ بھی پایا جاتا تھا ۔ چنانچہ ایک مرتبہ بنی تیم کے کسی شخص نے جس کی طرف آپ بہ لحاظ ولاء کے منسوب تھے، امام صاحب سے کہا ... اَنْتَ مولائي، یعنی تم میرے غلام ہو، تو امام صاحب نے جواب دیا ۔ .... یعنی بخدا میں تمہارے لئے اس سے زیادہ باعث شرف ہوں جتنے تم میرے لئے ہو ۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو ذلت نفس گوارا کر لیتے ہیں ۔ اور یہ چیز ان کی زندگی میں نمایاں نظر آتی ہے ۔

رہا اہل فارس کی طرف ان کا انتساب تو اس سے نہ اُن کی قدر و منزلت میں کمی واقع ہو سکتی ہے اور نہ یہ چیز حصول کمالات میں مانع بن سکتی ہے ۔ کیونکہ

ان کا نفس ایک غلام کا نفس نہ تھا۔ بلکہ ایک اصیل حُر اور صحیح النسب اور نجیب الطرفین افغان کا نفس تھا۔

شیخ آدم بنوری مشوانیؒ

شیخ آدم نسلاً افغان اور قبیلہ کے لحاظ سے مشوانی ہے۔ اور مشوانی کابل کے کوہ دامن، قندھار کے گرم سیر، ذراہ کے جان محمد کلے، میمنہ کے شیرین تگاؤ، کونڑ کے اسمار، دیر کے میدان و جندول، (شہر پشاور) اور ہزارہ کے کوہ گنگر سری کوٹ میں آباد ہیں شیخ آدم مشرقی پنجاب میں جالندھر کے قریب پٹیالہ ریاست کے بنور نامی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اس وجہ سے بنوری کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کے والد اسمٰعیل خان، خانجہان لودی کے مشیر خاص تھے۔ آدم خان بھی جوانی کے آغاز میں خانجہان لودی کی فوج کے عہدیدار تھے۔ کچھ مدت بعد افغان قوم کے ایک نامور بزرگ حاجی خضر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ کچھ عرصہ بعد حاجی خضر کے پیر مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی الکابلی سے تربیت اور ارشاد کی اجازت حاصل کی۔ لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانی افغان اُن کے مرید ہوئے تو شاہجہان بادشاہ کو خطرہ لاحق ہوا اور اُن کو ہندوستان سے ۱۰۵۱ھ میں ملک بدر کر دیا۔ وہ مکہ معظمہ چلے گئے۔ اس ہجرت میں اخوند الیاس یوسف زئیؒ بھی اپنے پیر کے ہم رکاب رہے اس مبارک سفر میں انھیں شیخ آدم مشوانی کی طرف سے خلافت کا خرقہ اور ارشاد کی اجازت ملی۔ ۱۰۵۳ھ عید الفطر کے آخری دنوں میں شیخ آدم مشوانی نے مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اور جنت البقیع میں سپرد خاک کئے گئے۔ اخوند الیاس اپنے وطن خراسان علاقہ یوسف زئی واپس آ گئے اور دیر میں لاجبوک کے مقام پر عرفان کی مشعل روشن کی۔ اس علاقہ کے اکثر افغان ان کے مرید ہوئے اور مرتے وقت تک بنوری طریقے پر قائم رہے اور لاجبوک کے مقام پر ۱۰۸۶ھ مطابق

۱۶۷۶ء ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔
شیخ آدم بنوری نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں نکات الاسرار، نظم النکات، خلاصۃ المعارف اور تفسیر سورۃ الفاتحہ کے نام قابل ذکر ہیں۔
(ماخوذ از مجلہ کابل اپریل ۱۹۵۱ء تحریر عبدالشکور رشاد ص۲۳) بقایا بر ص۱۹۴

اخون پنجو بابا

دسویں صدی ہجری میں جب بزرگانِ دین نے صحیح مذہبی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اور اصلاح باطن پر خاص زور دیا ان میں سے ایک اخون پنجو بابا بھی تھے جن کی خانقاہ مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کا مرکز تھی۔ ان کا اصلی نام عبدالوہاب تھا۔ اور چونکہ ابتدا ہی سے ارکانِ خمسہ اسلام کی تعلیم دیتے تھے اس لئے عوام میں پنجو بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد غازی خان افغان شہر سنبھل (ہندوستان) میں رہتے تھے اور ابراہیم لودی کے امراء میں شمار ہوتے تھے۔ ابراہیم لودی کے بابر کے ہاتھوں شکست کے بعد وہ اپنے علاقہ یوسف زئی میں خان گجو حکمرانِ یوسف زئی کے ہاں آکر رہائش پذیر ہوئے اور جان خان المعروف دیوانہ بابا کی ہمشیرہ سے شادی ہوئی۔ یہاں پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ دیوانہ بابا کو کسی اور نام سے موسوم کرنا سراسر غلط ہے ان کا اصلی نام جان خان ہی ہے اور وہ قبیلہ یوسف زئی کے ذیلی شاخ عمر خیل سے متعلق ہے۔ ۹۴۵ھ ہجری میں بمقام چتہ ڈیری نزد صوابی اخون پنجو کی ولادت باسعادت ہوئی۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد غازی خان پشاور آگئے اور شہر کے قریب موضع چوہا گوجر میں بچوں کی تعلیم کے خیال سے سکونت اختیار کی۔ یہیں پر اخون پنجو نے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر ہندوستان تشریف لے گئے اور تعلیم کے حصول کے لئے روہیلکھنڈ میں کافی عرصہ رہ کر علوم ظاہریہ

کی تکمیل کی ۔ اور نوسلجام گاؤں میں رہائش کی وجہ سے نوسلجامی کے لقب سے مشہور ہوئے ۔ اس اثنا میں آپ کے والد غازی خان موضع چوہا گوجر سے منتقل ہو کر شاہ ڈھنڈ قریب بالا حصار پشاور میں سکونت پذیر ہوئے ۔ یہیں وفات پائی اور یہیں بالا حصار کے نیچے دفن کئے گئے ۔ ۹۹۰ھ میں اخون پنجو نے پشاور سے سکونت ترک کر کے موضع اکبر پورہ میں مستقل سکونت اختیار کی اور عہد شاہجہانی میں ۹۵ سال کی عمر میں ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۳۰ء میں وفات پائی ۔ ان کی تجہیز و تکفین میں میاں عثمان ۔ اخون سالاک کابل گرامی ۔ شیخ علی ۔ شیخو شاہجہانپوری اور شیخ رحمکار (لمکار) جیسے جلیل القدر بزرگ شریک تھے اور موضع اکبر پورہ کے قریب مصری پورہ میں دفن کئے گئے ۔ آپ نے اپنے پیچھے پانچ صاحبزادے چھوڑے ہیں ۔ عثمان ۔ سلیمان ۔ لقمان ۔ بہاؤ الدین اور فرید الدین ۔ لقمان کی صرف ایک بیٹی تھی اور میاں گان خوش مقام اسی کی اولاد ہیں ۔ اور فرید الدین نے کالش میں وفات پائی ۔ ان کا ایک بیٹا ضیاء الدین کشمیر میں سکونت پذیر ہوا ۔ دوسرا کمال الدین اخونزادگان نوبانڈی بٹگرام میں جہاں انکی اولاد اب تک آباد ہے ۔

ان سب کے اخلاف موجود ہیں جو صاحبزادگان اور میاں گان سے یاد کئے جاتے ہیں ۔ واضح ہو کہ تنیہ چغر زئی میں غازی خان کے اپنے خیل والے عزیزوانی بھی آباد ہیں جو کہ قریب ڈھائی ہزار گھرانے ہیں ۔ مجھے جہاں تک معلوم ہے ان کے اخلاف ان مواضعات میں آباد ہیں ۔ گجرات ۔ ہمزہ کوٹ ۔ آدینہ ۔ اسمٰعیلہ دوبیان ۔ مردان ۔ طورو ۔ اکبر پورہ ۔ ملوگو ۔ پیر پائی ۔ اتمان زئی ۔ ترنگ زئی ۔ ڈھیری اشنغر ۔ تھانہ سوات ۔ چمکنی ۔ ماشو ۔ خوش مقام اور کالش تنیہ چغر زئی بونیر اور اوگئی کے پاس بلند کوٹ کے مغرب میں ۔ اخون پنجو کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جس کا نام جاد ذ تھا ۔ وہ اپنے وطن بونیر گیا تھا ۔ اور موضع کالش میں خوڑ گئی کے کنارے الگ تھلگ مدفون ہے ۔ البتہ پھر

اس کی قبر کے بعد کچھ اور قبریں بھی بن گئی ہیں ۔ یہ لاولد تھا اور اس کے علاوہ عام قبرستان میں اس خاندان والوں کے گھروں کے بالکل سامنے قریب ایک اور قبر بھی موجود ہے ۔ جس کے متعلق مجھے ان کے اہل خاندان نے جن میں معمر شخص موضع کالش کے حاجی قریب الحق بن محمد اسرائیل ہیں، نے کہا کہ یہ اخون پنجو کے ایک بیٹے کی قبر ہے ۔ جسکا نام فرید الدین ہے (بقول محمد شعیب بگرام)

غازی خان پدرِ اخون پنجو

بعض مورخ انہیں گوجر کہتے ہیں جو سراسر ناعاقبت اندیشی ہے ۔ مثلاً مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں لکھتے ہیں کہ :۔

"شیخ پنجو پشاوری اگرچہ گوجر قوم سے تھے ۔ لیکن اپنے وقت کے مشائخیں کاملین میں تھے ۔ اگرچہ افغانی زبان میں گفتگو کرتے، لیکن فارسی زبان میں شعر کہتے تھے اور ہندی میں بھی گفتگو فرماتے تھے ۔

غازی خان کے متعلق مصنف تحفتہ الاولیاء ص۹ پر لکھتا ہے کہ :۔

"درایام زوال سلطنت خاندان لودھیہ از ہندوستان برآمدہ از راہ ہزارہ بہ ملک یوسف زئی رسیدہ ... اقامت اختیار کرد"

آگے ص ۱۱-۱۲ پر لکھتا ہے کہ :۔ (اخون پنجو)

"بعمر چاردہ سال بعہد سلطنت اسلام شاہ در ہند' از یوسف زئی برآمدہ بہ علاقہ شہر بگہرام و چپہ شور روانہ شدند ۔ دریں وقت حضرت والدین و جد بزرگوار و برادر ایشاں نیز ہمراہ بودند ... دریاے لنڈی عبور کردہ چند روز در علف زار مصری پورہ درجائیکہ حالاً مزار ایشاں است سقناق داشتند و مال مویشی کہ ہمراہ داشتند ایں جاے چرانند ... باز بہ موضع چوہا گوجر کہ دھے است در قرب پشاور آمدہ اقامت

اختیار کردند تا آنکہ مویشی ایشان زیاد شد۔ ایشان دو سہ چھپرے متصل دہ ساختہ گزران مے کردند و برائے مویشی و گاؤمیش ہا آغول ہا علیحدہ ساختہ بودند ... از ہمیں توہم مردم نافہم ایشان را گوجر دانستند حالانکہ ایشان در اصل سید بودند اگرچہ خود اظہار ایں امر نمے کردند' چراکہ شرفا نسب فروشی را عار مے دانند" پھر ص۳۱ پر)

"اخون سالاک صاحب بہ اجازت پیر (اخون پنجو) برائے جہاد کفار کوہستان شمال العلاقہ یوسف زئی' روانہ شدند پیر در حق ایشان دعا کرد و اسپے برائے سواری و یک شمشیر نیچہ بطور تبرک بایشان داد و فرمود کہ دریں خصوص از شیخ رحمکار صاحب نیز استمداد بکنند۔ اخون سالاک صرف با دو نفر از اکبرپورہ روانہ شدہ بخدمت شیخ رحمکار المعروف بہ کاکا صاحب آمدہ' اظہار ما فی الضمیر کرد' آنجناب ایشاں را مرید خود فقیر چنبل بیگ ... روانہ کردند کہ پیش او رفتہ استمداد ہمت کنند"۔ آگے صفحہ ۳۵ پہ :۔

"وچوں از نسبت یوسف زئی ظاہر است کہ از مغل بادشاہ نفرت مے کرد لہذا آنحضرت خود را بہ وطن قدیم اسلاف یعنی سنبھل کہ در ہندوستان بعلاقہ روہیلکھنڈ قریب مرادآباد موضع است منسوب میکردند' از ہمیں موجب در آئین اکبری ایشان را شیخ سنبھلی نوشتند"۔

واضح ہو کہ اُس وقت پشاور کا پورا علاقہ یوسف زئی کے زیر اثر تھا جیسا کہ تواریخ حافظ رحمت خانی اور تاریخ سعادت نامہ سے ظاہر ہے۔ اُس زمانہ میں جب اخون پنجو اور ان کے والد نے پشاور جانے کا ارادہ کیا تو غالباً اس خیال سے کہ یہ علاقہ اجنبی نہ تھا بلکہ وہ بھی اپنا ہی علاقہ تھا اور نہ اُس وقت یہاں مغلوں کی

حکومت تھی[1]۔ چونکہ وہ ہندوستان میں شہری زندگی کے عادی ہوچکے تھے اس خیال سے شہر پشاور کے قریب رہنا پسند کیا ہوگا۔ اور نیز بچوں کی تعلیم و تربیت کو بھی آسان تصور کیا جانا قرین قیاس ہے۔ ورنہ ان کے پشاور جانے کی کوئی وجہ اور نہ ان کو کوئی شکایت۔

ان مستند حوالوں سے صاف ظاہر ہے کہ غازی خان اور ان کے اخلاف نہ تو نسلاً سید تھے اور نہ گوجر قوم سے ان کا تعلق تھا۔ بلکہ وہ افغان تھے۔

میر احمد شاہ رضوانی مصنف تحفۃ الاولیا انہیں سید بھی کہتے ہیں اور یوسف زئی بھی۔ حالانکہ سید کہنے کے لئے انہوں نے کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں کیا بلکہ محض قیاس سے کام لیا ہے۔ البتہ افغانی ہونے کے لئے انہوں نے کافی ثبوت فراہم کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان سے ہجرت کی وجہ انہوں نے افغان حکمران ابراہیم لودی کی شکست بتائی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک نامور افغان ہونے کی حیثیت سے ننگ افغانی اور مغل دشمنی کے سبب ہندوستان میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کرنے پر آمادہ ہوئے اور اپنے ملک یوسف زئی میں خان گجو کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان پر جب کوئی مشکل وقت آتا ہے تو وہ اپنے ہم نسل لوگوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جیسے کہ پشتو زبان کی ایک ضرب المثل ہے کہ:۔

لاس چه ماتا شي غاړه له حئ

یعنی جب ہاتھ ٹوٹتا ہے تو گردن میں آجاتا ہے۔ یعنی ٹوٹا ہوا بازو گردن کا سہارا

---

[1] کیمبرج لکھتا ہے:۔ بابر اور ہمایوں کی اموات کے درمیان پچیس سال کے عرصہ میں دریائے سندھ کے پار کا پورا علاقہ جس میں وادی پشاور، اور میدان اور پہاڑی علاقے شامل ہیں مغلوں کے زیر اقتدار نہیں رہا۔۔۔ (ہندوستان جاتے وقت) ہمایوں کو یہ یقین نہیں تھا کہ وہ پشاور کے افغانوں کے ساتھ نپٹ سکے گا چنانچہ وہ کُرم بنگش کے راستے آگے بڑھا۔"

لیتا ہے۔

مصنّف موصوف یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ اخون پنجو اپنے آپ کو سیّد نہیں کہتے تھے۔ اگر وہ واقعی سیّد ہوتے تو اپنی نسل چھپانے کا گناہ وہ کبھی اپنے سر نہ لیتے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان کے معتقدین ان کو مغل بادشاہ کے خوف کی وجہ سے شیخ سنبھلی کے عرف سے یاد کیا کرتے تھے اور یہ پردہ داری صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ افغان تھے۔ ورنہ سیّد کہنے میں کسی قسم کا خوف نہ تھا۔

ایک اہم ثبوت ان کے افغان ہونے کا ایک اور کارنامے سے ملتا ہے۔ کہ یوسفزیوں کا نظام ایک وقت میں کافی حد تک بگڑ چکا تھا، انہوں نے اپنے نسلی امتیاز کا مظاہرہ کرتے ہوئے اخون سالاک اور بیرسباک دونوں بھائیوں کو یوسفزیوں کی امداد کے لئے اُن کے علاقہ میں بھی بھیجا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ بہتر طور پر منظم اور مضبوط ہوں۔ چنانچہ بھاکو خان کی سربراہی میں یوسفزیوں کی تنظیم مغلوں کے لئے دردسر بنی رہی۔ اس مہم میں حضرت کاکا صاحب بھی ان کے ہمراز تھے۔ اور یہ وہ علاقہ تھا جہاں اخون پنجو کے اسلاف مقیم رہے تھے۔

ان وجوہات کے پیش نظر ان کے افغان ہونے میں کسی قسم کے شک شبہ کی گنجائش نہیں رہتی اور ان کو گوجر یا سیّد کہنا صرف مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ سراسر بے انصافی ہے۔

موضع مصری پورہ (اکبر پورہ) کے کاغذات مال بندوبست ۱۸۷۰ء میں افغان اور نیز تاریخ پشاور میں اخون پنجو کو قوم افغان ہی لکھا گیا ہے۔ اسی طرح میاں محمد عمر صاحب چمکنی کو بھی افغان ہی درج کیا گیا ہے جو زیادہ

قابل اعتبار ہے یہ کاغذات بندوبست محافظ خانہ پشاور میں موجود ہیں۔

غلط فہمی کا ازالہ

بعض افغان سلاطین ہند اور مشائخ کی نسل و نسب کے متعلق بعض غیر افغان مورخین نے شکوک پیدا کئے ہیں۔ مثلاً انہوں نے ایبک، تغلق، بہمن، سلطان ٹیپو، سواتی اور خلجی کو غیر افغان سے بتایا ہے حالانکہ وہ سب نسلاً اور نسباً افغان تھے اور ان کے ہم نسل قبیلے پہلے بھی موجود تھے اور اب بھی ولایت افغان میں موجود ہیں۔ ذیل میں ان کے افغان ہونے کے ثبوت میں تاریخی کتابوں کے بیانات پیش کیے جاتے ہیں۔

قطب الدین ایبک

محمد غوری کے جرنیلوں میں قطب الدینؒ کو غیر افغان مورخین نے ترکی النسل کہا ہے حالانکہ افغانوں میں ایبک اور لوبک دو قبیلے ہیں جن کے نام پر کم از کم دو گاؤں سندھ میں لوبک اور افغانستان میں ایبک کے نام سے اب تک موسوم ہیں۔ رسالنامہ کابل سال ۱۹۳۳ء (ص ۱۶۲-۱۶۳) میں تحریر ہے:۔

"سمنگان (یا سمہ گان) از بلاد تاریخی و نفیس افغانستان تا ظہور و ہجوم اعراب حساب میشد و حالیہ قریۂ ایبک جائے آنرا گرفتہ.. تاسیس حکومت اسلامی در ہند واسطۂ قطب الدین افغان ایبک ۱۲۰۶ء"

تاریخ ابراہیم بٹنی (قلمی نسخہ) میں قطب الدین کے قبیلہ ایبک کا شجرہ نسب یوں درج کیا گیا ہے۔

"سروانی را سہ پسر کرامت فرمود اول سینی یا سوتی، دوئم سرپال، سوئم یلی سینی یا سوتی بن سروانی را پنج پسر بوجود آمد اول ابوالفرح، دوئم ایبک، سوئم لوبک، چہارم حسن، پنجم مدیہ"

تغلق یا تغرک۔

اس کے متعلق تاریخ ابراہیم بٹنی میں شجرہ نسب یوں درج ہے۔

غورغشتی سہ پسر داشت اول دانی، دوئم بابی، سوئم مندو۔ دانی بن غورغشتی را چہار پسر بود اول کاکڑ، دوئم ناغڑ، سوئم دادی چہارم پنی'

ذکر اولاد کاکڑ بن دانی = اول تغرک یا تغلق، دوئم جدرام، سوئم سبرا[1] چہارم زڑ غوزی، پنجم چرمی، ششم پندار' اس کے آگے بالترتیب کرکران، فرملی[8] خستے[9]، دمڑ[10]، سبر[11]، سرکڑی[12]، لگڑ[13]، تارن[14]، اسپینے[15]۔ ترغڑی[16]، موسی زئی[17] ماقی زئی[18]۔ یونس خیل، سام[20]، درپی خیل[21]، جلال خیل[22]، مکرانے[23] اور انجے[24] کے نام آئے ہیں۔

ذکر اولاد تغلق یا تغرک یا تغلک بن کاکڑ۔ او چار پسر داشت اول یونس خیل دوئم سلار خیل سوئم سودن، چہارم سنجر الملقب سران۔ محمد تغلق بادشاہ دہلی اسی خاندان سے تھا۔

افغانوں کا ایک اور اہم متفقہ فیصلہ جسے تاریخ ابراہیم بٹنی میں یوں درج کیا گیا ہے:۔

"ذکر ایں چند قوم افغانیہ نوشتہ ہمیں باہتمام رسانید۔ چنانچہ بختیار واشترانی در قوم شیرانی اند و سید زمی در قوم ترین اند و خرشین در قوم میانہ و کوتی در قوم بٹنی اند و مشوانی و تارن در قوم کاکڑ اند ھنی و ورد گ در قوم کرلانی اند... وکلانانِ ما ایں سخن گفتہ باشند ہر کہ از اولادِ ما خود را داخل سید شمارد او اولادِ ما نیست چنانچہ ایں مقدمہ در سلطنت سلطان بہلول و سلطان سکندر لودی و شیر شاہ سور نیز مذکور شدہ بودہ۔ بزرگانِ ایشاں اقرار را مبدل ساختند و

ایں کلمہ نیز در محافل بادشاہانِ مذکور مقرر شد۔"

بہمنی خاندان کا شجرہ نسب :۔

ان کے متعلق تاریخ ابراہیم بٹنی میں شجرہ نسب یوں درج ہے :۔

"اشبون ولد بٹنی ابن قیس راشش پسر بوجود آمد۔ اول ابراہیم دوئم مزیانی، سوئم درغانی، چہارم غروم، پنجم شیخے، ششم کز بوتے، ابراہیم بن اشبون را دو پسر بوجود آمد۔ اول دوتانی، دوئم کوتے دوتانی بن ابراہیم را دو پسر شد۔ اول اوکرے، دوئم بہمن۔"

محمد تغلق بادشاہ کے زمانہ میں کچھ افغان اُس سے ناراض ہو کر دکن میں مقیم ہوئے اور انہوں نے بالاتفاق حسن خان افغان بہمنی کو اپنا بادشاہ منتخب کیا بہمن ایک افغان قبیلہ ہے جو بٹنی کی ذیلی شاخ دوتانی سے ہے جیسا کہ شجرہ نسب مذکورہ سے ظاہر ہے۔ اس خاندان نے ایک سو اٹھاسی (۱۸۸) برس حکومت کی۔ چاند بی بی بھی اسی خاندان سے تھی۔ ان کے متعلق بھی بعض مورخین نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ حالانکہ اُن کی حقیقت یہ ہے کہ :۔

بہمنی خاندان اور دکن

چودھویں صدی کے اوائل میں دکن کی سیاسی بساط الٹ گئی، کیونکہ خلجی اور تغلق بادشاہوں نے یہاں افغانوں کی عملداری قائم کر دی اور اس ملک کے نظم ونسق کے لئے جو افغان یہاں آباد کئے گئے تھے وہ پچاس سال کے اندر دہلی کے اقتدار سے علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے ۱۳۴۵ء میں دکن کی خود مختار حکومت قائم کر لی جو تمام دکن پر پھیل گئی اور صرف دو سال کے بعد انہی کی سلطنت نے حسن خان بہمنی کی سرکردگی میں افغان بہمنی خاندان کی شکل اختیار کر لی اور اپنے لائق بادشاہوں کی رہنمائی میں سو سال تک پروان چڑھتی رہی۔

اس بادشاہت کا بانی دکن کا ایک تاریخ ساز افغان جرگہ تھا۔
جو "امرائے صدہ" کے نام سے یاد کیا جاتا۔ انہوں نے اپنے ایک بزرگ ساتھی کو
جو افغانوں کے ایک مشہور بڑے قبیلے بٹنی سے دوتانی کی ذیلی شاخ بھمن سے
متعلق تھا، ۷۴۸ھ مطابق ۱۳۴۷ء اپنا بادشاہ منتخب کر کے اس سلطنت
کی داغ بیل ڈالی اور رفتہ رفتہ اس کو مستحکم اور اقبال مند بنایا۔ اس سلطنت
نے دکن کی خوابیدہ طاقتوں کو جگایا، تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلائی لیکن
۸۲۵ھ مطابق ۱۴۲۲ء سے یہ سلطنت بد قسمتی سے طبقہ واری کش مکش کا شکار ہونے
لگی جو بالآخر اس کے لئے پیام موت ثابت ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کی آبادی دو
مختلف جنسوں یا فرقوں میں بٹ گئی تھی جو دکنی اور غیر دکنی کہلاتے تھے۔
اول الذکر تو بہمنی سلطنت کے معمار "امرائے صدہ" یعنی وہ افغان جرگہ جس کے
اراکین تعداد صرف ایک سو تھی، کی اولاد تھے جو اپنے کو دکن کا حقیقی وارث سمجھتے
تھے، کیونکہ انہیں کے آباؤ اجداد نے دکن کو اپنا گھر بنایا اور بہمنی سلطنت کو
سنوارا۔ آخر الذکر طبقہ میں ترک و ایرانی تھے جو نو وارد تھے، یہاں ان کو جگہ
دی گئی تھی اور کافی مراعات بھی۔ مگر وہ حکومت کی مہمان نوازی سے
فائدہ اٹھا کر چپکے چپکے سلطنت پر چھا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقوں
میں رقابت پیدا ہو گئی جو بالآخر بہت شدید ہو گئی اور رفتہ رفتہ حالات بد
سے بدتر ہو گئے اور بد قسمتی سے وہ لوگ بھی جو اس سلطنت کے عمائد سمجھے جاتے
تھے، اعلانیہ سرتابی کرنے لگے۔ چنانچہ ۸۹۶ھ مطابق ۱۴۹۰ء میں جس کو سلطنت
کا آخری دور سمجھنا چاہیئے، سلطنت کے اردگرد بیرونی صوبوں پہ وہی افغان
امراء اور صوبہ دار قابض ہونے لگے۔

بہمنیوں کی مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ اس کے اکثر صوبے

اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ سلطنت کا سیاسی شیرازہ بکھرنے لگا چنانچہ احمد نگر بیجاپور، اور برار کے بانیوں نے بالاتفاق سلطان محمود بہمنی بادشاہ کا نام اس کی زندگی ہی میں خطبہ سے خارج کر کے اپنے اپنے نام داخل کر دیئے البتہ تلنگانہ اور گولکنڈہ والوں نے اعلان خود مختاری اس کی وفات کے بعد کیا تھا۔ سلطان محمود بہمنی بادشاہ کا سنہ انتقال ۹۱۲ھ مطابق ۱۵۰۶ء اور بعض نے ۹۲۴ھ مطابق ۱۵۱۸ء بتایا ہے۔ سلطان حسن خان بہمنی اور اس کی نسل کے سولہ بادشاہوں کی مجموعی مدت حکومت ۱۸۰ سال تک رہی۔

مصنف تاریخ قدیم ہند صہ ۱۸۴ پر دکن کی بہمنی سلطنت کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:-

"محمد تغلق کے عہد ۱۳۴۷ء میں ایک افغان افسر مسمی حسن خان (معروف بہ ظفر خان) نے جس کا نام گنگو بہمنی پڑ گیا، ایک آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس کا دارالخلافہ گلبرگہ تھا جو اِس وقت نظام کی ریاست میں واقع ہے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں یہ سلطنت ایک ساگر سے دوسرے ساگر تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں موجودہ احاطہ بمبئی۔ بیدر۔ بیجاپور گولکنڈہ۔ احمد نگر۔ برار اور خاندیس کے علاقے شامل تھے۔ شاہانِ بہمنی کا انتظام حکومت بہت سخت تھا۔ سڑکوں پر پہرا اچھا تھا۔ آبپاشی کا طریقہ جاری ہو چکا تھا اور مالیہ وصول کرنے کا انتظام باقاعدہ تھا۔ ٹیکس زیادہ تھے۔ مسلمانوں کے لئے تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ ہر ایک مسجد میں ایک مُلّا رہتا تھا وہ لڑکوں کو لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم دیتا تھا۔ اور قرآن کی آیات بھی یاد کراتا تھا"

دکن کے ایک مشہور مصنف محمد حسین اپنی تصنیف احکم التاریخ معروف بہ محبوب

السلاطین صـ ۲۳۲ پر لکھتے ہیں کہ :

"اب ہم تاریخ کے اس زمانہ کو پیش نظر کرتے ہیں جس میں دار السلطنت دہلی کے سلاطین افغانیہ کے عہد میں کئی جگہ اور اسلامی خود مختار سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ چنانچہ مظفر شاہ گجراتی کے خاندان کی بنیادِ سلطنت ۷۹۳ھ کو ملک گجرات میں۔ اور سلطان حسین المخاطب بہ دلاور خان شاہان خلجیہ (خلجی افغان) کے خاندان کی سلطنت ملکِ مالوہ اور مندو میں۔ اور محمد بختیار خلجی (غوری افغان) کے خاندان کی سلطنت بنگال بہار وغیرہ میں اور ملک سرور خان جہان (افغان) المخاطب بہ سلطان الشرق کے خاندان کی سلطنت جونپور میں۔ اور شاہ میر (سواتی افغان) المخاطب شمس الدین کے خاندان کی سلطنت، کشمیر میں۔ یہ سب خود مختار سلطنتیں قائم تھیں۔ ان سب میں دکن کی سلطنت ملقب بہ بہمنیہ (بہمنی افغان) بڑی مشہور تھی جس کا بانی ایک افغان سردار ظفر خان (یا حسن خان) نامی گذرا ہے جو محمد تغلق کے عہد میں تھا۔ دار الخلافہ دہلی سے جو حاکم فوج لے کر اس سے لڑنے آیا اُن سب کو اُس جواں مرد سردار نے مغلوب کیا اور گلبرگہ کو اپنا تخت گاہ قرار دے کر اس کا نام حسن آباد مقرر کر کے ملکِ دکن کا خود مختار بادشاہ بن گیا۔ اور اعیانِ دکن نے بہ اتفاق اس کی بادشاہت تسلیم کی۔ وہ گیارہ سال دو ماہ نیک نامی سے سلطنت کر کے ۶۷ سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ شخص حنفی مذہب کا سخت پابند تھا اس نے احکام شرع کو رونق دی۔ اپنی والدہ کو حج کے لئے مکہ معظمہ بھیج دیا۔ اور رائے تلنگ اور بیجانگر کے ساتھ اس نے بڑے بڑے معرکے کئے اور فتحیاب

رہا۔ اوران کو محکوم و باجگزار بنایا۔ بت پرستی موقوف کی اور مسجدیں بنوائیں سترہ برس اس نے کمال دینداری و استقلال سے حکومت کی اور وفات پائی۔"

دکن پر مغلوں کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے عبدالمجید صدیقی اپنی تاریخ گولکنڈہ میں لکھتے ہیں:۔

"شاہان دکن کو ایک بڑی طاقت سے دوچار ہونا پڑا۔ اور یہ مغلوں کی طاقت تھی ۹۶۴ھ مطابق ۱۵۵۶ء کی جنگ پانی پت سے مغلوں کے ہندوستان میں ایسے قدم جم گئے کہ اب کوئی طاقت انہیں متزلزل نہیں کرسکتی تھی۔ اس جنگ کے بعد مالوہ۔ بنگالہ۔ گجرات۔ راجپوتانہ۔ کشمیر قندھار اور کابل فتح ہوگئے۔ چنانچہ ۹۹۸ھ مطابق ۱۵۹۰ء تک مغل سلطنت تمام شمالی ہندوستان میں چھا گئی۔ اس کے بعد اس کو دکن کی ہمسر سلطنتوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملا، چنانچہ شہنشاہ اکبر نے دکن کے مسئلے پر دل سے غور کرنا شروع کردیا۔ اگرچہ اس مغل پیش قدمی کا باعث خود اکبر کا نصب العین تھا کہ وہ تمام ہندوستان کی شیرازہ بندی کرکے ایک متحدہ سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا لیکن دکن کے ناگوار حالات بھی خودبخود اس کے محرک ہوگئے۔ یعنی آپس کی ناچاقی کی وجہ سے دکن کے بعض حکمرانوں نے خود اکبر کو دعوت دی۔ جس وقت مغل فوجیں احمد نگر کی تسخیر کے لیے روانہ ہوئیں تو اس وقت ملک کی سیاسی حالت بہت حوصلہ شکن ہوگئی تھی۔ احمد نگر کے بادشاہ برہان کے انتقال کے بعد جو ۱۰۰۴ھ مطابق ۱۵۹۵ء میں ہوا۔ اس بدبخت سلطنت کا کوئی راہنمائے سیاست نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ بایں سبب بادشاہ بنانے میں اختلاف

پیدا ہوا۔ اس زمانے میں مغل فوجیں شہزادہ مراد، عبدالرحیم خانخانان اور شاہ رخ مرزا کے تحت احمد نگر کے سامنے پہنچ گئیں۔ ان حملہ آوروں کے آنے سے ان باغیوں کی بھی آنکھیں کھل گئیں جنہوں نے مغلوں کو بلایا تھا۔ اب ہر طبقہ احمد نگر کو دشمنوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ چونکہ اس وقت ملک میں کوئی ناخدائے سیاست ایسا نہ تھا جو ملک کی رہنمائی کرتا۔ اس لئے سب طبقوں نے برہان بادشاہ مرحوم کی بہن چاند بی بی کو جو اس وقت بیجاپور میں تھی احمد نگر کی حفاظت اور امداد کے لئے بلا لیا۔ اس ہیروئن نے اپنے وطنِ مالوف کو دشمنوں سے بچانا اپنا فرض سمجھا اور فوراً بیجاپور سے احمد نگر کو بچانے کے لئے دوڑی آئی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمران بھی اس نازک صورتِ حال کو خوب محسوس کرتے تھے۔ ان کی بقا احمد نگر کی سلامتی پر منحصر تھی۔ جب چاند بی بی نے شہزادہ مراد کے مقابلے میں فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تو بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں نے امداد کے لئے اپنی اپنی فوج بھیجی۔ اس طرح ساٹھ ستر ہزار کی فوج ملکہ چاند بی بی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی تھی۔ چنانچہ چاند بی بی کی شہرہ آفاق دلاوری اور دکن کی متحدہ طاقت کا نتیجہ تھا کہ مغل احمد نگر کی تسخیر میں کامیاب نہیں ہو سکے۔"

مولوی ذکاء اللہ اقبال نامہ اکبری کی جلد پنجم میں زیرِ عنوان "معاملات و مہمات دکن" لکھتے ہیں :-

"۹۹۹ھ اس سال شوال کے مہینے میں بادشاہ نے اپنے مخصوص

ملازموں پر مشتمل دکن کے حاکموں کی طرف ایک سفارت بھیجی بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاکمانِ دکن سے درخواست کی گئی کہ وہ اکبر کی شہنشاہی کو قبول کر کے اطاعت کریں۔ تاریخ فرشتہ میں تو لکھا ہے کہ شاہانِ دکن نے اکبر کی شہنشاہی کو تسلیم نہیں کیا۔ نظام الدین نے لکھا ہے کہ انھوں نے لائق پیشکش نہ بھیجی اور اخلاص میں دلخواہی ظاہر نہ کی اس لئے بادشاہ نے ان سے لڑنے کا ارادہ کیا۔ شاہی لشکر بھیجا گیا بہت لڑائیوں کے بعد شاہزادہ سلطان مراد احمد نگر سے ناکام پھرا۔ اس کے بعد شاہزادہ دانیال کو دکن کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ مختلف حصوں سے مختلف سپہ سالاروں کو بھیجا کہ وہ آزادانہ دکن کی فتح میں ایک دل ہو کر کوشش کریں لیکن کچھ کامیابی نہ ہوئی اور ابوالفضل کو دکن بھیجنا پڑا اور پھر خود بادشاہ کو آگرہ سے دکن آنا پڑا۔ خلاصہ یہ ہے کہ دکن کی آزادی جاتی رہی۔ مگر وہ ایسے مغلوب بھی نہیں ہوئے کہ اکبر کی سلطنت اس میں بے کھٹکے قائم ہو جاتی۔

ٹیپو سلطان

سلطان ٹیپو جس کا نام فتح علی تھا، پیدائش ۱۷۴۹ء، تخت نشینی ۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ء اور وفات ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ہوئی۔ وہ ۱۷۹۹ء تک ریاست میسور کا حکمران رہا ہے۔ انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنے میں عالمگیر شہرت کا مالک ہے اس کا والد حیدر علی ترین افغان تھا۔ تفصیل یہ ہے کہ حیدر علی کے آباؤ اجداد بمقام بلبل جھالاوان (بلوچستان) میں آباد تھے اور تور ترین کی ذیلی شاخ رئیسانی افغانوں سے متعلق تھے۔ بعد میں ان کے اجداد یہاں سے دکن گئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ حیدر علی وہاں پیدا ہوئے۔ دکن میں سکونت اختیار کرنے کے بعد

بھی وہ اپنے قدیمی گاؤں بلبل کے نسبتی نام سے یاد ہوتے رہے۔ حیدر علی نے ۱۷۶۶ء میں میسور کے ہندو راجہ کو معزول کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد آس پاس کے علاقوں کو فتح کر کے انہیں بھی اپنی ریاست میں ملا لیا۔ ٹیپو سلطان اُسی نامور باپ کا بیٹا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ میں ان دونوں کے نام ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کتاب تاریخ ہند و پاک میں درج ہے کہ:۔

"ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کو جو میسور کا فرمانروا تھا، مورخین نے افغان کہا ہے۔ اس کے ایک دادا ولی محمد بلبل نے گلبرگہ دکن میں اور دوسرے دادا علی محمد بلبل نے گالا دکن میں سکونت اختیار کی اور ۱۶۷۰ء میں چار بیٹے چھوڑ کر علی محمد بلبل وفات پا گئے اس کا سب سے چھوٹا بیٹا فتح محمد تھا جو حیدر علی کا باپ تھا۔ حیدر علی کو میسور میں فوجداری ملی اور خدمات کے عوض علاقہ بدی کوتہ جاگیر ملی ترقی کر کے میسور کا سالار اعظم بن گیا۔ ۱۷۶۵ء میں مرہٹوں سے شکست پانے کی خفت کو اس نے اگلے سال ملیبار اور کالی کٹ فتح کر کے دور کیا۔

سلطان ٹیپو ایک سادہ پٹھان اور پکا مسلمان تھا۔ اسلام سے اُسے بے حد محبت تھی۔ دین کا وہ شیدائی تھا۔ نماز اور روزے کا بڑی سختی سے پابند تھا۔ نماز ہمیشہ وقت پہ باجماعت ادا کرتا تھا۔ سرنگاپٹم میں سلطان نے ایک نہایت ہی خوبصورت اور شاندار مسجد بنوائی تھی جس کو مسجد اعلیٰ کہتے تھے۔ اس میں جب پہلی مرتبہ نماز پڑھی جانے لگی تو طے ہوا کہ امامت وہ شخص کرائے جو صاحب ترتیب ہو یعنی جس

نے کبھی نماز قضا نہ کی ہو۔ مسجد میں اُس وقت بڑے بڑے عالم، زاہد اور شیخ موجود تھے لیکن اتنے بڑے ہجوم میں کوئی شخص ایسا نہ نکلا جو صاحب ترتیب ہونے کا دعویٰ کر سکتا۔ یہ دیکھ کر سلطان ٹیپو اٹھا اور کہا خدا کا شکر ہے کہ میں صاحب ترتیب ہوں۔ چنانچہ پہلی نماز کی امامت سلطان نے ہی کی۔ بادشاہوں کے دربار میں جھک کر سلام کرنے کا قاعدہ رائج تھا بلکہ بعض درباروں میں تو لوگ سجدہ تک کرتے تھے۔ مگر سلطان نے اس طرح سلام کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی تھی۔ حیادار اس قدر تھا کہ تمام عمر حمام میں بھی ننگا نہیں نہایا۔ نماز پڑھ کر بڑی عقیدت سے قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ اس کی سلطنت میں شراب اور جوئے بازی سختی سے بند تھی۔ سلطان کی زبان سے کسی شخص نے کوئی گندی یا فضول بات کبھی نہیں سنی۔ وہ ہمیشہ سوچ سمجھ کر بات کرتا تھا۔ اس کے دربار میں ہمیشہ علمی، اخلاقی، سیاسی باتیں ہوتی تھیں۔"

بلوچستان

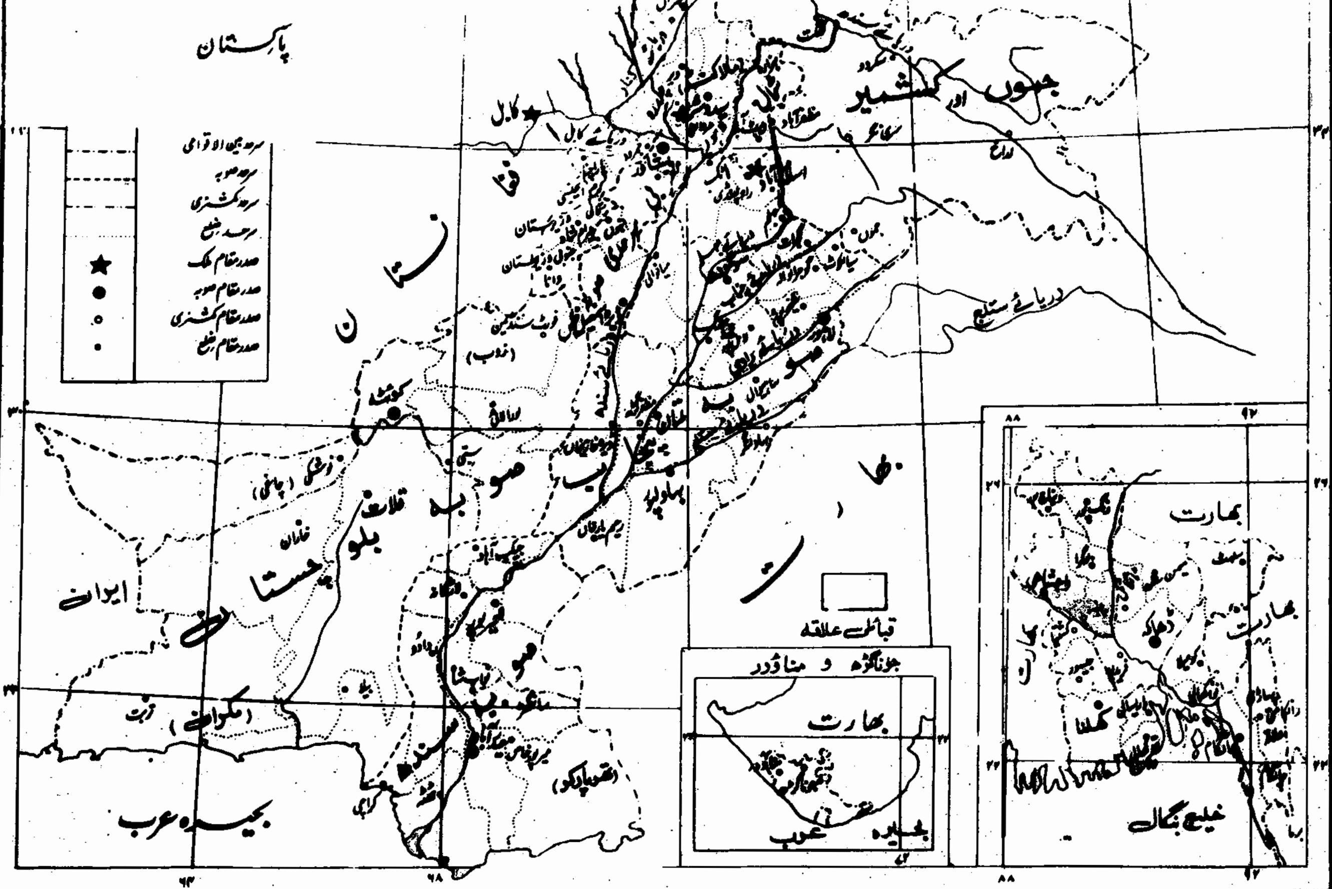
تعلق و بہمنی خاندان اور سلطان ٹیپو کا تعلق چونکہ علاقہ بلوچستان سے رہا ہے اس لئے اس کا ذکر ضروری ہے۔ ایک محقق کہتا ہے:۔

"بلوچستان سے لفظی طور پر بلوچوں کا علاقہ مراد ہے لیکن یہ لفظ بلوچستان کے لئے اس معنی میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ وادئ شال جو قلات سے قریباً ستر میل شمال میں اور درۂ بولان کے سرے پر سطح سمندر سے پانچ ہزار پانچسو فٹ کی بلندی پر، اُس سرحد پر واقع ہے جو دو نسلوں کو علیحدہ علیحدہ کرتی ہے۔ اس وادی کے مرکز میں کوئٹہ شہر ہے شال

میں پورا علاقہ پٹھان خطہ کا حصہ ہے اور اس میں پٹھان قبائل ہی آباد ہیں۔ ان میں ترین، اچک زئی، کاکڑ، اور پنڑی (رینی) سب سے زیادہ اہمیت کے مالک ہیں۔ کوئٹہ کے جنوب میں تمام آبادی بلوچوں اور بروہیوں کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بلوچستان کا بیشتر حصہ بروہی اور بلوچ قبائل کے قبضہ میں ہے۔ لیکن ان قبائل کا علاقہ وسیع مرتفع اور ریگستانوں پر مشتمل ہے جو کوئٹہ سے مغرب اور جنوب کی طرف سمندر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ پوری آبادی میں سے قریباً نصف پٹھان ہیں جو کوئٹہ سے شمال اور شمال مشرق میں نسبتاً زیادہ زرخیز پہاڑیوں اور وادیوں میں آباد ہیں۔ صحیح جائزہ لیا جائے تو بلوچستان میں بھی پٹھان قبائل ہی اہمیت کے مالک ہیں۔ اگرچہ یہ قبائل تعداد میں بہت تھوڑے ہیں اور سب ملا کر آٹھ لاکھ سے بھی کم ہیں۔

قلات کے خوانین کے مورث اعلیٰ ناصر خان کا درانی سلطنت کے بانی احمد شاہ سے جاگیر دارانہ تعلق تھا۔ مستونگ اور قلات کا سردار بروہی ناصر خان گویا احمد شاہ کے عقبی دروازہ پر متعین تھا اور قندھار سے ہندوستان جانے والی شاہراہ پر سب سے زیادہ اہمیت کا مالک تھا۔ قلات اس زمانہ سے بہت پہلے سے قندھار کا باجگزار چلا آرہا تھا اور جب احمد شاہ نے ۱۷۴۷ء میں اس شہر میں اپنی سلطنت قائم کی تو اس نے بروہیوں کو بھی زیر کر لیا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کی سلطنت کی حدیں سمندر تک پھیلی ہوئی ہیں "




پاکستان
سرحد بین الاقوامی
سرحد صوبہ
سرحد کمشنری
سرحد ضلع
صدر مقام ملک
صدر مقام صوبہ
صدر مقام کمشنری
صدر مقام ضلع
جموں اور کشمیر
کابل
دریائے ستلج
ایران
بحیرہ عرب
قبائلی علاقہ
جوناگڑھ و مناوڈر
بھارت
خلیج بنگال
ڈھاکہ

سندھ

سمہ اور سومرو خاندان

نسب و نسل کے متعلق جس طرح کی غلط فہمیاں برصغیر کے افغان حکمران خاندانوں کے بارے میں پائی جاتی ہیں۔ ان کا اندازہ گزشتہ صفحات کے ان مباحث سے کیا جا سکتا ہے جو محمد غوری، قطب الدین ایبک، تغلق، دکن کے بہمنی اور سلطان ٹیپو کے ذیل میں گزرے ہیں۔ اس قسم کی غلط فہمیوں بلکہ مخالف مورخین کی غلط بیانیوں کا سلسلہ اتنا دراز ہے کہ ایک مقالہ یا مختصر کتاب میں ان کا بیان کرنا ممکن نہیں۔

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

لیکن یہاں سندھ و ملتان کے چند افغان حکمران خاندانوں کے بارے میں بھی چند سطریں لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سندھ کے ان افغان حکمران خاندانوں سے مراد سمہ، سومرہ اور لنگاہ خاندان ہیں جو اصلاً اور نسلاً افغان قبائل ہیں۔ لیکن مخالف اہل قلم نے ان کے نسب پر غلط فہمیوں کے پردے ڈال دیئے ہیں۔

بحوالہ ٹاڈ راجستھان:۔ قبیلہ جام سندھ کے مورثیان کا بیان ہے کہ ان کا مورث شام تھا یا سیریا۔ یہی وجہ ہے کہ شام بدل کر جام ہوگیا اور اس کی ایک چھوٹی ریاست جام راج کے نام سے اس خطاب کی شاہد ہے۔ صفحہ ۲۲۶

اس خاندان کے متعلق مولانا اعجاز الحق قدوسی اپنی کتاب تاریخ سندھ میں لکھتے ہیں کہ:۔

سندھ میں سومرا قبیلے کے بعد سمہ خاندان برسر حکومت آیا۔ انہوں نے ایک شہر آباد کیا جس کا نام "سامو ئی" رکھا اور اس کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ "جام آنز" سمہ خاندان کا پہلا فرمانروا

ہے، جوارمیل یا ہمیر سومرا کو شکست دے کر اقتدار حاصل کر کے ۷۵۱ھ میں سندھ کا فرمانروا ہوا۔

سمون کا دورِ حکومت ایک کامیاب دور رہا جس میں علم و فضل اور تجارت کو فروغ ہوا۔ قیاس یہ ہے کہ "سامو‏ئی یا شامو‏ئی" اشارہ ہے شام کو جو نسبی نسبت کے لئے پایۂ تخت کا یہ نام رکھا گیا ہو یعنی سامی، شامی واضح ہو کہ اسی نام کا ایک افغان قبیلہ جو زمانہ ماقبل میں بلخ کے شمال مشرق میں آباد تھا۔ اب بھی یہ علاقہ سمہ گان، سمگان یا سمنگان کے نام سے افغانستان میں موسوم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تاتاریوں کی یلغار سے یا اسلام کے بعد محمدؐ بن قاسم کے وقت میں سندھ کی طرف آئے ہوں اور لشکر میں شامل ہو کر سندھ فتح کرنے کے بعد یہیں رہائش اختیار کی ہو۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ محمد بن قاسم کے سندھ اور ملتان فتح کرنے کے وقت کچھ افغان قبائل بھی ان کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔

سامرہ سومرہ[1]، سومرو۔ سلاطین دہلی کے ماتحت حکومت کرتے تھے اور ان کا ابتدائی پایہ تخت تھری جو اسرائیلی نام ہے، تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی ان جلاوطن اسرائیلیوں کی اولاد میں سے ہیں جو اشوریوں کے ہاتھوں "سامرہ" سے خراسان وغیرہ میں جلاوطن ہو چکے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر اپنی کتاب تاریخ سندھ کی پہلی جلد میں اس قبیلے کے متعلق لکھتے ہیں کہ "یہ نومسلم یہودی تھے"۔ مولانا کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے جیسا کہ امام بلاذری اپنی کتاب فتوح البلدان حصہ اول میں شام اور اردن کے واقعات میں السامرہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

---

[1] مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے، یہ لفظ جو عام طور پر سومرہ مشہور ہے وہ دراصل سامرہ ہے، اور سامرہ عراق کا مشہور شہر ہے۔ یہ لوگ وہیں سے آ کر آباد ہوئے اور قوت پا کر حاکم ہوئے۔

(بحوالہ تاریخ گجرات تصنیف سید ابو ظفر ندوی)

"السامرہ یہود ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو الدستان اور دوسری کو الکوشان"۔

واضح رہے کہ دوتانی اور کانسی کوشی افغان قبائل بلوچستان کی مغربی سرحد پر اب بھی موجود ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ جنوبی ہند بالخصوص ملابار میں بھی جلاوطن یہودی آباد ہو چکے تھے۔ ملابار کا راجہ عہدِ رسالت ؐ کے زمانے میں مسمی زمورن تھا جو یہودیوں کے قبیلہ سامری سے تھا۔ جب اس کو حضرت محمدؐ کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو اسلام قبول کر لیا اور سلطنت اپنے ولی عہد کو سپرد کر کے خود کشتی میں سوار ہو کر ملک عرب کی جانب روانہ ہوا لیکن راستے میں فوت ہو کر ساحل یمن میں مدفون ہوا۔ الغرض سومرہ یا سومرو کی نسبت سامرہ شہر جو اسرائیلیہ حکومت کا دارالسلطنت تھا، کو ہے اور نیز نسبی نسبت بھی، کیونکہ سامرہ تو صرف اسرائیلی ہی تھے۔ تاریخ سندھ کے مصنف مولانا اعجاز الحق قدوسی کا بیان ہے کہ:۔

سندھ میں سومروں کی حکومت ۴۴۴ھ مطابق ۱۰۵۲ء میں قائم ہو کر ۷۵۱ھ مطابق ۱۳۵۲ء یعنی تین سو آٹھ سال تک قائم رہی۔ ابن بطوطہ جو سندھ بھی آیا تھا اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سومرہ قوم کے حکمران سلاطین دہلی کے ماتحت حکمرانی کرتے تھے اور سلاطین دہلی کا ایک امیر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ:۔

دو روز کی مسافت کے بعد، ہم کشتی سے جنانی پہنچے، جو دریائے سندھ کے کنارے ایک خوبصورت اور بڑا شہر ہے اور جس میں خوش نما بازار ہیں، یہاں کے رہنے والے وہ لوگ ہیں جن کو سامرہ کہتے ہیں، ان کے اسلاف یہاں اس وقت آباد ہوئے جب حجاج کے زمانے میں سندھ فتح ہوا، جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے شیخ رکن الدین بن شیخ شمس الدین بن بہاءالدین زکریا قریشی نے مجھے خبر دی کہ ان کے جدِ اکبر محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے موقع پر حاضر تھے، اور یہ "سامرہ" اس لشکر کے ساتھ آئے تھے، جس کو حجاج بن یوسف نے اپنی امارت کے زمانے

میں عراق سے اس مقصد کے لئے بھیجا تھا" سیوستان کے تذکرے میں ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ :۔

اس شہر میں سامری امیر "اونار" نامی جس کا ذکر اوپر گزرا، اور امیر قیصر رومی رہتے ہیں اور یہ دونوں سلطان دہلی کے ماتحت ہیں اور ان دونوں سرداروں کے ساتھ اٹھارہ سو سوار تھے، یہاں ایک ہندو رہتا تھا جو حساب کتاب میں بڑا ماہر تھا، جس کا نام رتن تھا۔ وہ بعض امراء کے ساتھ سلطنت کے دربار میں گیا۔ سلطان نے اس کو پسند کیا اور اس کو "سندھ کا راجہ" کا خطاب دے کر سیوستان بھیجا۔ اور اس کو وہ جاگیر میں دے دیا جب وہ وہاں پہنچا تو "اونار" اور قیصر کو برا معلوم ہوا کہ ایک کافر کو ان پر فوقیت دی جائے۔ انہوں نے باہم مشورہ کر کے اس کو قتل کر دیا اور خزانہ لوٹ لیا۔ سب نے مل کر اونار کو ملک فیروز کا خطاب دے کر اپنا بادشاہ بنا دیا۔ پھر اونار یہ سمجھ کر کہ وہ اس وقت اپنے قبیلے سے دور ہے ڈرا اور اپنے قبیلے میں چلا گیا۔ لشکروں نے قیصر کو امیر بنا لیا۔ جب ملتان کے نائب کو خبر لگی تو اس نے اس کی سزا کے لئے فوج بھیجی اور سخت سزا دی۔"

سامرہ، سومرہ فرمانرواؤں کا آخری بادشاہ کا نام ہمیر یا ارمائل تھا۔ سمہ قبیلے اور سومرو میں نہایت ہی اتفاق و یگانگت تھی لیکن ارمائل کے ظلم و ستم کی وجہ سے دونوں قبیلوں کے تعلقات خراب ہونے شروع ہوئے اور اس کا آخری نتیجہ یہ تھا کہ سومرہ خاندان کے ہاتھ سے حکومت نکل کر سمہ خاندان میں منتقل ہو گئی۔ سمہ خاندان ایک سو چھتر برس کی حکمرانی کے بعد ۹۲۶ھ جام فیروز کے عہد میں شاہ بیگ ارغون تاتاری کے ہاتھوں اس کی حکومت ختم ہو گئی۔ سمہ خاندان جن کے اکابر جام کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کا تعلق بقول ان کے آباؤ اجداد (بروئے روایت ٹاڈ راجستھان) شام سے ہے اور ان کی اس نسبت سے ان کا مراد شام کے اسرائیلی جلاوطنوں

کی اولاد ظاہر ہوتا ہے کیونکہ شامی تو صرف وہی لوگ تھے اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے نام سمہ، سمو، شمو، افغانوں میں موجود ہیں اور یہ نام پہلے سے شام میں بھی تھے مثلاً حضرت داؤدؑ کے ایک بھائی کا نام سمہ ہے۔ اور نیز اس کے باپ کو افراتی سے یاد کیا گیا ہے۔ اس بارے میں کتاب مقدس صفحہ ۲۷۶ اردو ترجمہ بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور۔ ۱۔ اسموئیل میں باب ۱۷ اور آیت ۱۲ میں یوں درج ہے کہ:۔

"داؤد بیت الحم یہودا کے اُس افراتی[1] مرد کا بیٹا تھا جس کا نام یسی تھا۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے اور وہ ساؤل کے زمانہ کے لوگوں کے درمیان بڈھا اور عمر رسیدہ تھا اور یسی کے تین بڑے بیٹے ساؤل کے پیچھے پیچھے جنگ میں گئے تھے۔ اس کے تینوں بیٹوں کے نام جو جنگ میں گئے تھے یہ تھے۔ الیاب جو پہلوٹا تھا دوسرا ابیناداب اور تیسرا سمہ۔ داؤد سب سے چھوٹا تھا۔"

غالب قیاس یہ ہے کہ یہی سمہ لوگ حضرت داؤدؑ کے بھائی "سمہ" کے نام سے موسوم ہوئے اور یہ انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ اس کے برعکس ایک اور عرب قبیلہ بنو سامہ ہے جو ملتان میں حکمران رہا تھا۔ ان کا سندھ کے اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو عرب قریش تھے۔ یہ لوگ ملتان سے لاہور کی طرف پنجاب میں منتقل ہو کر جگہ بجگہ آباد ہوئے اور ارائیں کے نام سے شہرت پائی۔

مصنّف آئینہ حقیقت نما مسعودی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ:۔

"۳۰۳ھ ملتان کے اندر بنو سامہ بن لوئی بن غالب کی حکومت تھی یسلمہ بن لوئی بن غالب قبیلہ قریش کا وہ شخص تھا جس نے آنحضرتؐ کی ولادت سے پہلے بحرِ عمان کے ساحل پر اقامت اختیار کر لی تھی اسی شخص کی نسل سے ملتان کا فرمانروا تھا۔"

---

[1] عبرانیوں کے ہاں بہادر کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا تھا جیسا کہ پٹھانوں کے محاورہ میں بھی یہ لفظ کبھی کبھی بہادر کے لئے بولا جاتا ہے۔ افریدی یا آفریدی افغانوں کا ایک بہادر قبیلہ بھی ہے۔

لنگاہ خاندان

معلوم رہے کہ سندھ میں سمہ خاندان کے بعد جب ارغون اور ترخان کے تاتاری خاندان ختم ہوا تو کلہوڑہ خاندان جو عرب نسل سے ہیں برسر اقتدار آیا تو ان کے بعد تالپور خاندان برسر اقتدار آیا جو نسلاً بلوچی ہے ان کا لقب میر تھا جو میران سندھ سے مشہور ہیں۔ واضح رہے کہ قبیلہ سمہ یا جام کی طرح ایک اور افغان قبیلہ لنگا سندھ اور ملتان میں حکمران تھا جیسا کہ تاریخ فرشتہ میں ذکر ہے کہ:۔

"لنگا افغان:۔ ملتان پر رائے سہرہ جو جماعت افغانان لنگاہ کا سردار تھا حکومت بنائی۔ اور سولہ برس حکومت کرنے کے بعد ۸۷۴ھ میں وفات پائی۔"

واضح ہو کہ رائے سہرہ علاقہ سیوی کا حاکم تھا۔[1] لنگاہ خاندان کے متعلق تاریخ "آئینہ ملتان" میں درج ہے کہ:۔

سندھ سے آکر اچانک حملہ کر کے رائے سہرا نے قطب الدین لنگاہ کے لقب سے ملتان میں لنگاہ عملداری کی بنیاد رکھی اور چینوٹ، شور کوٹ کو فتح کر کے ولایتِ ملتان کو وسعت دی اور ۱۴۶۹ء تک کامیاب حکومت کی، ۱۴۷۰ء میں اس کے بیٹے سلطان حسین لنگاہ (افغان) نے مملکت ملتان کی عنانِ اقدار سنبھالی۔ شاہانِ ملتان میں سلطان حسین لنگاہ بڑا ذی علم بادشاہ تھا۔ وہ صرف علم دوست ہی نہ تھا بلکہ وہ مدبّر اور علم پرور بھی تھا۔ اس نے ترویجِ علم کے لئے ملتان میں جگہ جگہ مدرسے کھلوائے، نامور علما کو بڑے بڑے وظائف پر درس و تدریس کے لئے مقرر کیا۔ اس کے وقت میں ملتان میں پہلی بار یونیورسٹی قائم ہوئی جو قلعہ کہنہ پر اس جگہ موجود تھی

---

[1] رائے سہرہ لنگا پہلا حکمران تھا جس نے ایران سے مکران کی حد بندی کرائی تھی۔ (بحوالہ بلوچی تاریخ)

جہاں انگریزوں نے اپنی فتح کا مینار بنایا۔ ملتان کے علمی دور کی تاریخ میں سلطان حسین سرِفہرست ہے۔ اس نے ملتان پر تیئیس سال حکومت کی۔ ویسے اس خاندان کی ملتان پر ستر سال حکومت رہی۔ سندھ کے علاقہ میں بلوچ قبائل کو اس نے آباد کیا تھا؛

مولانا ابو الحسنات ندوی لکھتے ہیں کہ

سلاطین ملتان میں سے حسین خان لنگاہ علوم و فنون کا بہت بڑا مربی تھا۔ مصنفین اور ارباب فضل و کمال کا سرپرست اور مددگار تھا۔ ہمیشہ مالی امداد اور مناسب وظائف سے ان کی ہمت افزائی و قدر کیا کرتا تھا۔ جس کے باعث اس کی حدود سلطنت میں فضلاً اور ارباب علم و فن کی بڑی کثرت و جمعیت ہوگئی تھی اور ملتان علمی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کی حکومتوں میں ممتاز ہوگیا تھا۔ بحوالہ آئینہ ملتان ص ۹۹

ایک اور افغان قبیلہ جسے حضرت سلیمان کا تعلقدار بتاتے ہوئے مصنف تحفۃ الکرام صفحہ ۹۴ پر لکھتا ہے کہ :۔

لولا : لودھ قوم جسے لولاھی کہا جاتا ہے تسخیر سندھ کے وقت عربوں کے ساتھ یہاں (سندھ میں) آباد ہوئی۔



پنجاب کے علاقہ چھچھ میں افغان

قطع نظر اُن افراد یا خاندانوں کے جنھوں نے سرحدی افغانی علاقہ سے نکل کر ہندوستان میں اپنی ریاستیں قائم کیں۔ یا وہاں سکونت پذیر ہوئے، ایک بڑی تعداد خان گجو کے وقت اور پھر مصری خان سالار زئی اور بہاکو خان خدو خیل کی قیادت کے زمانے میں دریائے سندھ کو عبور کر کے علاقہ چھچھ میں جا مقیم ہوئے اور ان کے ناموں کی نسبت سے آبادیاں ظہور میں آئیں اور اس وقت تک علاقہ چھچھ میں افغان مالکانہ حیثیت سے بیشتر حصہ پہ آباد نظر آتے ہیں۔ علاقہ کے صاحب ثروت، تاجر پیشہ، زمیندار اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر سرفراز افراد کی اکثریت انہی افغان خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے۔

چھچھ کا علاقہ مقام اٹک سے دریائے سندھ کے مشرق کی طرف اور تحصیل صوابی کے بالکل مقابل جنوب میں ہے۔ یہ علاقہ چوراسی دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ اس کے نام کی نسبت کا وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مؤرخین اپنے اپنے خیال کے مطابق اسے کسی کے ساتھ منسوب کر دیتے ہیں البتہ گزیٹیر راولپنڈی ۱۸۶۵ء میں ایک انگریز افسر کرنل کریکرافٹ نے اس کی جو وجہ تسمیہ بیان کی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور معتبر بھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ چھچھ کا لفظ اصل میں پشتو کا لفظ "چَھج" ہے۔ یوسفزیوں نے یہاں آکر یہ نام اس علاقہ کو دیا۔ "چھج"[1] پشتو میں ہاتھ کی بنی ہوئی ایک ایسی چیز کو کہتے ہیں۔ جس سے اناج صاف کیا جاتا ہے۔ اور اس کے تین کنارے محفوظ اور ایک ڈھلان کی شکل کا ہوتا ہے ہو بہو یہ شکل علاقہ چھچھ کی بھی ہے بعد میں یہ لفظ

---

[1] چھج یعنی غلہ پھٹکنے کا آلہ۔ پنجابی میں بھی یہ لفظ چھاج یا چھج موجود ہے۔ اردو میں سوپ فارسی میں غلہ افشاں اور عربی میں مِنسف یا مُنفض کہتے ہیں۔ شکل سب کی یکساں ہوتی ہے۔

"چھچھ" سے چھچھ بن گیا۔ کرنل کریکرافٹ مزید لکھتا ہے کہ:۔[1]

"چھچھ کے علاقہ میں گنجان آبادی یوسفزئی پٹھانوں کی ہے اور مالکوں میں اکثریت بھی یوسفزئی پٹھانوں کی ہے جو اعلیٰ درجہ کے کاشتکار ہیں۔ افغان جو پٹھان کہلاتے ہیں چھچھ کی وادی اور برہان میں آباد ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد نے دلازاک کو یہاں سے باہر نکال دیا تھا اور خود آباد ہو گئے تھے۔ دلازاک کے بقایا کچھ گھرانے دو یا تین گاؤں میں اب بھی موجود ہیں۔ یہ پٹھان اچھی نسل اور بہترین قسم کے کاشتکار ہیں۔ آپس میں پشتو بولتے ہیں اور ملک کی زبان پنجابی سے ناآشنا ہیں۔ ان کے بہت سے قبیلے ہیں مثلاً سرکانی، متنی، علی زئی، وردگ، غرغشت[2] وغیرہ ان کے خاندان آخر لفظ زئی یا خیل سے معلوم ہوتے ہیں۔ علی زئی علاقہ برہان اور حضرو میں اور ساغری مکھڈ میں آباد ہیں۔ چھچھ اور برہان کے معزز اشخاص یہ ہیں۔ لطیف خان عمرزئی سکنہ ملک مالہ، میر عالم خان غرغشتی، نادر خان علی زئی سکنہ سروانہ، بوستان خان وردگ سکنہ نطوفہ، شیر محمد خان اور فیروز خان علی زئی سکنہ برہان۔ پٹھانوں کی آبادی پر مشتمل علاقہ چھچھ میں ۵۶ گاؤں برہان میں ۹ اور مکھڈ میں ۷ گاؤں ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر دیہات میں بھی حصہ دار ہیں اور سرکار کو ۱۵۱۶۸ روپیہ سالانہ مالیہ ادا کرتے ہیں۔"

---

[1] اس سلسلے میں کرنل کریکرافٹ کی مزید تحقیق و تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ حافظ رحمت خانی، حصہ حواشی مرتبہ خان روشن خان۔

[2] چھچھ میں موضع غرغشتی کے شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین بن بہاؤ الدین بن سعاد الدین بن شیخ موسیٰ بن اخون بشارت از قبیلہ کاکڑ غرغشتی افغان ہیں۔

ان کے علاوہ علاقہ چھچھ میں مندرجہ ذیل افغان قبائل بھی آباد ہیں مثلاً سید خیل، لنوزئی، ماموزئی، بڑیس، مرکی خیل، عمرزئی، ببوتی، مایار، میانہ، برہ زئی، سروانی، نگوانی، شیرانی، پیرزئی، عدل زئی، فرملی، خورہ خیل وغیرہ۔ ان سب قبائل کی شاخیں اور ہم نسل لوگ انہی ناموں سے دریائے سندھ سے مغرب کی طرف علاقہ یوسفزئی کے سمہ (ضلع مردان) بونیر، سوات اور دیرہ باجوڑ میں بھی آباد ہیں۔ قبائل فرملی اور غرغشتی چھچھ آنے سے قبل علاقہ یوسفزئی کے تپہ رزڑ موضع فرملی نزد شیوا اور تپہ خودو خیل کے موضع غرغشتی نزد طوطالی میں آباد ہو چکے تھے وہ گاؤں جس میں یہ لوگ نہیں ہیں پھر بھی اب تک انہیں کے ناموں سے موسوم ہیں۔

الیف اے رابرٹسن علاقہ چھچھ کے بندوبست کے بارے میں گزٹیر راولپنڈی ۱۸۸۵ء میں یوں اظہار خیال کرتا ہے:۔

"پٹھانوں کا بندوبست دو حصوں پر مشتمل ہے ایک ضلع کے شمال مغربی کونے پر تحصیل پنڈی گھیب میں مکھڈ کے آس پاس جو ساغری پٹھان (بلاق خٹک) کہلاتے ہیں۔ دوسرا تحصیل اٹک علاقہ چھچھ میں یوسفزئی آباد ہیں۔ جو پشاور ضلع کی تحصیل صوابی سے دریائے سندھ کی مخالف سمت میں واقع ہے۔ پٹھانوں کے ان دونوں علاقوں کے درمیان، دریائے سندھ کے کنارے پر کھنڈ اور قطب شاہی آوان آباد ہیں۔ چھچھ اور سرہان کے علاقہ کا پٹھان آپس میں مل جل کر ایک قبیلہ چلا آرہا ہے۔ وہ عموماً بہت ہی عمدہ کاشتکار ہیں۔ اور دریائے سندھ کے پار اپنی برادری سے مختلف نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان میں کوئی مختلف خاندان بنے ہیں۔ اس وقت کے مشہور خوانین تحصیل اٹک میں

حسب ذیل ہیں: میر عالم خان سکنہ غورغشتی، آصف خان سکنہ ملک مالہ، امیر خان سکنہ ولیسہ، علی اکبر خان سکنہ یاسین، اکبر خان سکنہ برہان اور غزن خان پٹھان جو اپنی وفاداری کے لئے مشہور رہے۔ اور جس نے قضیہ پٹنہ ستارہ کے سلسلہ میں بہترین خدمات انجام دیں۔ جس کے صلہ میں تحصیل کھوٹہ میں انہیں ایک اچھی ریاست ملی ہے۔"

چھچھ کے موضع غورغشتی میں سیدو خیل، عنایت خیل، ساہل خیل، کاکڑ، مٹھ خیل اسحاق زئی، سرما خیل وغیرہ آباد ہیں۔ کنج پورہ ریاست (جس کا ذکر احمد شاہ ابدالی اور مرہٹہ جنگ میں ہو چکا ہے[۱]) کی سربراہی سرما خیل غورغشتی کے پاس تھی۔

اوپر کے بیانات سے اس امر کی تصدیق تو ہو جاتی ہے کہ یوسفزئی وقتاً فوقتاً دیر سوات، بونیر اور سمہ علاقہ یوسفزئی سے نقل مکانی کر کے اپنے اپنے خاندانوں سے جدا ہو کر علاقہ چھچھ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ انگریز کے اس علاقے پر قابض ہونے سے قبل کے مکمل حالات باوجود سخت جستجو کے نہیں مل سکے جن پر کچھ روشنی ڈالی جاتی۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ یہ لوگ اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ مصروف جنگ و جدل رہے اور بربریت کے جو مظاہرے بونیر سوات اور صوبہ سرحد کے افغانوں پر مغل، سکھ اور انگریز حکمرانوں کی طرف سے ہوتے رہے ان میں پہلا نشانہ یہی بنتے رہے۔

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، تواریخ حافظ رحمت خانی۔ حصہ حواشی مرتبہ روشن خان۔

گگی زئی یا کرکانڑی — ترکانڑی، افغان اور پنجاب

بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت ملک احمد یوسفزیوں کو لے کر افغانستان سے نکلے تو ترکانڑی لمغان میں مقیم رہے۔ جہاں ان کی اپنی ریاست تھی۔ کچھ عرصہ بعد حکومت مغلیہ کابل سے ان کی کش مکش ہوئی تو وہاں سے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔ اس وقت یوسفزئی دوآبہ اشنغر، سوات، دیر اور باجوڑ پر قابض ہو چکے تھے۔ ترکانڑیوں نے خان گجو سے پناہ دینے کی درخواست کی تو ان کو باجوڑ میں مقیم ہونے کی اجازت ملی۔ یوسفزیوں کے ساتھ ان کے تعلقات ابتدا ہی سے خوشگوار تھے اور یہاں آنے پر آپس میں ایسے گھل مل گئے کہ دونوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ ترکانڑی دو حصوں میں منقسم ہیں یعنی ترک کے دو بیٹے تھے۔ ایک موسیٰ دوسرا شعیب۔

موسیٰ کی اولاد:

(۱) محمود (لوئے ماموند) (۲) اسمٰعیل (اسمٰعیل زئی۔ اس کی چار ذیلی شاخیں ہیں۔ وڑوکے ماموند، نون، اکا اور کٹور) (۳) حسن (۴) عیسیٰ (ایسوزئی) (۵) مدے جس کے بیٹے خواجے، معروف اور الیاس ہیں (۶) ہارون (۷) مئوز۔

باجوڑ میں مقیم ہوتے وقت اسمٰعیل زئی کے چند گھرانے جو کٹور کہلاتے تھے بدخشاں اور چترال[1] کی طرف اور 'نون' پنجاب کی طرف چلے گئے تھے اور گگے زئی جو لوئے ماموند کی ایک شاخ ہے، اس کے اکثر لوگ پنجاب میں جالندھر، لاہور

---

[1] ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق چترال کی آبادی ایک لاکھ اٹھ ہزار تھی۔ جس میں پختون قوم کی آبادی قریب ۹ فی صد ہے۔

گوجرانوالہ بٹالہ اور سیالکوٹ کی طرف گئے اور وہاں مقیم ہوئے ۔ الیوزئی کی ذیلی شاخیں یہ ہیں: مست خیل، علی بی خیل، موسیٰ خیل، شاہی خیل، مندے زئی، اور سین زئی، اور ان میں شاخ مست خیل سے خان عمرا خان جندولی متعلق تھا ۔ اور الیوزئی کی ذیلی شاخ موسیٰ خیل سے میاں عمر صاحب چمکنی متعلق ہیں ۔

شعیب کی اولاد :۔

یہ افغانستان میں ہی رہ گئے تھے ۔ اور ابھی تک رہیں مقیم ہیں اور لمغان میں سرہ قلعہ اور علاقہ سہ صدہ و نیز سرخ رود و ننگرہار کے مختلف مقامات میں آباد ہیں۔

چونکہ ترکانڑیوں کا شجرہ نسب آج تک کوئی مورخ بھی مرتب نہیں کرسکا تھا ۔ جس سے میری راہنمائی ہوتی لہٰذا مجھے اسے مرتب کرنے میں کافی تگ و دو اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ان علاقوں میں مجھے کئی بار جانا پڑا جہاں یہ قبیلے آباد ہیں ۔ چنانچہ کچھ وہاں کے معمرترین افراد کی مدد سے اور کچھ تاریخ ابراہیم بٹنی کے قلمی نسخہ سے جو مجھے میسر آیا ان کے شجرہ ہائے نسب مرتب کئے ۔ جو آنے والی نسلوں اور پڑھنے والوں کے لئے ضرور دلچسپی کا باعث ہوں گے [1]

روڈباری

قبیلہ ترکانی کے پڑوس میں، مشرق کی طرف یوسف زئی کے ساتھ جندول وغیرہ علاقہ ہائے دیر میں ان کے عزیزوں کا ایک اور افغان قبیلہ "روڈباری" آباد ہے جو اگرچہ تعداد میں کم ہے ۔ اس کی چار ذیلی شاخیں ہیں جو یہ ہیں ۔

---

[1] ترکانڑیوں کے شجرہ نسب کے لئے ملاحظہ ہو تواریخ حافظ رحمت خانی اشاعت ۱۹۷۷ء مرتبہ [illegible] خان، حواشی

وزیر خیل، پاپنی، کوت والان، اور دلزاک ۔

واضح ہو کہ یہ پاپنی اور دلزاک خشی قبائل میں سے اور رودباری ہیں اور وہ دلزاک جن کی یوسف زئیوں سے جنگیں ہوئی ہیں اور وہ پاپنی جو اخون درویزہ کے ہم قوم ہیں وہ الگ ہیں اُن سے قبیلہ رودباری کا کوئی تعلق نہیں ۔ یہ رودباری ملک احمد کی دعوت پر شیخ ملی کے ذریعہ کُنٹر اور ننگرہار سے دلزاک کے خلاف جنگ کاٹلنگ میں شمولیت کے لئے آئے تھے یوسفزئی کو فتح حاصل ہونے کے بعد ان کو قبیلہ ملی زئی کے ساتھ تقسیم میں شیخ ملی نے حصہ دیا تھا اور اس وقت بھی وہ ملی زئی کے ساتھ علاقہ دیر میں جگہ بہ جگہ مالکانہ حیثیت سے سکونت پذیر ہیں ۔ یہ ایک پختون قبیلہ ہے جس کی رہائش نیشکے اور دریائے ہلمند کے جنوبی کنارے پر " رودبار " نامی ایک قصبہ میں تھی یہ قصبہ یوسف زئی کے متصل ساتھ ہی جنوب میں واقع تھا ۔ یہ لوگ نسلاً خشی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جب خشی قبائل وہاں سے کابل کی طرف جلاوطنی پر مجبور ہوئے تو سب خشی قبائل وہاں سے نکل گئے جن میں رودبار نامی قصبہ کے رہنے والے لوگ جو بعد میں اس قصبہ میں سکونت کے سبب رودباری کے عرف سے مشہور ہوئے، بھی شامل تھے ۔ کابل کی طرف آنے کے بعد یہ لوگ موجودہ افغانستان کے علاقہ لمغان و ننگرہار وغیرہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ۔ بعد میں وہاں سے ملک احمد اور شیخ ملی کے بُلانے پر جنگ کاٹلنگ میں شریک ہوئے اور فتح کے بعد یہیں رہنا پسند کیا ہوگا ۔ صحیح طور تو معلوم نہیں کہ یہ خشی کے تینوں قبیلوں یعنی یوسف زئی، گگیانی اور ترکانی میں سے کسی قبیلہ سے متعلق ہیں مگر غالب قیاس یہ ہے کہ رودباری لوگ قبیلہ ترکانی میں اولادِ شعیب میں سے ہیں جو اس وقت تک وہ دریائے

گنڑ سے مغرب کی طرف افغانستان میں آباد ہیں۔ قرائن سے ظاہر ہے کہ علاقہ قندھار سے جلا وطنی کے بعد رود باری لوگوں کی سکونت افغانستان میں اِن ترکانیوں کے ساتھ تھی اور انہیں کے ساتھ قرابت تھی اور وہیں سے کاٹلنگ میں آئے تھے۔ (زرود بار کے لئے ملاحظہ ہو نقشہ خلافت مشرقی ۱ مشمولہ کتاب ہذا)۔ بر صـ ۴۲۹

قبیلہ گگی زئی پنجاب میں

یہ تاریخ کی بڑی ستم ظریفی ہے کہ جس قبیلہ کو سابق متحدہ پنجاب کی حکومت نے ۱۸۸۱ء میں جرائم پیشہ قرار دیا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے بعد اسی قبیلہ کے افراد اسی سرزمین پنجاب پر گورنر جنرل، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور مرکزی وصوبائی حکومتوں کی وزارت قانون کے مالک رہے ہیں[1]۔ میرے خیال میں یہ تاریخ کے صفحات پر عجائبات عالم میں سے شمار کیا جائے گا۔

معلوم رہے کہ ایک قوم جو افغان قبیلہ ترکلانی، ترکانی (ترکانڑی) جو شیخے سے اور قبیلہ یوسفزئی وگگیانی کی برادری سے تعلق رکھتی ہے، کی ذیلی شاخ لوئے ماموند کے نام سے علاقہ باجوڑ میں موجود ہے۔ جو کہ سات ذیلی شاخوں پر منقسم ہے۔ بڑوزئی، گگی زئی، اریازئی، سالار زئی، برم کازئی، علوزئی اور بدل زئی۔

گگی زئی پنجاب والے اسی لوئے ماموند کے لوگ ہیں۔ گگی زئی کی اولاد پانچ ذیلی شاخوں پر موسوم ہیں۔ مسعود خیل، ایسف خیل، عمر خیل، سلیمان خیل، اور بادین خیل اور اِس وقت بھی یہ لوگ باجوڑ میں انہی ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں اور موجود ہیں۔

قبیلہ ترکانڑی کی باجوڑ سے جانب مغرب، علاقہ لمغان افغانستان میں

---

[1] مثلاً چیف جسٹس محمد منیر، غلام محمد گورنر جنرل، شیخ رشید وزیر قانون وغیرہ

۱۵۰۸ء کے آغاز تک اپنی ریاست تھی جو مغل حکمران کے ہاتھوں برباد ہوگئی اور ان لوگوں نے خان گجو کے عہد میں علاقہ یوسفزئی تپہ باجوڑ میں آکر پناہ حاصل کی اور یوسفزیوں نے باجوڑ میں کافی علاقہ اپنی خوشی سے ان کو امداد کے طور پہ حوالہ کیا تھا۔ تاریخ کے اس متذکرہ عہد میں وادیٔ جندول کے جنوبی سرے پر رودبار' باجوڑ کے عین جنوبی کنارے پہ واقع ایک پہاڑی نشیبی درہ کلالہ میں قبیلہ ماموند کی ذیلی شاخ ککی زئی کے لوگ آباد تھے[۱] اور اسی مقام کی نسبت سے یہ لوگ کلالہ کے نام سے بھی موسوم ہوئے تھے اور باجوڑ سے نکل کر پشاور میں بھی رہے ہیں اور یہاں بھی کلالہ یا کلال (ککی زئی) کے نام سے مشہور ہیں۔ واضح رہے کہ کلال ایک اسرائیلی نام ہے۔ جس کا ذکر کتاب مقدس میں اجنبی عورتوں کو چھوڑنے کے بارے میں ہوا ہے۔

تواریخ حافظ رحمت خانی میں لکھا ہے کہ (قریب ۱۵۰۸ء میں) جب قبیلہ یوسف زئی بہ سرکردگی ملک احمد باجوڑ میں دلازاک سے نبرد آزما تھے۔ اور دلازاک اور یوسف زئی کا سخت مقابلہ تھا۔ تو ملک سرخابی بن شموتر کلانی جو اس وقت قبیلہ کا ایک نامور سردار تھا۔ اپنا لشکر لے کر لمغان سے یوسفزیوں کی امداد کے لئے پہنچا اور ہیبو سردار دلازاک کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ سمجھ سکا۔ بالآخر نوبت بجنگ رسید' قریب تھا کہ یوسف زئی شکست کھائے لیکن ملک سرخابی بن شمو نے اپنے لشکر کو للکارا جس کے نتیجے میں ہیبو کو پائندہ تر کلانی ککی زئی نے تلوار سے مارا اور برہان تر کلانی ککی زئی نے ہیبو کے بھائی جہان شاہ کی گردن ماری اور سر تن سے الگ کر دیا۔ مختصر یہ کہ دلازاک قوم کے دونوں سردار ہیبو اور جہان شاہ ککی زئیوں کے ہاتھوں

---

[۱] کلالہ ایک قصبہ تھا جو لمغان میں دریائے کابل کے کنارے پہ مقام جگ دلے سے مشرق میں اور کابل سے باجوڑ کے راستہ پر واقع تھا اور ککا زئی کا مسکن تھا۔

مارے گئے۔ اور دلازاک کا لشکر شکست کھا کر بھاگنے پر مجبور ہوا۔ گگی زئی سردار اور ملک سرخابی سالارزئی اپنے لشکر سمیت سارا علاقہ باجوڑ یوسفزئی کے قبضہ میں دے کر لمغان واپس چلے گئے۔ اور جاتے وقت یوسفزئی ملکان کو کہہ گئے کہ یہ ملکِ باجوڑ تمہارے لئے فتح کیا اس پر اب اطمینان سے رہو ہم اپنے وطن واپس جا رہے ہیں۔ ملک سرخابی کی وفات کے بعد سربراہ قبیلہ اس کا بھائی مٹہ نامزد ہوا اور غوریا خیل کی جنگ میں وہ دو سو گھوڑ سواروں سمیت یوسفزیوں کی امداد کے لئے بمقام شیخ تپور' خان گجو کے پاس آیا تھا اور اس نے جنگ میں بہت اخلاص اور بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ خان گجو حکمران خشی نے ترکانڑیوں کے اخلاص اور بہادری کی بہت تعریف کی ہے۔

ملک کشمیر

شاہ میر کے خاندان کی سلطنت زائل ہونے پر کشمیر ۱۹۰ برس مغل اقتدار میں رہنے کے بعد احمد شاہ ابدالی کے تصرف میں آیا اور ۶۸ برس تک افغانوں کے تصرف میں رہنے کے بعد ماہ رمضان ۱۲۳۴ھ میں سکھوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اور پھر ۱۲۶۲ھ کو انگریزوں کے تصرف میں آیا۔ اور انگریزوں نے اسے گلاب سنگھ ڈوگرا کے حوالہ کیا اور اس سے کچھ حصہ یعنی ضلع ہزارہ کے بالائی حصہ کو اپنے پاس رکھ لیا۔

شاہ میر کے زمانے میں یہاں بٹ اور چک قبیلے آباد ہوئے تھے جو نسلاً سواتی افغان اور شاہ میر کے ہم قوم تھے۔ جن کی نسبت سے اب بھی سوات میں بٹخیلہ اور چکدرہ کے نام سے دو بڑے گاؤں موسوم اور معروف ہیں۔

اسی طرح احمد شاہ ابدالی کے دور میں قبیلہ صدوزئی افغان جو علاقہ کشمیر میں صدن کے نام سے مشہور ہیں، آباد ہو گئے۔ اب بھی یہ صدن یعنی صدوزئی

ترین، مواضعات رولکوٹ، بجری، اجیرہ، بانغ، تراڑ خیل، پلندری، اور پونچھ وغیرہ میں سکونت رکھتے ہیں۔ ویسے تمام کشمیر میں پٹھان جگہ جگہ آباد ہیں۔

اسی طرح کشمیر کے مغرب میں متصل ضلع ہزارہ میں بھی پٹھان آباد ہیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ تحصیل ہری پور میں یوسف زئی کی ذیلی شاخ اتمان زئی، ← طاہر خیـ ترین، کاکڑ، پنی، شلمانی، اور مشوانی آباد ہیں۔ اور تحصیل ایبٹ آباد میں جدون یا گدون آباد ہیں اور تحصیل مانسہرہ میں سواتی پٹھان قبائل آباد ہیں۔ سواتی اور مشوانی اب بھی اپنی پشتو زبان میں بات چیت کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور لوگوں نے اپنی پشتو زبان کو چھوڑ کر پنجابی یا ہندکو زبان کا استعمال کرنا شروع کیا۔ علاقہ چھچھ میں بلکہ مرگلہ پہاڑ تک بھی اکثر یوسفزئی پٹھان آباد ہیں اور مکڈھ میں بلاق خٹک آباد ہیں جن کی زبان اب بھی پشتو ہے مگر چھچھ میں بعض جگہ پشتو کا استعمال کم ہوتا جا رہا ہے۔ اپنی مادری پشتو زبان چھوڑنے پر سخت افسوس ہے جو قومی زوال کی نشانی ہے۔

گدون

یہ عبرانی نام ہے۔ یہ قبیلہ اس وقت تحصیل صوابی اور ایبٹ آباد میں سکونت پذیر ہے۔ واضح ہو کہ گدون عبرانی لفظ گدعون سے ماخوذ ہے اور جدون عربی لفظ جدعون سے، جو ایک افغان قبیلہ کے جدِّ اعلیٰ کے ایک ہی نام کے دو مختلف تلفظ ہیں۔ دورِ قضاۃ میں گدعون ایک مشہور نبی گزرے ہیں۔ جن کی اولاد اِس وقت ان کی نسبت سے گدون یا جدون کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ قاضیوں کی کتاب باب ۶۔ آیت ۱۳ کے مطابق گدعون بنی اسرائیل کے پہلے قاضی تھے۔

واضح ہو کہ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جس میں بنی اسرائیل کو دشمنوں کے

طرف سے حملوں اور قسم قسم کی زیادتیوں سے پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

آخر جدعون (جدون) نامی ایک سردار اُن میں پیدا ہوا جس نے بنی اسرائیل کی قوت کو مجتمع کیا اور صرف تین سو منتخب، آدمیوں کو لے کر اس نے اہل مدین پر شبخون مارا، رات کی تاریکی میں دوست و دشمن کی تمیز نہ ہوئی ایک لاکھ بیس ہزار اہل مدین خود اپنوں اور دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ عوریب اور ذیب نامی مدین کے دو بادشاہ قید ہوئے جن کو نہایت ذلت سے قتل کیا گیا اور دو بادشاہ زاباح اور صلمناع پندرہ ہزار آدمیوں کے ساتھ بھاگ نکلے لیکن ان کو پناہ نہ مل سکی۔ (تاریخ ارض القرآن جلد دوم صث)

ضلع ہزارہ کے بارے میں کیرو لکھتا ہے:

"وسطی اور زیریں ہزارہ کے کچھ لوگ پٹھان ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگوں نے جن میں یوسف زئی، جدون اور ترین بھی شامل ہیں شمالی پنجاب کے طور طریقے اور زبان اپنائی ہے... کلابٹ اور تربیلہ کے لوگ یوسف زئی نسل کے اعتبار سے کھرے پٹھان ہیں لیکن غیر پختون قبائل کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ بھی اپنی زبان بھول گئے اور ان کی پختون ولی میں پہلی سی شدت نہیں رہی۔ البتہ ابھی تک مشوانیوں کا ہمسایہ قبیلہ موجود ہے جس نے ہری سنگھ کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ یہ لوگ کھرے پٹھان ہیں اور دریائے سندھ اور وادی ہزارہ کے درمیان گنگھر کی پہاڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان کا مرکزی دیہات کا ایک جھرمٹ ہے جو سری کوٹ کہلاتا ہے۔ یہ جگہ پہاڑیوں کے

اندر محفوظ علاقہ میں واقع ہے۔ یہاں مشوانیوں نے پٹھانوں کے رہن سہن کے دلچسپ طریقے برقرار رکھے ہیں۔ وہ قرن اور صدیاں گزر جانے پر بھی نہیں بدلے۔"

مشوانی :۔ یہ افغانوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ یوسف زئی جب موجودہ افغانستان میں مقیم تھے تو اُن سے اچھے تعلقات قائم تھے۔ ان کے اکثر خاندان والے افغانستان سے نکل کر یوسف زئی کے ہاں پہنچے تھے اور ملک گیری میں وہ یوسف زئی کے ساتھ شریک تھے اور کارہائے نمایاں سرانجام دیئے تھے۔ ملک فتح کرنے کے بعد ان کو شیخ ملی کی تقسیم اراضی میں حصص ملے تھے، جس پر وہ اب تک آباد ہیں۔ آدم خان جو شیخ بنوری کے نام سے مشہور ہوا، اسی قبیلہ سے تھا۔ مشوانی ایک جغرافیائی نام ہے۔ شام سے جلاوطنی کے بعد یہ لوگ آرمینیہ کے موش نامی شہر سے جبیل وان تک کے علاقہ میں جو مشرقی فرات کے جنوب اور قبیلہ برلیس کے شمال مغرب میں واقع تھا، آباد تھے جس کی نسبت سے یہ لوگ موش وانی یا مشوانی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ (دیکھو نقشہ صد ۴۲۵، کتاب ہذا)

سوات :۔ مترجم دوارکا پرشاد لکھنوی نے لکھا ہے :

"کھیرلی گڑھ کی سیہات قوم ایک شمالی قوم ہے۔ گو مورخانِ حال اس کے حالات سے بالکل لاعلم ہیں مگر بھٹی قوم کی تاریخ میں ان مقبوضات کا بارہا ذکر آیا ہے، جو انھوں نے دریائے ہفیس (دریائے سوات) کے دونوں ساحلوں پر وسیع کیے تھے۔ اس قوم کی سکونت (موجودہ) سواد میں تھی، جو صوبہ اشنغر کی ایک قسمت (یعنی ضلع) ہے اور جہاں سکندر کے عہد کی قوم اساکانی بود و باش رکھتی تھی۔ قوم سیہات جس نے کھمان والی چتوڑ کی اعانت کی تھی۔ غالباً اس اساکینی فرقے ہی کی ایک شاخ ہے جس نے سکندر سے مقابلہ کیا تھا۔" (ٹاڈ راجستان، جلد اول ص ۴۸۱-۴۸۲)

سواتی پٹھان :۔ سوات کے قدیم باشندے ہندو تھے جو سوہات کے نام سے مشہور تھے۔ پہلے زمانے میں اس خطے کو پٹھانوں نے فتح کیا (جن کو اب سواتی پٹھان کہتے ہیں) اور ریاست بنایا۔ ایک عرصے کے بعد یوسف زئیوں نے ان پٹھانوں کو اس خطے سے خارج کر دیا (تاریخ ہندوستان، صد ۸۵۹)

سواتی پٹھان کسی ایک خاندان یا قبیلے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ یہ کئی افغان قبیلے تھے جو محمد غوری کے ساتھ آئے تھے اور سوات میں آباد ہو گئے تھے۔ بعد میں باہر کے لوگ انہیں الگ الگ قبیلوں کے نام سے پکارنے کے بجائے سوات سے وطنی نسبت کی وجہ سے سواتی پٹھان کہنے لگے۔ ان لوگوں نے سلطان شہاب الدین محمد غوری کے عہد میں اس کے حکم سے سوات اور باجوڑ کی راہ لی تھی۔ اور وہاں سے قدیم باشندوں کو جو کافر تھے نکال کر اس علاقہ پر قابض ہو گئے اور قریب چار سو سال تک یہاں قابض رہے اور پھر ان میں سے ایک بزرگ شاہ میر بابا نے بٹ خیلہ سے جا کر کشمیر پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کی شیخ محمد اکرام مصنف 'آبِ کوثر' لکھتے ہیں:

"سوات کے ایک بزرگ شاہ میر ۱۳۱۵ء میں کشمیر کے راجہ سنگھ دیو کے ہاں ملازم ہوئے اور اپنی خداداد قابلیت سے بڑا اقتدار حاصل کر لیا۔ ان کے بیٹوں کو بھی راجہ نے بڑے اختیارات دیئے اور ان کو راجہ کے ایک جانشین نے اپنا وکیل مطلق مقرر کیا آخر میں جب ملک کا نظام درہم برہم ہونے لگا تو ۱۳۴۳ء میں شاہ میر شمس الدین شاہ کے نام سے تخت نشین ہوئے اور سکہ و خطبہ جاری کیا۔ کشمیر میں اسلام انہی کی بدولت پھیلا۔ شاہ میر نے کشمیر سے اسلام کے سیاسی تعلقات کی بنیاد ڈالی۔"

شاہ میر کے والد کا نام شاہ دین ہے۔ کیمبرج ہسٹری میں شاہ میر کی نسبت لکھا ہے کہ:

"نئے بادشاہ نے اپنے اختیارات سمجھ اور نیک نیتی سے استعمال کیے کشمیر کے ہندو راجے بڑے ظالم تھے۔ ان کی علانیہ پالیسی یہ تھی کہ رعیت کے پاس معمولی دال روٹی سے زیادہ کچھ نہ رہنے دیا جائے۔ نئے بادشاہ کی حکومت لبرل اصول پر قائم تھی۔ اس نے بے جا سرکاری لگان اور غیر منصفانہ ٹیکس ہٹا دیے۔ ٹیکس وصول کرنے کے ظالمانہ طریقے موقوف کر دیے اور سرکاری لگان پیداوار کے چھٹے حصے پر مقرر کیا۔"

تاریخِ فرشتہ میں درج ہے کہ:

"شاہ میر ۷۱۵ھ میں کشمیر آیا اور راجہ کی اکثر رعیت اور ملازموں کو موافق یعنی مسلمان کیا اور اتنا اثر پیدا کیا کہ ۷۴۷ھ میں اس نے حکومت خود سنبھال لی، بلاد کشمیر میں حنفی مذہب کو رواج دیا، شاہ میر کے چار بیٹے تھے بڑا بیٹا جمشید اور دوسرا علی شیر تھا تیسرا میراث اور چہارم ہندال تھا، یہ سب قابل اور ہوشیار تھے، شاہ میر نے تین سال تک کامیاب حکومت کر کے وفات پائی اور اس کا بڑا بیٹا جمشید اتفاق سے تخت پر بٹھایا گیا اور علی شیر اس کا وزیر مقرر ہوا اور اپنے باپ کے طریقہ سے نظام حکومت عادلانہ قائم رکھا۔"

کتاب راج ترنگینی (فارسی ترجمہ ملا شاہ محمد شاہ آبادی) میں شاہ میری اولاد کے متعلق ذکر یوں درج ہے :-

"سلاطین شاہ میری نے کشمیر میں تقریباً دو سو سال تک کامیاب حکومت کی، اس خاندان کا معروف ترین سلطان، زین العابدین، مشہور بہ بڈشاہ تھا، یہ سلطان بڑا عالم، ادیب اور شاعر تھا۔ عربی اور فارسی میں بے تکلف شعر کہتا تھا اور کشمیری، سنسکرت، اور تبتی زبانوں میں کامل مہارت رکھتا تھا، اس سلطان نے کشمیری زبان کی کتابیں قلمی نیز آثار عربی و فارسی و سنسکرت کو جمع کیا اور ایک بڑے کتب خانے کی بنیاد رکھی۔ یہ کتب خانہ سری نگر شہر میں تا عہد حکومت سلطان فتح شاہ (۸۹۲ - ۹۰۸ھ) برقرار تھا۔"

اس خاندان کا آخری بادشاہ یوسف شاہ بن علی شاہ تھا جس کی بادشاہت ۹۹۴ھ میں اکبر بادشاہ کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ (اقبال نامہ اکبری)

الغرض سواتی پٹھانوں نے الغ بیگ اور بابر کی اطاعت سے انکار کرتے ہوئے

مردانہ وار مقابلہ کیا اگرچہ شکست کھائی تاہم برسوں تک اس علاقہ پر قابض رہے یوسفزیوں کی آمد پر ان سے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے ضلع ہزارہ کا رخ کیا اور وہاں سواتی پٹھان پکارے جانے لگے۔ علاقہ سوات سے نکل کر ہزارہ میں جس علاقہ پر انہوں نے قبضہ کیا اُسے سلطان پکھال کے نام سے پکھلی نام دیا گیا۔ پھر اٹھارویں صدی میں سید جلال بابا کی قیادت میں اس قبیلہ نے ہزارہ کے شمالی علاقہ سے ترکوں کو نکال کر تمام پہاڑی اور میدانی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ قبیلہ کئی ذیلی شاخوں میں منقسم ہے۔ مثلاً گبری، ممیالی، عالی، مترادی ویشان اور دودان، دودگان یا دیگان[1] جو ایک ہی نام ہیں اور اس وقت اُن کو دودیال کہتے ہیں۔ فتوح البلدان کا مصنف لکھتا ہے۔

"دودان ایک قوم تھی شام کی سرحد آرمینیہ میں جو مدعی ہے کہ وہ بنی دودان بن خزیمہ میں سے ہے" بموجب تورات "ودان بن یقشان بن ابراہیم علیہ السلام"

معلوم رہے کہ آرمینیہ میں اسرائیلی جلاوطنوں کا ذکر ہو چکا ہے بنی اسرائیل میں دودان ایک خاندان بھی تھا یہ لوگ محمد غوری کے ساتھ اشنغر میں آئے تھے۔

تواریخ حافظ رحمت خانی میں مترادی قبیلہ کا ذکر ہو چکا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو یوسفزئی بیان کرتے ہیں۔ گبری کے وجہ تسمیہ کے متعلق معلوم رہے کہ کوہ گبر دریائے توچی کے قریب علاقہ میں ور غر کے متصل افغانستان کی مشرقی سرحد پر جہاں اس وقت بھٹنی افغان رہتے ہیں ایک وادی اور پہاڑ کا نام تھا یہ لوگ وہاں پر رہائش پزیر تھے اور محمد غوری کے ساتھ وہاں سے چلے آئے تھے۔ وہاں کی رہائش کی وجہ سے ان کا نام گبری اور بعدہٗ سوات میں رہائش کی وجہ سے سواتی مشہور ہوئے ان سواتی پٹھانوں میں چھوٹے

---

[1] دیگان یا دیشان اور دیقان یہ سب ایک ہی افغان قبیلہ کے مختلف نام ہیں جو فارسی میں گاؤں کے خان یا حکمران کے معنوں میں ہیں، پشتو زبان میں لوی کورنئے یا خان کور کہتے ہیں۔ دہقان (یا دیگان) وہ شخص جو امور میں تصرف پر چستی کے ساتھ قادر ہو۔ دانائے کار زمیں دہ۔ یہ دہکان کا معرب ہے۔ بحوالہ فتوح البلدان کے اردو مترجم سید ابو الخیر مودودی ۳۴۴

چھوٹے مختلف افغان قبائل شامل ہیں جن میں بٹنی قبیلہ کی بھی ایک شاخ تھی جو بٹخیلہ۔ بٹگرام اور بٹل کے ناموں سے ظاہر ہے۔ بعض مؤرخین ان کے نسب کے متعلق مخالف رائے رکھتے ہیں لیکن حقیقتاً یہ افغان قبائل میں سے ہیں۔ ان کی مادری زبان اب بھی پشتو ہے۔ اور اس وقت یہ لوگ مواضعات بٹل۔ الائی شنکیاری۔ بٹگرام۔ مانسہرہ۔ بفہ۔ اوگئی۔ گڑھی حبیب اللہ اور بالاکوٹ وغیرہ میں آباد ہیں اور یہ لوگ اپنے آپ کو افغان اور پختون بولتے ہیں یہ لوگ بڑے محنتی اور بہادر اور آزادی پسند واقع ہوئے ہیں سکھوں اور انگریزوں سے سخت جنگیں لڑی ہیں۔ ان میں پختون ولی کے جذبات بھی نمایاں ہیں[1]

علاقہ پشاور اس بارے میں سعادت خان بن ہدایت اللہ خان مصنف سعادت نامہ افغانی لکھتا ہے:۔

"علاقہ پشاور میں پٹھانوں کے تین گھرانے آباد ہیں یعنی خیخے یا خشئے غورے اور کرلانی۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ جو لوگ رہتے ہیں وہ ان کے ہمسایہ ہیں لیکن حصہ داری میں انہیں بھائیوں جیسا برابری کا حق دیا گیا ہے، کیونکہ وہ ان کے قریبی نسب میں نہیں البتہ (مورث اعلیٰ) "پخت" کی نسل سے ہیں۔ خیخے یا خشئے اور غورے دونوں سگے بھائی اور کندیا قند کے بیٹے ہیں۔ شجرہ غورے یا غوریاخیل اس طرح ہے کہ اس کے چار بیٹے ہیں۔ اول دولت یار جو مہمند اور داؤدزئی کا باپ ہے دوئم خلیل سوئم چمکنی یا سمکنی، چہارم زیرانی۔ واضح رہے کہ سرغلانی جواب سرغانی سے یاد کیئے جاتے ہیں اور وہ اپنا نسب ترین سے ملاتے ہیں اور داذا خیل وملاگوری اور ماندوری یہ چاروں افغان

---

[1] مغل مورخین کی رائے میں بھی یہ سواتی لوگ نسلاً افغان ہیں۔ جیسا کہ اقبال نامہ اکبری تصنیف مولوی ذکاؤاللہ دہلوی جلد پنجم ص۳۶ سے ثابت ہے کتاب ھٰذا ص۳۰۲ پر بھی یہ ذکر موجود ہے

قبائل غوریا خیل کے حمایتی اور ہمسایہ ہیں۔ زیرانی اور گمکنی اول وقتوں میں اپنے بھائیوں سے جدا ہو گئے تھے۔ اس وقت زیرانی ننگر ہار میں تاجیک کے ساتھ آباد ہیں اور گمکنی یا سمکنی مختلف مقامات پر گڈ مڈ اور کہیں الگ الگ منتشر حالت میں رہتے ہیں۔

یوسف زئی، گگیانی اور ترکانی تینوں بھائی ہیں اور خخیے یا خشے (رخاشی) کی اولاد ہیں۔ اور محمد زئی جو کہ اشتغر میں رہتے ہیں زمند کی اولاد ہیں۔ زمند خشی کا چچا تھا مگر خشی نے اُسے اپنے ساتھ بحیثیت سگے بھائی کے رکھا اور اسی نسبت سے اُسے حصہ بھی دیا۔ گدون یا جدون جن کا کرڑ کے ہم نسب ہیں اور اتمان خیل بھی جو یوسف زئی کے ساتھ سمہ، سوات اور باجوڑ میں رہائش پذیر ہیں۔ نسب کے لحاظ سے کرلانی ہیں۔ مگر یوسفزئی نے انہیں اپنے ساتھ رکھا اور سگے بھائیوں جیسا سمجھتے ہیں"۔

کرلانی کا شجرہ یہ ہے :۔

کرلان کی دو بڑی شاخیں ہیں ایک کودی دوئم ککے۔ کودی کے دو شاخیں ہیں ایک اورک اور دوئم دلزاک ماوزک کی اولاد اورک زئی اور دلزاک کی اولاد دلزاک کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ککی کی چار شاخیں ہیں لقمان، اتمان، عثمان، جدران۔ ختک لقمان کی اولاد ہے اور اتمان خیل جو یوسف زئی کے ساتھ آباد ہیں، اتمان کی اولاد ہیں۔ اور قبیلہ افریدی عثمان کی اولاد ہے اور جدران جو ننگرہار میں سکونت پذیر ہیں۔ جدّ کی اولاد ہے"۔

دوسرے مورخین کی رائے میں بنگش بھی جوان کے ساتھ متصل تیراہ وکوہاٹ میں آباد ہیں کرلانی افغان ہیں۔

پشاور کے علاقہ میں خشی کے ساتھ باجوڑ میں مغرب کی طرف قبائل شنواری، صافی، گریزی، قندھاری وغیرہ افغان قبیلے ابتدا ہی سے آباد ہیں جو ملک احمد کی دعوت سے آئے اور جنگ کاٹلنگ میں شریک ہوئے تھے، اور یہاں انہیں شیخ ملی کی تقسیم میں حصہ ملا تھا۔ اسی طرح غوریا خیل کے ساتھ مغرب میں قبیلہ شنواری آباد ہے۔ شنواری ان کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ قبیلہ شنواری کی یہ دونوں شاخیں ایک ہی اصل سے وابستہ ہیں جو خشی اور غوریا خیل کے چچا کاشی یا کانسی کی اولاد ہیں وہ اپنے قبیلہ سے جدا ہو کر ان میں شامل ہو چکے تھے۔ شجرہ نسب ابراہیم بٹنی کے مطابق یوں ہے۔ غرشبون کے تین بیٹے ہیں۔ قند، زمند، کانسی یا کاسی - کانسی کے کئی بیٹے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ سام۔ شنواری۔ سلت۔ ہمڑ۔ کوہسار۔ کتیر۔ موسلخ۔ شیالا۔ مامدزی، گمرانی یا جمرانی یا ژمرلانی اور الوزی وغیرہ۔

شنواری بن کانسی کے دو بیٹے سلیمان اور عثمان تھے۔ سلیمان کی اولاد سلیمان خیل ہیں اور عثمان کے دو بیٹے ہدیا خیل اور بارک تھے۔ بارک کے دو بیٹے بدلا اور عبداللہ ہیں۔ بدلا کی اولاد اس کے بیٹے حیدر کی نسبت سے حیدر خیل کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ عبداللہ کے چھ بیٹے الوزئی۔ پچی زئی۔ کوہرزئی۔ مندے زئی۔ بوسعید اور اجی تھے۔ اور مندے زئی میں الیاس خیل، حسن خیل، اور ہمزہ خیل ہیں۔

غوریا خیل کے ساتھ کچھ تھوڑے سے دیگر افغان خاندان بھی آباد ہیں

جن کی تفصیل یہ ہے:۔

- قبیلہ گمرانی افغان تپہ داؤدزئی موضع امانکوٹ میں حصہ داری میں ہے اور مواضعات پانڈہ اسمٰعیل، پانڈہ محب اور منڈو بنہ سالم اور نیز تپہ خالصہ کے مواضعات پیر پیائی، پشنگڑی میں مالکانہ حیثیت سے آباد ہیں۔

قبیلہ تیراہی افغان۔ مواضعات تارو۔ علی بیک۔ کیندے ناصر۔ قاسم وغیرہ میں آباد ہے۔

قبیلہ بے سود افغان۔ نادر خان افغان قوم بے سود کے اہل خاندان موضع ڈاک بے سود میں آباد ہیں اور سالم گاؤں ان کی ملکیت ہے۔

قبیلہ اُورمڑ افغان۔ سرنگ خان، محسن خان اور ملا خان پسران میر عالم خان قوم اُورمڑ افغان کی اولاد، ہر سہ مواضعات اُورمڑ میں مالکانہ حیثیت سے آباد ہیں۔

قبیلہ کنڈ یا کندی افغان۔ مواضعات کالہ۔ کندی دلاور۔ ناصر پور۔ ماصی آباد۔ لالہ۔ جبہ۔ ہرگونی۔ گڑھی سردار۔ بدھائی وغیرہ تپہ خالصہ میں مالکان وسکونت پذیر ہیں۔

- قبیلہ اضاخیل افغان۔ مسمیان الو خان، محمد خان اور ظریف خان کی اولاد موضع اضاخیل بالا و پایان سالم کے مالک ہیں اور انہیں مواضعات میں آباد ہیں۔

- قبیلہ بدرشی افغان۔ الف خان اور شہاب الدین قوم افغان بدرشی کی اولاد موضع بدرشی اور نوشہرہ خورد کے رہائش پذیر اور مالکان ہیں۔

- آزاد خان افغان کی اولاد موضع جہانگیر آباد تترناب میں آباد ہے۔ اور اسی طرح بارہ خان افغان کی اولاد موضع بابی میں اور ہمریز خان ترین کی اولاد

موضع چوکی میں اور سربلند خاں افغان اور عبداللہ افغان کی اولاد موضع بچہ غلام میں آباد ہیں۔ اور جمشید خاں افغان قبیلہ رانی زئی (یوسفزئی) کی اولاد موضع سواتی سالم کی مالک ہے اور اسی موضع میں آباد ہے

● قبیلہ سروانی یا سرگانی افغان۔ ان کے چند خاندان مواضعات سلیمان خیل، شہاب خیل، گڑھی ملی خیل اور رانا خیل یعنی ان چاروں گاؤں سالم کے مالکان ہیں اور انھیں میں آباد ہیں۔

● اورک زئی افغان موضع بہانہ ماڑی یا بالا ماڑی پشاور، کے مالکان و ساکنان ہیں اور یہ لوگ کامگار خاں و عالم خاں قوم افغان اورک زئی کی اولاد ہیں اور اس طرح موضع نوتھیہ سالم، اولاد صالح محمد خاں اورک زئی کی ملکیت ہے۔

دیگر افغان : یہ خاندان وقبائل تو معلوم ومشہور ہیں اور کتنے ہی خاندان تھے جو ہندوستان پاکستان کے دور دراز علاقوں میں پھیل گئے اور جہاں گئے اور آباد ہوئے وہیں کا رہن سہن، زبان اور معاشرت اختیار کر لی اور رفتہ رفتہ اسی زندگی کا ایک حصہ بن گئے۔ لیکن ظاہر ہے اس سے ان کی نسل اور قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا اور محض اس وجہ سے کہ وہ اپنی آبائی وقومی زبان بھول چکے تھے اور ایک نئی زبان بولنے لگے تھے انھیں افغانوں اور اسرائیل کی روایت اور تاریخ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود کہ ان میں بہت سی مقامی خوبیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ اپنے قومی اور نسلی خصائص سے محروم نہیں ہو گئے تھے۔ ان کی زندگی کے طور طریقوں اور ان کے عادات وخصائل میں بنی اسرائیل کے خصائص کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔ پٹھانوں کے یہ خاندان پورے ہندوستان پاکستان میں نہ صرف پھیلے ہوئے تھے بلکہ ان کی اپنی مستقل آزاد ریاستیں قائم تھیں مثلاً رام پور، جاورہ، بلاس پور، ٹونک، مالیر کوٹلہ، پٹودی، دوجانہ، کرنال و کنج پورہ، بھوپال بہاولپور نی، مانا ودر، جونا گڑھ، پالن پور، وراد ھن پور ریاستیں۔ ان کے علاوہ گجرات، کاٹھیاواڑ، ساداتو مدراس، بریلی، مراد آباد، نجیب آباد، خورجہ، شاہجہانپور، فرخ آباد، قصور، ممدوٹ، جالندھر و ہوشیارپور کی بارہ بستیاں، ملتان، میانوالی وغیرہ اور ہندوستان پاکستان کے تقریباً تمام صوبوں میں ان کی سیکڑوں مستقل ریاستیں اور جاگیریں تھیں، جہاں کے لوگ اپنی تہذیب ومعاشرت رکھتے تھے لیکن قومی نسلی لحاظ سے وہ پٹھان تھے۔

~~~~~
~~~~~

لاہور ـــــ ہندوشاہیہ کا دارالسلطنت

افغانوں کی تاریخ کے سلسلے میں لاہور کا ذکر بار بار آیا ہے موجودہ دور کے تقریباً تمام مورخین نے ہندوشاہیہ اور ان کے بعد غزنویوں کے دارالسلطنت کی حیثیت سے پھر سلاطین غور کے ہندوستان پر حملوں کے سلسلے میں نیز حضرت داتا گنج بخش کی ہندوستان میں تشریف آوری اور ہندوستان میں ان کے اولین جائے قیام کے سلسلے میں لاہور کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ تاریخ فرشتہ تاریخ ابن خلدون البیرونی کی کتاب الہند وغیرہ میں جہاں لاہور کا نام آیا ہے اس کے ساتھ اس کے قرب وجوار کے متعدد مقامات، دریاؤں حتیٰ کہ پہاڑی سلسلے کا ذکر بھی آیا ہے اور اگر کسی نقشے کو سامنے رکھ کر تھوڑی سی توجہ بھی دی جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ لاہور سے مراد کون سا شہر ہے؟ آیا وہ ہندوشاہیہ کا دارالسلطنت گندھارا والا لاہور ہے یا پنجاب کا موجودہ مشہور و معروف شہر ہے۔ لیکن اس سلسلے میں چونکہ موجودہ عہد کے مورخین نے توجہ نہیں کی اس لئے انہوں نے اس بحث کو جو ایک صاف اور بالکل واضح تھی کسی قدر الجھا دیا ہے۔ وہ تاریخی طور پر لاہور کی قدامت کا ذکر کرتے ہیں لیکن نتیجہ تاریخ وحقائق کے خلاف نکالتے ہیں اور اشارہ لاہور پنجاب کی طرف کر دیتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک عظیم تاریخی گمراہی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم ان حقائق سے پردہ اٹھا دینا چاہتے ہیں۔ جن سے قدیم لاہور کی اصلیت واضح ہو جائے اور تاریخ کے ہر قاری اور ہر طالب علم

کو معلوم ہو جائے کہ ہندوشاہیہ اور ان کے بعد غزنوی سلاطین کے دار السلطنت لاہور سے کون سا شہر مراد ہے اور سلاطین غزنوی و غوری کے حملوں کے سلسلے میں جس لاہور کا ذکر آتا ہے وہ کون سا شہر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لاہور کے محل وقوع اور اس پر مذکورہ حملوں کے راستے اور دریا کو عبور کرنے کے مقام پر مشمولہ نقشے میں بھی ایک نظر ڈالی جائے تاکہ قارئین کو اس باب میں کوئی شک باقی نہ رہ جائے کہ تاریخ میں مذکور لاہور سے مراد کون سا شہر اور مقام ہے۔

تاریخ فرشتہ نے بھی اس تاریخی واقعہ پر روشنی ڈالی ہے اور صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ دریا سے مراد آب سند یا دریائے سندھ ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں متعدد مقامات پر ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ یہاں ہم نے ان تمام تفصیلات کو مرتب کر دیا ہے۔ چنانچہ مصنف تاریخ فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔

(۱) ہر چند کہ امیر سبکتگین نے آب نیلاب عبور نہ فرمایا اور پنجاب کی حکومت پر فائز نہ ہو سکا۔ لیکن بعض مورخین اسے سلاطین لاہور کے سلسلہ میں منسلک کرتے ہیں، وہ ۳۶۷ھ میں دیار ہند کی طرف متوجہ ہوا اور چند قلعے مفتوح کر کے جابجا مسجدیں تعمیر فرمائیں، اور تاخت و تاراج سے غنائم وافر اپنے تصرف میں لایا اور غزنین کی طرف مراجعت کی اور جے پال بن است پال جو برہمن تھا اور ولایت لاہور کو سرہند سے لمغان تک اور کشمیر سے ملتان تک اپنے قبضہ و تصرف میں رکھتا تھا، کے ساتھ دوسری جنگ میں سبکتگین نے نہر نیلاب کے ساحل تک جے پال کا تعاقب کر کے قتل و خونریزی میں تقصیر نہ کی اور مال غنیمت لے کر ولایت لمغان ولپشاور اور نہر نیلاب کے کنارہ تک اس کے عمال کی تصرف میں آئی۔ فتح نمایاں سے

بعد ایک امیر کو دو ہزار سوار دے کر پشاور میں متعین کیا۔

(۲) سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۲ھ میں اپنے لشکر کو لاہور کے اطراف میں تاخت و تاراج کے واسطے بھیجا۔ اس مرتبہ جے پال کا پوتا ضعیف اور زبون ہوا تھا، سلطان بلا مزاحمت لاہور پر قابض ہوا اور ایک امیر کے سپرد کیا۔ خطبہ اس ملک میں اپنے نام کا پڑھوایا اور ابتدائے بہار میں غزنین لوٹ گیا۔

(۳) سلطان مسعود جب لاہور میں آیا تو اپنے فرزند "مجدود" کو وہاں کا حاکم کر کے طبل و علم عطا فرمایا اور ایاز خاص کو اس کا اتابک یعنی ادب آموز و اتالیق کیا اور خود غزنین لوٹ گیا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان مسعود نے شہزادہ مجدود کو جو لاہور سے غزنی آیا ہوا تھا حکم دیا کہ دو ہزار فوج لے کر ملتان کی طرف جاوے اور اس حدود کے انتظام میں مشغول ہو۔ اس دوران سلطان مسعود اپنے باپ سلطان محمود کے تمام خزانے جو قلعوں میں تھے غزنین میں لایا اور اونٹوں پر لاد کر لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ اور اس اثناء راہ سے کسی کو اپنے بھائی محمد کو قلعہ سے لانے کو بھیجا (جو وہاں ان کے ہاتھوں اندھا کیا ہوا اور قید تھا) اور جب مسافر خانہ ماکلہ میں یہ شاہی قافلہ پہنچا تو لشکریوں نے دریا سے پار ہوتے وقت شدتِ پانی اور اس سے تکلیف پہنچنے کا بہانہ بنا کر خزانہ شاہی کو لوٹ لیا اور سلطان مسعود کے بھائی "محمد" کو جو اندھا اور قیدی تھا، بادشاہ بنایا اور مسعود پر حملہ کر دیا۔ وہ اس رباط یعنی مسافر خانہ میں قلعہ بند ہو گیا رباط ماکلہ کے اندر

سے اسے گرفتار کرکے سلطان محمد کے روبرو لے گئے۔ محمد نے مسعود سے کہا کہ میں تمہارے قتل کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اپنے واسطے کوئی جگہ اختیار کرو کہ تم مع حرم اور اپنی اولاد کے وہاں بودو باش کرو۔ مسعود نے قلعہ گیری کو پسند کیا۔ کہتے ہیں کہ وہ اس حصار کی طرف روانگی کے وقت مصارف ضروری سے محتاج ہوا۔ محمد کے پاس ایلچی بھیج کر کچھ خرچ طلب کیا۔ محمد نے پانچ سو درم اس کے واسطے بھیجے۔ سلطان مسعود نہایت متاثر ہوا اور کہا سبحان اللہ کل کے روز اسی وقت میں تین ہزار شتر (اونٹ) خزانہ کا مالک تھا اور آج ایسے حال میں گرفتار ہوں۔ محمد کی آنکھ اس کی نور سے بے نصیب تھی۔ سلطنت اپنے بیٹے احمد کو تفویض کی اور احمد نے اپنے باپ کے بے مشورہ قلعہ گیری میں جاکر ۴۳۳ھ میں مسعود کو قتل کردیا۔

(۴) مودود بن سلطان مسعود کہ بلخ میں سکونت رکھتا تھا۔ اس واقعہ سے مطلع ہوکر غزنی آیا پھر غزنی سے لاہور روانہ ہوا۔ محمد نے اپنے ایک چھوٹے بیٹے کو سپہ سالار پشاور اور ملتان کا مقرر کرکے خود آبِ سند (دریائے سندھ) کے کنارہ سے مودود کے مقابلہ کے لئے چلا۔ دشتِ دیپور ریا دنبور میں چچا اور بھتیجے کے درمیان قتال شعلہ زن ہوا۔ خلاصہ یہ کہ فتح مودود کو ہوئی اور محمد مع اپنے فرزندوں اور وزیروں کے قتل کردیا گیا۔ القصہ مودود جب قاتلان پدر کے انتقام سے فارغ ہوا۔ تو اس گاؤں میں کہ جہاں اس کو فتح حاصل

ہوئی تھی۔ ایک قریہ اور ایک رباط یعنی مسافر خانہ تیار کر کے اس کا نام فتح آباد رکھا اور تابوت اپنے باپ اور بھائیوں کا قلعہ گیری سے غزنی میں روانہ کیا اور خود بھی غزنی کی طرف متوجہ ہوا۔ مودود کو کچھ اندیشہ سوائے چھوٹے بھائی مجدود بن مسعود کے نہ رہا کہ وہ باپ کے قضیہ کے بعد ملتان سے لاہور میں گیا اور ایاز خاص کی اعانت سے آب سند سے ہانسی اور تھانیسر تک استقلال بہم پہنچایا۔ پھر اسی سال مودود نے ایک لشکر جرار اس کے دفع کے واسطے رخصت فرمایا اور مجدود اس امر سے خبردار ہوا۔ قریب تھا کہ اُس کی صلابت کے خوف سے مودود کی فوج میں تفرقہ پڑ جاتا اور اکثر امرائے غزنین اس کی ملازمت میں مشرف ہوں۔ لیکن ناگاہ ۴۳۳ھ میں عید قربان کی صبح کو مجدود اپنی خوابگاہ یعنی خیمہ میں مُردہ ملا۔ اور کیفیت اس ناگاہ موت کی ہرگز دریافت نہ ہوئی اور ایاز نے بھی چند روز میں وفات پائی اور حکومت لاہور بلا جنگ وجدل سلطان مودود کے متعلقین کے تصرف میں آئی۔" (تاریخ فرشتہ اردو جلد اول صفحات ۲۶ ۔ ۲۷ ۔ ۲۹ ۔ ۴۸ ۔ ۶۶ ۔ ۶۸ ۔ ۶۹)

تاریخ فرشتہ کے مندرجہ بالا اقتباسات میں چند مقامات وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ حالیہ جغرافیہ میں ان مقامات کے صحیح محل وقوع کی نشاندہی کر دی جائے۔

۱۔ آبِ نیلاب:۔ یہ دریائے سندھ کا ایک اور مقامی نام ہے اور اٹک کے قریب جنوب میں دور تک بولا جاتا ہے۔ اس کے سامنے شمال مشرق میں ویہند اور لاہور کے مقامات قریب ہیں۔ دیار ہند سے ان کی

مراد اُس وقت صرف پشاور، تا لمغان و کابل کے علاقے تھے۔ الپتگین دریائے لمغان سے جانب مشرق اور دریائے کابل سے جانب شمال نہیں آسکا تھا۔ البتہ شہر کابل سے دریائے کابل کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ آتا رہا حتیٰ کہ مشرق میں وہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک قابض ہوا دریائے کابل کے اپنے گھاٹ پر جہاں وہ دریائے سندھ میں گرتا ہے قریب ایک گزرگاہ ہے جو اُس زمانے میں اور اب بھی وہند کے لئے جائے عبور رہی ہے، سبکتگین اسے پار نہ کرسکا حالانکہ دریائے کابل کے کنارے والی گزرگاہ گھنڈ سے صرف چودہ میل کے فاصلہ پر وہند واقع تھا۔

۲۔ سلطان محمود غزنوی ۴۱۲ھ میں لاہور پر قابض ہوا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ مطلب یہ کہ یہاں لاہور میں اس نے مسجد بنائی تھی۔

۳۔ دریا:۔ یہاں دریا سے مراد دریائے گھنارہ یا دریائے کابل ہے جسے لنڈے دریا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس دریا پر زمانہ قدیم سے ایک مقام ہے جو گذرگاہ یعنی جائے عبور رہا ہے جس کا نام اس وقت گھنڈ سے مشہور ہے، کابل اور غزنی وغیرہ کے آنے جانے والے لوگ اسی مقام پر دریا عبور کرتے تھے یہاں سے راستہ بنا ہوا تھا جو وہند اور لاہور تک پہنچتا تھا۔ اب بھی اُس راستے کی نشانیاں موجود ہیں ہند کے مقام پر بھی ایک گذرگاہ یعنی جائے عبور تھی جو ہندوستان آنے جانے والوں کے لئے استعمال ہوتی تھی اور ان دونوں مقامات کی گذرگاہ یعنی جائے عبور اب بھی وہی کام کرتی ہیں یعنی کشتیاں آر پار ہوتی ہیں، مگر اب پلوں اور سڑکوں کے سبب غیر ضروری ہوگئی ہیں۔ یہ بھی معلوم

رہے کہ مقام اہند سے مقام گُھنڈ تک کے درمیان کوئی بھی جگہ دریائے سندھ کو عبور کرنے کے لئے ہرگز موزوں نہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے درمیان میں پانی کا بہاؤ ہمیشہ سے تیز چلا آتا ہے اور اب بھی وہی حالت ہے۔

رباطِ ماکلہ:۔ اب یہ گاؤں اس نام سے موجود نہیں جیسا کہ مہنارہ گاؤں اب نہیں ہے۔ البتہ گُھنڈ کے مقام پہ دریائے کابل سے مشرق کو پار ہوکر جہاں مہنارہ گاؤں واقع تھا تو اس کے مشرق میں رباطِ ماکلہ بھی موضع بیتور کے جنوب میں قریب ہی واقع تھی اور جس قلعہ میں سلطان مسعود قلعہ گیر ہوا تھا وہ بیتور ہی کا چھوٹا سا قلعہ تھا جس کا ذکر البیرونی نے کیا ہے۔ بیتور اس وقت تورڈھیر کے نام سے مشہور و معروف قصبہ ہے۔ اور اُس کے جنوب میں قریب ہی آبِ سند موجود ہے جس کا مقامی نام اباسین بھی ہے۔ اور اس دریا کا عام نام دریائے سندھ ہے۔

قلعہ گری:۔ بقول البیرونی یہ کلار جگ پہاڑ یعنی مہابن سے تین فرسخ کے فاصلے پہ جنوب میں واقع تھا۔ آج کل یہ مقام پشتو زبان میں "کلاگر یا کولاگر" کے نام سے معروف ہے جو قلعہ گری ہی سے بنا ہے۔ یہاں اِس وقت ایک افغان گدون قبیلہ رہائش پذیر ہے اور یہ قلعہ تحصیل صوابی ضلع مردان میں موضع گندف کے شمال میں واقع تھا اور یہ مقام لاہور اور وہینڈ سے مشرق کی طرف تقریباً ۳۲ میل کے فاصلہ پہ پہاڑیوں کے درمیان میں واقع تھا۔

۴۔ **دیور یا دنبور:**۔ یہ مقام بحوالہ البیرونی پشاور سے جانب مغرب پندرہ فرسخ یعنی ساٹھ میل کے فاصلہ پہ کابل کے راستہ میں واقع تھا۔

محمود اور ایاز : دونوں کی اقامت اور بود و باش یہاں تھی اور دونوں نے یہیں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ ان کی قبریں اب بھی اِس لاہور کے علاقہ میں موجود ہیں۔

اس مقام پر جو نقشہ شامل کیا جا رہا ہے اس کے مطالعے سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مقامات' دریا' ان کے گھاٹ کہاں پر تھے اور لاہور سے کون سا لاہور مراد ہے ؟

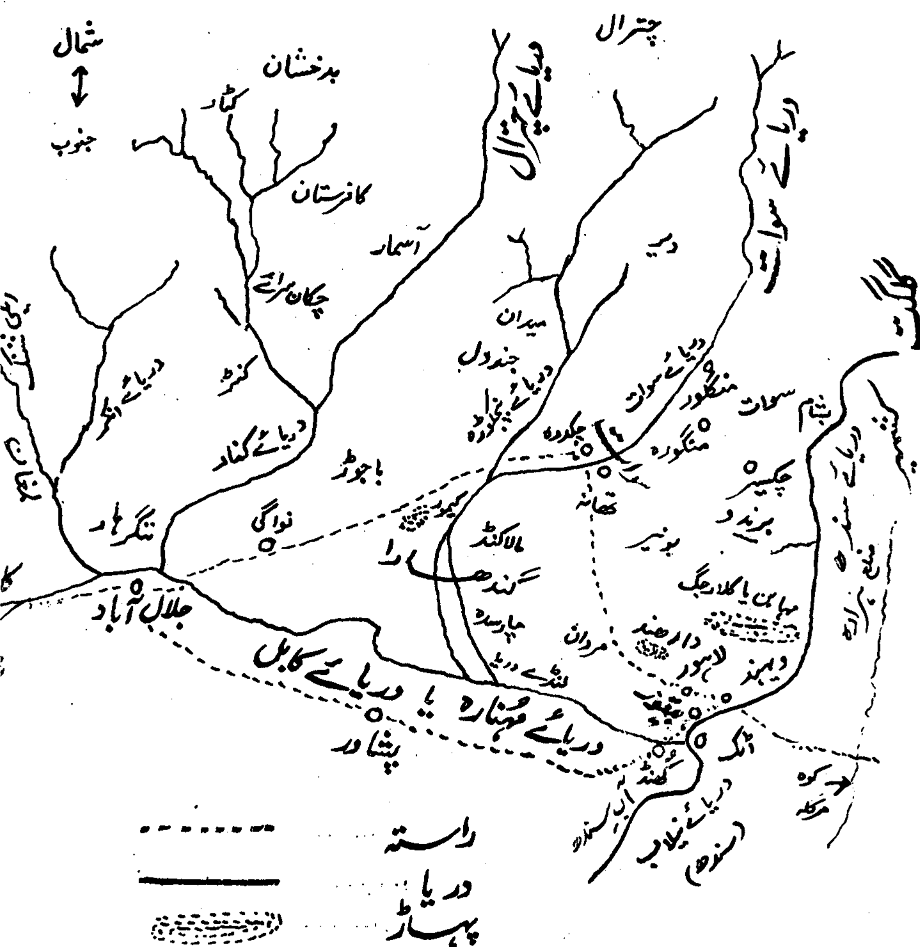
اور اس بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں رہتا کہ ان تمام بیانات میں لاہور سے مراد پشاور کے قریب واقع لاہور ہے۔ پنجاب کا لاہور ہرگز مراد نہیں ہے۔

جیسا کہ سید سراج الاسلام لکھتے ہیں۔

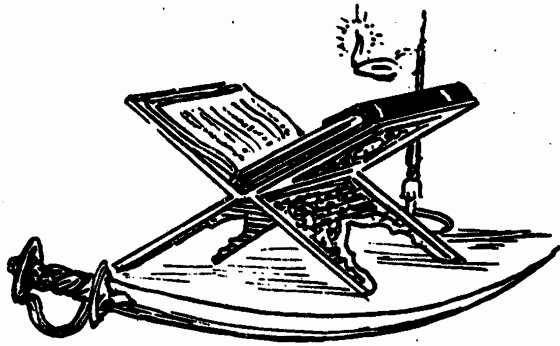
.... اب ہندوستان کے شمال مغربی دروازے پر ایک نئی طاقت ابھر رہی تھی۔ یہ طاقت ترکوں کی تھی۔ جس کا دارالسلطنت غزنی تھا۔ ۹۶۳ء میں الپتگین کے مرنے کے بعد اس کے غلام سبکتگین کو اس کی جگہ بادشاہ بنایا گیا۔ اس وقت ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ پر راجہ جے پال حکمران تھا۔ جس کی حکومت (مشرق میں دریائے) چناب تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۹۸۶ء میں سبکتگین نے اس پر حملہ کیا۔ اور اس کو شکست دیکر واپس لوٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی جے پال نے پھر سر اٹھا لیا۔ اس لئے اپنے دوسرے حملے میں سبکتگین نے پشاور فتح کر لیا۔ اور جے پال کو اپنی سلطنت کے ایک وسیع حصہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ (عہد قدیم مشرق و مغرب ص ۳۷۹)

اس بیان سے ہم پوری طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ الپتگین کے عہد میں راجہ جے پال یا ہندی لاہوری حکومت کی سرحدیں کہاں تک تھیں اور اس کا دارالسلطنت دے ہند یا لاہور کہاں واقع تھا۔

نقشہ تصویری محال دِیہند اور لاھور



(یہ نقشہ پیمانے کے مطابق نہیں صرف مقامات کی نشان دہی اور سمتوں کا اشارہ مقصود ہے۔)



سلاطین غور اور لاہور

ننگیالی چہ یو ځل مخ کړی په کوم لوری
نه جاروزی که کوټے دِی که کړ ټک

په دُنیا دُ ننگیالو، دِی دا دده کاره
یا به اُوځی لګړئِ یا به کامران شی

تاریخ ابن خلدون حصہ ششم غزنوی اور غوری سلاطین صفحہ ۳۱۴

غیاث الدین کا غزنی پر قبضہ

اس اثنا میں غیاث الدین نے جس کی حکومت کو ہر لحاظ سے استحکام حاصل ہوگیا تھا فوجیں آراستہ کر کے غزنین پر چڑھائی کر دی ۔ خراسانی اور غوری فوجیں اس کے ہم رکاب تھیں ۔ ۵۷۱ھ میں دونوں حریفوں کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں ۔ اس جنگ میں امراء دولت غزنویہ کو شکست ہوئی ۔ غیاث الدین نے غزنین پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد کرمان اور شنوران پر دھاوا بول دیا ۔ (یہ کرمان ہند اور غزنی کے درمیان واقع ہے اس سے ملک فارس کا کرمان مقصود نہیں ہے) کرمان اور شنوران کے فتح کر لینے کے بعد لاہور کی طرف پیش قدمی کی ۔ خسرو شاہ بن بہرام شاہ نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ

کیا اور دریا کو عبور نہ کرنے دیا۔ (دریا کا نام اس زمانہ میں بقول البیرونی دریائے مُنارہ تھا اور اب بعض لوگ اُسے دریائے کابل اور بعض دریائے لنڈے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس مقام پر مشمولہ ایک نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے) مجبوراً غیاث الدین کو واپس ہونا پڑا۔ واپسی کے وقت بعض پہاڑی مقامات پر جو کہ ہند کے پہاڑوں سے متصل تھے قبضہ کر لیا۔

شہاب الدین کی لاہور پر فوج کشی:

شہاب الدین غزنین فتح کرنے کے بعد اہل غزنین کے ساتھ مدارات سے پیش آیا اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا اور حسن سلوک سے پیش آیا جس سے اس کی ہر دلعزیزی بڑھ گئی۔ حکومت و سلطنت کی بنیاد مضبوط ہو گئی۔ ہندوستان کے اکثر سرحدی اور پہاڑی ممالک کو فتح کر لیا۔ اس کی ملک گیری اور فتوحات کا سیلاب "لاہور" تک پہنچ گیا جو اس زمانہ میں خسرو ملک آخری تاجدار دولت غزنویہ کا پایہ تخت تھا۔ ۵۷۹ھ میں شہاب الدین نے خراسان اور بلاد غور سے فوجیں فراہم کر کے "لاہور" پر فوج کشی کی، دریا کو عبور کر کے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔

یہی مضمون ابن خلدون نے اپنی اسی تاریخ میں ایک اور جگہ بھی بیان کیا ہے اور وہاں پر اُس نے اِس دریا کا نام لکھ کر اس مضمون کے ابہام کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

> "شہاب الدین نے ۵۷۹ھ میں ایک بڑی فوج لے کر لاہور پر چڑھائی کی اور دریائے سندھ کو عبور کر کے لاہور کا محاصرہ کر لیا"۔ (صفحہ ۲۸۸)

الغرض باہم نامہ و پیام شروع ہوا۔ دامادی رشتہ قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی اور حسب خواہش جاگیریں دینے کا وعدہ کیا مگر شرط یہ لگا دی کہ میرے

بھائی غیاث الدین کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ خسرو ملک نے اس سے انکار کیا تب شہاب الدین نے محاصرہ میں سختی شروع کی۔ اہل شہر شدتِ محاصرہ اور جنگ سے گھبرا گئے۔ خسرو ملک کو برا بھلا کہنے لگے۔ خسرو ملک نے قاضی شہر اور خطیب جامع مسجد کو امن کی درخواست دے کر شہاب الدین کی خدمت میں روانہ کیا۔ شہاب الدین نے امن کی درخواست منظور کر لی اور فتح کا جھنڈا لئے "لاہور" میں داخل ہوا۔ چند روز تک خسرو ملک عزت و احترام کے ساتھ شہاب الدین کی خدمت میں رہا۔ دو مہینہ کے بعد غیاث الدین کا حکم پہنچا کہ خسرو ملک کو اس کے اہل و عیال کے ساتھ میرے پاس فیروزکوہ بھیج دو۔ چنانچہ خسرو ملک کو اہل عیال کے ساتھ فوج کے ایک دستہ کی حفاظت میں فیروزکوہ بھیجا گیا"۔ (ص ۳۱۴)

کہتے ہیں کہ لاہور اور اس کے اطراف کو مکمل طور پر قابو کر کے تب شہاب الدین، غزنی کو واپس ہوا۔ اور کچھ عرصہ بعد پھر آ کر جہلم سے آگے مشرق کو بڑھا اور سیالکوٹ کو جو دریائے راوی اور چناب کے درمیان ہے ۵۸۰ھ میں قبضہ کر کے قلعہ سیالکوٹ کو بنا کیا۔ اور حسین خرمیل کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور قلعہ کو خوب مضبوط کر کے حسین خرمیل کی نگرانی میں دے کر شہاب الدین خود غزنی واپس چلا گیا۔ اس کے بعد ۵۸۷ھ میں پھر آ کر دہلی وغیرہ پر حملہ کر کے ناکام واپس ہو کر چلا۔ پھر خوب تیاری کر کے اگلے سال آ کر زبردست حملہ کیا اور سخت جنگ کے بعد ہندوؤں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ جما یا۔

دہلی شہر

بمطابق فرشتہ ۳۰۷ھ میں "داد بیتہ" راجپوت نے کہ طائفہ توران سے ہے اس شہر کو "اندر پت" کے پہلو میں بنایا۔ داد بیتہ کے بعد یکے بعد دیگرے آٹھ

لفر نے جماعت توران سے وہاں نشانِ حکومت بلند کیا تھا بھوج راج[1]۔ ادھرن[2] سدھندل[3]۔ روہیک[4]۔ روہتگر[5]۔ آہتگر[6]۔ مدن پال[7]۔ سالباہن[8]۔ اور اس خاندان کے بعد دہلی کی حکومت طائفہ چوہان میں جو عمدہ راجپوتوں میں سے ہے منتقل ہوئی اور اس کے ان چھ اشخاص نے بلدۂ دہلی میں بادشاہت کی۔ مانک[1] دیو۔ راج راول[2]۔ دیو جاہر[3]۔ دیو سہر[4]۔ دیو پتھورا[5]۔ پھر راجہ پتھورا[6] جو معرکہ سلطان شہاب الدین غوری میں مقتول ہوا۔ اور آخر ۵۸۸ھ میں دہلی ان کے تصرف میں سے نکل کر قبضہ ملوک غور میں آئی۔" (تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۹۳)

ذکر پرتھی راج: منشی محمد حسین صدیقی اپنی تصنیف احکم التاریخ میں لکھتے ہیں کہ:- آخر چھٹی صدی ۱۱۷۵ھ میں جس قدر راجے شمالی ہند میں حکمرانی کر رہے تھے۔ ان سب میں پرتھی راج جس کو راجہ پتھورا بھی کہتے ہیں، نہایت زبردست اور نامور راجہ اور راجپوتوں کی بہادر قوم کی ناک تھا۔ ہندوؤں میں جن نامی گرامی سورماؤں (بہادروں) کے افسانے زبان زد خلائق ہیں، ان میں پرتھی راج بھی شامل ہے۔ پرتھی راج کے بڑے زبردست راجہ ہونے کی وجہ یہ بھی کہی جاتی ہے کہ وہ اجمیر اور دہلی دونوں سلطنتوں کا راجہ تھا۔ اجمیر کی سلطنت تو اس کو اپنے باپ سوامیشور سے جو راجپوتوں کی قوم چوہان کا راجہ تھا، میراث پہنچی تھی۔ اور دہلی کی سلطنت ہاتھ لگنے کی یہ کیفیت ہے کہ اس کا نانا جو راجپوتوں کی قوم توار (یا چوہان) کا راجہ دہلی تھا، اس کا کوئی بیٹا تو تھا ہی نہیں صرف بیٹیاں ہی تھیں۔ جن میں سے ایک کی اولاد تو جے چند راجہ قنوج تھا اور دوسری کی پرتھی راج۔ اس کو نانا نے متبنیٰ بنا لیا تھا۔ یہ بات جے چند کو نہایت ناگوار گزری اور اس نے پرتھی راج کے راجہ دہلی ہونے میں بہت کچھ مزاحمتیں کیں لیکن کچھ

بنائے نہ بنی۔ آخرکار دہلی کا راج بھی پرتھی راج کے ورثے میں آیا اور اس طرح وہ دونوں سلطنتوں کا راجہ ہو گیا۔" آگے یہی مصنف محمد غوری کے بارے میں لکھتا ہے:۔

ذکر محمد غوری

راجہ پتھورا کو گدی نشین ہوئے ابھی بہت عرصہ گزرا ہی نہ تھا کہ اُس پر ایک زبردست غنیم چڑھ آیا۔ جو کبھی اس طرح پیشتر ہندوستان پر حملہ آور نہ ہوا تھا۔ یہ غنیم سلطان شہاب الدین غوری تھا۔ جو ایک بڑا جوانمرد بہادر اور مستقل مزاج سردار تھا۔ غور کا بادشاہ تو درحقیقت شہاب الدین کا بڑا بھائی غیاث الدین تھا مگر وہ اس کی نسبت نرم مزاج تھا اس لئے جب اُس نے غور کے تندخو اور قوی ہیکل افغان بہادروں اور دلاوروں کی مدد سے غزنی کو فتح کر لیا تو شہاب الدین کو وہاں کا بادشاہ مقرر کر کے وہ غور کو چلا گیا۔ شہاب الدین جب غزنی کی سلطنت سنبھال چکا تو اُس نے ہندوستان کا قصد کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ "وہند" زمانہ قدیم سے راجگانِ عظیم الشان کا دارالسلطنت چلا آتا ہے۔ "وہند" دریائے سندھ پر قلعہ اٹک سے ۱۵ میل شمال کی طرف تھا۔ چنانچہ شہاب الدین نے اُس پر فوج کشی کی اور جنگ کے بعد فتحیاب ہوا۔ اور یہاں کے سب بندوبستوں سے فارغ ہوا... دفعتاً سرحد (یعنی سیالکوٹ) کے حاکم کا عریضہ پہنچا کہ رائے پتھورا والیٔ اجمیر اپنے بھائی "کھانڈے راؤ" حاکم دہلی کو ساتھ لے کر دو لاکھ فوج جرار اور تین ہزار فیل جنگی سے "وہند" پر چڑھائی کے خیال میں ہے اور بھونچال کی طرح چلا آتا ہے۔ آپ کی توجہ واجب ہے، ورنہ اس مُلک

ہند میں زن و بچے مسلمانوں کے تباہ ہو جائیں گے۔ بادشاہ نے اسی وقت لشکر اسلام میں منادی کرادی اور تیاری کا حکم ہوا۔ راستہ کے کارداروں کے نام سامانِ رسد کا حکمنامہ جاری ہو گیا۔ لشکر جرار منزل بہ منزل یلغار کرتا چلا جاتا تھا کہ انبالہ کے ڈیروں میں اسے یہ خبر لگی کہ راجہ پتھورا کا لشکر پانی پت کے مقام پر ہے مگر فیل خانہ کرنال میں آگیا۔ بادشاہ نے وہیں مقام کر دیا اور فوج کو پس و پیش سے درست کر کے کوچ بہ کوچ آگے بڑھا۔ تلاوری جسے اُس زمانہ میں تراین کہتے تھے کے میدان میں دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ دن مورچوں کی درستگی میں گذرا، شام کو سب نے گھوڑوں کے تانگ ڈھیلے کر دیئے۔ دانہ چڑھا۔ زین پوش بچھا کر بیٹھ گئے، باگ ڈوریں زانوؤں سے باندھ لیں اور خورجیوں سے روٹیاں نکال کر کھانے لگے۔ سلطان شہاب الدین ابھی خالصہ ہی پہ تھا کہ گشت کے سواروں نے دشمن کی فوج کے گھسیارے اور لکڑہارے جنگل سے پکڑ کر حاضر کئے۔ سواروں کو انعام دے کر رخصت کیا۔ اور ان لوگوں کو مودیی کے سپرد کیا کہ جو کچھ مانگیں انہیں کھلاؤ پلاؤ۔ ان میں دو بڑے ہشیار اور تجربہ کار نکلے کہ جن سے لشکر کے اوتارے کا رخ، فوج کی تعداد، پیچھے کی رسد کے بندوبست غرض ڈیرے ڈیرے کا حال معلوم کر لیا۔ تمام رات فوج کی تقسیم اور مورچوں کی تقرری میں گذری۔ پچھلی رات تھی کہ کمر بندی کا حکم پہنچا۔ صبح ہوتے ہوتے تمام لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں جم گیا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر ایک سردار اپنی اپنی فوج کو سنبھالے تھا اور وہ خود شمشیر اصفہانی کمر میں باندھے، پشت پہ سپر کندھے پہ کمان زین پر، عَلم کے سایہ کے نیچے نیزہ تانے کھڑا تھا۔
اسپ عربی، جس پہ پوست پلنگ کی پاکھر پڑی تھی زانوؤں میں سے نکلا جاتا

تھا۔ اور اُدھر دشمن کے لشکر میں پہلے ہاتھیوں کی قطار، بعد اس کے رتھیں، پلٹنیں اور پیادہ وسوار فوج تھی، کہ جس کا شمار سوائے منشیٔ تقدیر کے کسی کو معلوم نہ تھا۔ ہاں سلسلۂ انتظام اُس کا خاص ایک شخص کی چٹکی میں تھا کہ جدھر چاہے اُدھر جھونک دے۔ وہ تھا راجہ پتھورا جو سورج مکھی کے سایہ میں ہاتھی پر بیٹھا تھا اور دونوں لشکروں پر نظر تھی اور غور سے دیکھ رہا تھا آخر نہ رہ سکا اور تڑپ کر ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ بھائی کو ہاتھی پر بٹھا دیا۔ خود وہ دکنی گھوڑے کو اُڑاتا سپاہ گری کا بانکپن دکھاتا، بھالے کے ہاتھ، نکالتا ہوا دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں تک ایک چکر لگایا اور ایک لشکر کے سامنے کھڑے ہو کر اہلِ لشکر کے دلوں کو اس طرح بڑھایا ''کہ راجپوتوں کے سپوتو، پہاڑوں کے افغان فوج کا سامنا ہے یہ سب مسلمان ہیں اور ست دھرم کے بھرشٹ کرنے پر کمریں باندھ باندھ کر آئے ہیں' ابھی تمہاری سرحد پہ کھڑے ہیں، اگر ہمت کریں تو کچھ نہیں۔ خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں بھگا بھگا کر مار لو گے' اور اگر ایک قدم تمہارا پیچھے ہٹا تو ان کے پاؤں تمہارے گھروں میں اور ہاتھ ننگ و ناموس تک پہنچ جائیں گے۔ آج دھرم گیان کی لاج تمہاری تلوار کی باڑھ پر ہے۔ مارو' مارو' دم نہ لو اور جانے نہ دو۔'' راجہ ابھی یہ تقریر تمام نہ کر چکا تھا کہ اتنے میں لشکرِ شاہی کے بائیں ہاتھ پر جو افغان اپنے پیر جمائے کھڑے تھے' آگے بڑھے اور خلجی افغانوں نے بھی باگیں اٹھالیں۔ انھیں دیکھ کر راجپوت بہادروں کے سپوت بھی جن کی تلواریں میانوں میں بجلی کی طرح تڑپی جاتی تھی۔ ہاتھیوں کی صف کو چیر کر نکل آئے اور تیر برساتے ہوئے دوڑے اور ایک دم میں برچھیوں پر لے لیا جب یہ حال دیکھا تو افغان پیچھے ہٹے' اور خلجیوں کی فوج نے بھی گھونگھٹ

کھایا۔ (خلجی نام قوم افغان ہے) مگر شہاب الدین بے سپاہ قلب میں اسی طرح جما ہوا تیر مارے جاتا تھا جو ایک ساتھی نے آکر عرض کی کہ افغانوں نے پیٹھ دکھائی، جن سرداروں سے پسینے کی جگہ خون گرانے کی امید تھی، وہ جان بچا کر بھاگ گئے، دشمن چڑھتا چلا آتا ہے، حضور اب کس کی راہ دیکھتے ہیں، برائے خدا گھوڑے کی باگ پھیر دیجئے۔ اب لاہور میں پہنچ کر دشمنوں کا بندوبست قرار واقعی ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی بادشاہ شعلہ کی طرح بھڑک اٹھا۔ جو رہی سہی بقایا فوج تھی اس کو سمیٹ کر للکارا اور گھوڑے کو ایڑھ لگا کر برق کی طرح دشمن پر جا پڑا اور نیزہ و شمشیر سے گذر کر فقط خنجر و کٹار کی نوبت آ گئی۔ اتنے میں کھانڈے راؤ کی نظر بادشاہ پر پڑی، اس نے فیلبان کو آواز دی کہ خبردار جانے نہ پائے۔ اس نے ہاتھی کو ریلا، سلطان شہاب الدین بھی چمک کر اس طرح جھپٹا کہ گھوڑے کے دونوں پیر ہاتھی کے اوپر پہنچے اور اس کے منہ میں ایسا نیزا مارا کہ دانت ٹوٹ گئے، مگر خود بھی کاری زخم کھایا۔ ڈگمگا کر گھوڑے سے گرا چاہتا تھا کہ ایک سپاہی باوفا، جست کر کے پیچھے جا بیٹھا اور گھوڑا اڑا کر برق کی طرح نظروں سے غائب ہو گیا۔ غرض کہ بھاگے بھٹکے سپاہی اور ٹوٹا پھوٹا لشکر لاہور میں واپس پہنچا اور یہاں کے علاقے کا بندوبست کر کے غزنی کو روانہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں تماشہ یہ ہو گیا کہ جن جن سرداروں کو بہادری و جاں نثاری کے بڑے بڑے دعوے تھے، اور بادشاہ کو بھی ان پر بھروسا تھا، وہی میدان جنگ سے بھاگ گئے تھے۔ چنانچہ غزنی میں پہنچ کر علماء سے فتویٰ طلب کیا کہ جو مسلمان جہاد سے بھاگے اس کے لئے کیا حکم ہے۔ سب نے لکھا کہ وہ مجرم خدا ہے بادشاہ نے حکم شرع ہاتھ میں لیا اور تمام سرداروں کو گرفتار کر کے جو اور

پتلے گھوڑوں کے توبروں میں ڈالکر انہیں چڑھوا دیئے۔ اور بازاروں میں گھمایا۔ تاکہ خاص و عام عبرت پکڑیں۔ اور جو نہ کھائے اس کا سر الگ۔ پھر یہ سزا تو معاف ہو گئی مگر دربار سے بند ہو گئے۔

بادشاہ نے سال بھر کے اندر ہی اندر رازداری سے انتقام لینے کے لئے پوری طرح سامان جنگ تیار کر لیا۔ فہرست منگا کر دیکھی اور ہر کارخانے میں کوچ کا حکم بھیج دیا۔ آٹھویں دن خود سوار ہوا جب علاقہ پشاور میں پہنچا تو ایک پیر مرد کہنہ سال نے کہ غوری خاندان میں سے تھا اور بادشاہ کی صحبتوں میں بے تکلف، عرض کی کہ اس مہم میں تو جنگ عظیم کا سامان نظر آتا ہے مگر کھلتا نہیں کہ ارادہ کدھر کا ہے۔ بادشاہ نے ایک آہِ سرد بھر کے کہا کہ اے مردِ مسلم عجب ہے کہ اس سن و سال اور زیادہ تجربہ کے باوجود تیرا یہ سوال ہے۔ کیا اگلے برس کی شکست تجھے یاد نہیں۔ کیا وہ صدمہ اسلام کی عزت کے لئے کچھ چھوٹا تیر ہے۔ پھر قبا کے بند کھولے اور کہا کہ دیکھ اُس دن سے آج تک نہ میں نے کپڑے بدلے ہیں نہ حرم سرا میں بستر پہ سویا ہوں۔ اُس بوڑھے مرد نے دعائے خیر دی اور کہا کہ اگر یہ ارادہ ہے تو اب مصلحت وقت کے بموجب کام کرنا چاہئے یعنی جو سردار کہ غضب سلطانی میں دربار سے بند ہوئے ہیں، انہیں پھر دربار میں بلا کر انعام دیجئے اور ترقی کے وعدوں سے ان کے دل بڑھایئے کہ جان لڑا کر پہلے داغ کو دھوئیں۔ چنانچہ مشورہ قبول کیا گیا اور ملتان میں آکر چند مقام کئے، دربار عام کر کے وہاں سب سرداروں کو بلایا اور یہ کہا کہ اے مسلمانو! گذشتہ سال میں جو داغ دامنِ اسلام پہ آیا وہ سب پہ روشن ہے۔ اور تدارک اُس کا ہر مومن مسلمان پر واجب ہے، وہ

لوگ اگلی ندامت کے سبب سے کچھ کہہ نہ سکے۔ مگر سب نے تلواروں پر ہاتھ رکھ کر سامنے سر جھکا دیئے۔ غرض وہاں سے مکمل اطمینان کے ساتھ روانہ ہو کر لاہور پہنچا۔ اور قوام الملک رکن الدین کو کہ تدبیر اور تقریر میں بے مثل تھا، ایلچی کر کے خط کے ساتھ دہلی روانہ کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ

"میں بموجب حکم اپنے بڑے بھائی کے کہ وہ میرے باپ کی جگہ ہے، اور خراسان سے پنجاب تک مسلمانوں کا بادشاہ ہے، فوج لے کر اس طرف آتا ہوں۔ رائے پرتھی راج، کہ راجگان ہندوستان میں مہاراجہ ہے، اُسے لکھا جاتا ہے کہ اسلام کی اطاعت کر کے اتفاق کا طریقہ قائم کرے تاکہ خلقِ خدا کی آسائش میں خلل نہ پڑ جائے۔ ورنہ ملک خدا کا ہے اور حکم خدا کا، تلوار دونوں کا فیصلہ کرے گی۔"

یہ راسلہ راجہ کی نظر سے گزرا تو بہت پیچ و تاب کھایا اور خفا ہو کر اِدھر تو ایک جواب کہ پتھر اور لوہے سے سخت تھا، لکھ کر روانہ کیا۔ اور اُدھر راجگان ہندوستان کو جمع کر کے تین لاکھ راجپوتوں کا لشکر جن کی تلواروں سے خون ٹپکتا تھا۔ ہمراہ لے کر چلا۔ پہلے فتح کے بھروسے پر بہت سے راجہ بہادرانہ رفاقت کا دم بھرتے مدد کو آئے۔ سلطان شہاب الدین بھی اِدھر سے آگے بڑھا نہر سرسوتی کو درمیان میں ڈال کر دونوں لشکر اتر پڑے۔

پرتھی راج نے اول ایک خط اس مضمون کا لکھا کہ :-

"میری اس فوجِ بے شمار کا حال، سالارِ لشکر اسلام کو تو معلوم ہوا ہوگا مگر اِس کے علاوہ اور بھی ہندوستان سے برابر فوجیں چلی آتی ہیں۔ ایک ایک راجپوت وہ منچلا بہادر ہے جس کی تلوار

کی کابل و قندھار تک پناہ نہیں ۔ یہ چند نامراد بھوکے افغان زادے جنہیں تو لوٹ کھسوٹ کا لالچ دے کر گھروں سے یہاں لایا ہے تجھے چاہیے کہ ان کی جوانی اور ان کے ماں باپ کے بڑھاپے پر رحم کر کے یہیں سے لوٹ جائے ۔ ہمیں جوانمردی کی قسم ہے کہ پیچھا نہ کریں گے ۔ اور اگر یہ منظور نہیں تو دیکھ لے کہ آتشبازی کے سامان بے شمار ہیں ۔ جنگی ہاتھی کچھ اُوپر تین ہزار تک ہیں اگر اس تحریر پر خیال کیا تو بہتر ہے ورنہ یاد رہے کہ ایک جاندار اس میدان سے جیتا لوٹ کر نہ جائے گا۔"

سلطان شہاب الدین اس موقع پر دھیما ہوا، اور اس کے جواب میں مصلحتاً یہ لکھا کہ :۔

"راجہ نے جو نیک صلاح و مشورہ دیا، عین شفقت اور مہربانی ہے مگر سب پر ظاہر ہے کہ اِس لشکر کشی میں مجھے کچھ اختیار نہیں، بھائی کے حکم سے اِس مہم کا بوجھ سر پر لیا ہے، جب تک وہاں سے حکم نہ آئے میں کچھ نہیں کر سکتا، اس قدر مہلت ہو کہ وہاں سے جواب آجائے ۔ البتہ اِس وقت صلح اِس عہد پر ہو جائے گی کہ ملکِ پنجاب مقام سرہند تک ہمارے پاس رہے، باقی کل ہندوستان تمہارا۔"

جب یہ نرم جواب راجہ کے پاس پہنچا تو تمام اہل دربار ہنسنے لگے اور لشکروں میں فتح کی سی خوشیاں ہوگئیں بلکہ خوشی سے ڈیرے ڈیرے نے ناچ رنگ شروع کر دی ۔ یہاں شہاب الدین نے سرِشام فوج کو کمر بندی کا حکم دے کر خیمے ڈیرے سب قائم رکھے اور راتوں رات کئی کوس کا چکر دے کر دریا

پار اُتر گیا۔ صبح کو راجہ کے لشکر میں ابھی کوئی بستر پہ تھا کوئی اشنان کو گیا تھا کہ اچانک پہلو میں ایک بلائے ناگہانی ظہور میں آئی۔ ہیبت سے سوتے جاگتے اچھل پڑے اور تمام فوج میں کھلبلی پڑ گئی، وہ لشکر بے شمار ایسا دریا تھا کہ ایک طرف کی ہل چل کی دوسری طرف خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ مگر راجہ نے اس وقت ہوش و حواس کو برقرار رکھا اور ذرا بھی نہ گھبرایا، اور ایک فوج تیار کر کے لشکر اسلام کے سامنے کی اور باقی لشکر انبوہ کو سمیٹ کر پھر میدان میں لا جمایا۔ اِدھر شہاب الدین غوری نے فوج کے چار حصّے کر کے چار سپہ سالاروں کے ماتحت قائم کر دیئے کہ باری باری سے جائیں اور اس لشکر کثیر کے مقابل میں جان لڑائیں۔ راجپوت بہادر بھی اس میدان میں دائیں بائیں سے درست ہو کر اس خوبصورتی سے اور انتظام سے لڑے کہ مسلمانوں کے دل چھوٹ چھوٹ ہو گئے۔ تب شہاب الدین بمصلحت وقت، شکست کی صورت جیسی بنا کر پیچھے ہٹا۔ دشمن نے پیچھا کیا اور جب جمعیت لشکر اُن کی بے انتظام ہوئی تو دوسرے غول سے تازہ دم حملہ کیا مگر جمعیت ہندوؤں کی بے شمار تھی اس لئے اُس سے بھی مطلب حاصل نہ ہوا۔ جب ٹھیک دوپہر ہوئی تو رائے پرتھی راج ایک سو پچاس راجہ اور مہاراجہ کو لے کر ایک درخت کے سایہ میں آیا۔ سب نے تلواروں کے قبضوں پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی اور ایک ایک پیالہ شربت پی، پان کا بیڑہ مُنہ میں، تُلسی کی پتی زبان پہ رکھ، کیسر کے ٹیکے پیشانیوں پہ دیئے۔ اور شہاب الدین بھی بارہ ہزار افغان لشکرِ خاص، جن کے سروں پہ فولادی خود جواہرات کے مرصع دھرے ہوئے تھے انہیں لے کر جدا ہوا۔ اول خود تاج شاہی اوتار کر کفن سر سے باندھا، پھر شمشیر اصفہانی گھسیٹ کر میان اُس کا توڑ کر پھینک دیا۔ بادشاہ کا یہ حال دیکھتے

ہی سب نے اپنے اپنے خود، خورجیوں میں ڈال کر سروں پر کفن لپیٹ لئے اور تلواریں کھینچے، داڑھیاں منہ میں لئے۔ اس طرح جوش میں آکر نعرۂ تکبیر بلند کرکے ایسا حملہ کیا کہ یا تو اپنی جگہ جمے کھڑے تھے یا پلک مارتے ہی خاص راجہ کے قلبِ لشکر میں جاکر دھواں دھار ہو گئے اور جو جو افغان سر لشکر ادھر اُدھر لڑ رہے تھے وہ بھی دائیں بائیں زور دے کر دشمن پر گرے۔ ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ دم کے دم میں ہزاروں کا کھیت رہا۔ اگرچہ راجپوت تلواروں نے بڑی ہمت کی اور بہادری کے خوب جوہر دکھائے مگر انجام کار شکست کھائی کھانڈے راؤ میدان جنگ میں بہادری کا حق ادا کرکے زندگی کے بوجھ سے سبکدوش ہوا۔ رائے پتھورا دریائے سرسوتی کے کنارے گرفتار بدست لشکرِ سلطانی ہو کر مارا گیا۔ دشمن کی تمام فوج پریشان ہو گئی اور فتحیاب سپاہی شام تک قتل و غارت میں ہاتھ رنگتے رہے۔ بادشاہ نے راتوں رات لاھور اور غزنی فتح نامہ روانہ کرکے اُس کے دوسرے دن لشکر کا انتظام کیا اور آگے اجمیر کو روانہ ہوا۔ بعد ازاں اجمیر کو جو راجہ کا دارالسلطنت تھا فتح کرتا ہوا اُس اطراف میں رعب بٹھاتا ہوا دہلی میں آیا مگر اُدھر ہی کے جن راجاؤں نے بادشاہت تسلیم کی تو اُن راجاؤں کو تاج بخشیاں کرتا، کچھ جگہ مسلمان حاکموں کو مقرر کرتا ہوا دہلی میں آکر اپنی طرف سے قطب الدین ایبک جو اُس وقت فوج شاہی کا سردار اعظم تھا شہر میں نائب سلطنت کر کے دہلی سے لاہور اور لاہور سے غزنی پہنچا۔ کافی عرصہ کے بعد کوہ جود (رایا جوگ) کے مفسدوں نے فساد برپا کیا۔ شہاب الدین بذات خود وہاں گیا اور ان کو سزا دی۔ جب وہاں سے فارغ ہوا تو راستے میں بمقام دیمک (دھمیک) چند مفسد قوم کھگر رات

کے وقت شاہی خیمہ میں موقع پاکر چھپ رہے اور سلطان کو بحالت خواب جام شہادت پلا دیا۔ اس نے تیس سال سلطنت کرکے ۶۰۲ھ میں شہادت پائی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس کا نام علاؤ الدین غوری ہی درج ہے، مگر در اصل معز الدین نام تھا اور شہاب الدین خطاب۔ غرض کہ اس ایک ہی لڑائی سے سلطنت اسلامیہ ہندوستان میں قائم ہوگئی۔"

(احکم التاریخ المعروف محبوب السلاطین حیدر آباد دکن ۱۳۱۱ھ صفحہ ۲۹۰ تا ۳۰۰)

چونکہ لاہور کا ذکر اس مقالہ میں متعدد بار آچکا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی حقیقت پر مزید روشنی ڈالی جائے۔ اکثر مشہور و معروف تاریخ دانوں کا دعویٰ ہے کہ افغان حکمران سلطان شہاب الدین المعروف محمد غوری کو گکھڑوں اور کھوکھروں کے علاقہ میں، جو دریائے جہلم کے کنارے بھیرہ اور خوشاب بلکہ میاں والی، واٹک کے ضلعوں تک پھیلا ہوا تھا، **دھمیک** کے مقام پر شہید کیا گیا تھا۔ یہ گاؤں جیسا کہ اس مقام پر شامل نقشے سے ظاہر ہے دریائے جہلم سے جانب مغرب تقریباً چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے جو ایک قدیم اور تاریخی گاؤں ہے۔ یہ مقام ڈومیل سے شمال کو اور جی ٹی روڈ پر چکوال موڑ سے جانب مشرق تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس گاؤں میں ایک خستہ حال چبوترہ ہے جسے مقامی لوگ غازی شہاب الدین غوری کا مزار کہتے ہیں۔ اگرچہ وہ شہادت گاہ ہے

لاہور کا حدود اربعہ

واضح ہو کہ ان دنوں لاہور کا صوبہ علاقہ پشاور سے لے کر مشرق میں جہلم تک تھا جس کا صوبہ دار محمد ابو علی تھا۔ اور دوسرا صوبہ اس کے جنوب

میں ملتان کا تھا۔ جس کا صوبہ دار امیر داد حسن نامی ایک شخص تھا۔ اور جہلم سے مشرق کی طرف پنجاب کا علاقہ جس کا مرکزی مقام سیالکوٹ تھا، مگر اس وقت وہ صوبہ دہلی میں شامل کیا گیا تھا۔ دہلی اس زمانہ میں دارالسلطنت بھی تھا۔ شہاب الدین محمد غوری نے دہلی کی حکومت پر قطب الدین ایبک کو مامور کیا تھا۔

بقول ابن خلدون، کھوکھروں کی بغاوت و سرکوبی :۔ کھوکھروں کا علاقہ لاہور اور ملتان کے درمیان ہے۔ کھوکھروں نے شہاب الدین غوری کی موت کی فرضی خبر سن کر بغاوت کر دی اور محاصل دینے سے انکار کر دیا۔ قطب الدین ایبک نے دریائے جہلم کے مغرب میں اور شاپور کے شمالی علاقہ پر (جو خوشاب اور بھیرہ وغیرہ کے سامنے پہاڑوں میں دور تک واقع تھا) لشکر کشی کی اور شہاب الدین نے انہیں تہ تیغ کیا۔ دھمیک کے مقام پر شہاب الدین کی شہادت شعبان ۶۰۲ھ میں ہوئی"۔ (تاریخ ابن خلدون غزنوی اور غوری سلاطین، حصہ ششم اردو ترجمہ حکیم احمد حسین عثمانی مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی صفحہ ۳۳۸ تا صفحہ ۳۵۸)۔

ابن خلدون کے اس بیان سے لاہور کی حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ قوم ککہ یا کھکر اور گکھڑ وغیرہ لاہور و ملتان کے درمیان پہاڑوں میں رہتی تھی۔ کیونکہ ہر شخص بغیر سوچے سمجھے یہ سمجھ سکتا ہے کہ قصبہ شاپور اور سردار لشکر دانیاں کا فر کا مقام یعنی جودیاں یا جودی پہاڑ جو اس وقت مقامی زبان میں ٹلہ جوگیاں سے مشہور ہے اور اس کے ساتھ ہی متصل مشرق میں رہتاس قلعہ ہے اور اس سے جانب مغرب کو قدیم عام راستے پر تھوڑے ہی فاصلہ پر ڈومیلی کے قریب شمال میں مقام دھمیک، اور نیز وہ تمام پہاڑی علاقے جہاں ککر

یا کھوکھر اور کفار تراہیہ قومیں آباد تھیں اور جنہوں نے بغاوت کر کے اپنی سرکوبی کے لئے شہاب الدین غوری کو لشکر کشی کی دعوت دی تھی۔ وہ سارے مقامات پشاور والے لاہور اور ملتان کے درمیان واقع ہیں نہ کہ پنجاب والے لاہور اور ملتان کے درمیان۔

مشتاق مرزا مدرس جامعہ ہائی سکول جہلم اس علاقے کے مشرقی جانب کا جغرافیہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:-

"جہلم شہر کے مغرب میں ٹلہ کے پہاڑ کا سلسلہ ہے جو جہلم سے بیس میل مغرب میں ہے۔ اس کے مشرقی سرے پر رہتاس کا قلعہ ہے جو نالہ گہان کے کنارے ہے اور جنوبی سرا کوہستانِ نمک سے جا ملتا ہے۔ یہ ٹلہ "جوگیاں" کے نام سے منسوب ہے اور بلندی ۲۹۰۰ فٹ کے قریب ہے۔ اس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی بستیاں پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں اکثریت گکھڑ قوم سے تعلق رکھتی ہے۔ زمین انتہائی غیر ہموار ہے۔ برساتی نالوں سے پانی میسر آتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی خوشگوار ماحول رکھتی ہے۔ لیکن پانی نایاب ہے۔ ہندوؤں کے دور میں یہ چوٹی آباد تھی اب ڈو ریسٹ ہاؤس قابل رحم حالت میں ہیں۔ دو بہت بڑے تالاب بھی ہیں اور چیڑھ کے چند درخت ہیں۔

کوہستان نمک میں باغانوالہ گاؤں کے قریب ایک قلعہ کے آثار ہیں جسے نندانہ سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ وہی قلعہ "نندانہ"[۱] تھا جسے ہنڈ (یا ویہند) کے بعد ہندوؤں نے اپنا مرکز بنایا تھا جو اب مکمل طور پر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا ہے۔ روایت ہے کہ البیرونی نے یہاں سے زمین کے قطر کی پیمائش کی تھی۔ اور قلعہ نندانہ

---

[۱] نندانہ کی نسبت راجہ جے پال کے بیٹے انند پال کی طرف ہے جس نے اسے تعمیر کیا تھا۔

سے پندرہ میل مغرب کی طرف اسی سلسلہ کوہ میں کھیوڑہ کے قریب ایک اور قلعہ کسک ہے جو ہندوؤں کے دور کی نشانی ہے۔ مغل بادشاہوں کا راستہ کوہستان نمک میں کلر کہار کا تھا۔"

الغرض آگے اس مضمون کو پڑھنے اور نقشوں کو غور سے دیکھنے کے بعد صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ شہاب الدین محمد غوری کے عہد حکومت تک پنجاب والے لاہور کا نام تک نہیں تھا بلکہ وہ بعد میں معرض وجود میں آیا۔ جس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

کھوکھروں کی بغاوت

قوم ککر یا کھکر لاہور اور ملتان کے درمیان پہاڑوں میں رہتی تھی۔ اور ان پہاڑوں کے دشوار گذار ہونے کی وجہ سے قوم ککر کا ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا تھا لیکن شہاب الدین کے رعب اور خوف سے یہ اس قدر متاثر تھے کہ سالانہ خراج شاہی خزانہ میں داخل کیا کرتے تھے جس وقت شہاب الدین کی موت کی غلط خبر مشہور ہوئی ککر بگڑ گئے بد عہدی و بغاوت پہ کمریں باندھ لیں اور پہاڑی قوموں سے سازش کر کے فتنہ و فساد اور لوٹ مار کا دروازہ کھول دیا، دن دہاڑے مسافروں کو لوٹ لینے لگے غزنین اور لاہور کے راستے خطرناک ہو گئے۔ آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ شہاب الدین نے اپنے گورنر لاہور محمد بن ابوعلی کو لکھ بھیجا کہ ککر سے سالانہ خراج وصول کر کے بھیجو اور بد نظمیوں کو دفع کر کے امن و امان قائم کرو ککر نے محمد بن ابوعلی کی کسی بات کی پرواہ نہ کی۔ شہاب الدین نے قطب الدین ایبک کو قوم ککر کی سرکوبی اور سمجھانے بجھانے کے لئے روانہ کیا ککروں کے سردار نے ایک کوڑکا سا جواب دے دیا کہ اگر شہاب الدین زندہ ہوتا تو وہ خود آتا اسے یہ کہاں تاب تھی کہ ہم خراج دینا بند کر دیتے اور وہ خاموش بیٹھا رہتا غرض

کہ گکھر نے ایبک کی ایک نہ سنی۔ شہاب الدین نے اس سے مطلع ہو کر قریہ شاپور میں لشکر مہیا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ لشکر مرتب ہونے کے بعد گکھر کی گوشمالی کے لئے روانہ ہوا جوں ہی شہاب الدین لاہور پہنچا۔ گکھر نے اطاعت قبول کی۔ شہاب الدین ماہ شعبان ۶۰۱ھ میں لوٹ کر غزنین آیا اور فوراً ترکان خطا پر چڑھائی کر دی۔ (تاریخ ابن خلدون حصہ ششم محولہ بالا ص ۳۳۸) آگے لکھتا ہے:-

کھوکھروں کی سرکوبی۔

شہاب الدین کی واپسی کے بعد گکھروں نے پھر بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا رہزنی اور غارت گری کرنے لگے۔ اس مرتبہ ہنود کی اور قومیں بھی غارتگری اور بغاوت میں شریک ہو گئیں۔ شہاب الدین کو اس کی خبر لگی۔ ہند کے مقبوضہ علاقے میں بدامنی پھیلنے کے خیال سے ترکانِ خطا کے مقابلہ سے لشکر واپس لے کر غزنین کی طرف آیا اور وہاں سے لشکر کو از سرِ نو آراستہ کر کے ماہ ربیع الاول ۶۰۲ھ میں گکھروں کی سرکوبی کے لئے بڑھا۔ نہایت تیزی سے کوچ و قیام کرتا ہوا گکھروں کے سروں پر پہنچ گیا۔ گکھر بھی جنگ کے لئے پہاڑوں سے اتر کر میدان میں صف آرا ہوئے۔ ایک شب و روز مسلسل لڑائی ہوتی رہی۔ دوران جنگ میں جب کہ گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی قطب الدین ایبک لشکر اسلام لئے ہوئے دہلی سے آ پہنچا اور تکبیریں کہتا ہوا گکھروں پر حملہ آور ہوا۔ گکھروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ نہایت ابتری سے شکست کھا کر بھاگے۔ مسلمانوں نے گکھروں کو جہاں پایا مار ڈالا۔ گکھروں کا ایک بڑا گروہ ایک گنجان جنگل میں گھس گیا لیکن مسلمانوں نے اس میں آگ لگا دی۔ بے انتہا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ گکھروں کا سردار مارا گیا۔ اسی اثناء میں دانیال نامی سردار لشکر جودی (یا جوگی) نے بھی سر اٹھایا۔ شہاب الدین اس کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ ماہ رجب اسی مہم میں گزر گیا۔ الغرض

جس وقت باغیان ہندوستان کی سرکوبی سے فراغت حاصل ہوگئی ۔ اس وقت شہاب الدین نے صوبہ لاہور سے غزنین کی طرف کوچ کیا ۔

کوکر یا کھکر یا گکر اور کفار تراہیہ پہاڑی قومیں تھیں، مذہبًا یہ سب بُت پرست تھے، مسلمانوں کے پکے دشمن تھے ۔ گکر اطراف پشاور میں فتنے پھیلاتے رہتے تھے اور مسلمانوں کو ایذائیں دیتے تھے اور کفار تراھیہ پنجاب اور غزنین کے درمیانی پہاڑوں میں سکونت پذیر تھے ۔ (تاریخ ابن خلدون ۔ حصہ ششم ص ۲۳۹تا۲۴۰)

شہاب الدین کی وفات

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ شہاب الدین نے ہندوستان کی مہم سے فراغت پاکر (صوبہ) لاہور سے غزنین کی واپسی کا قصد کیا تھا غرض یہ تھی کہ ترکانِ خطا سے ان کی پیش قدمی کا بدلہ لے ۔ چنانچہ ہندی اور خراسانی فوجیں مرتب کی گئیں ۔ القصہ جس وقت شہاب الدین لاہور سے نکل کر غزنین کے لئے روانہ ہوا (یعنی صوبہ لاہور سے نکلنے اور غزنی کے لئے روانگی کا ارادہ کرلیا) مقام دُمیل (کے قریب دھمیک) میں جو لاہور کے قریب تھا پہنچ کر قیام کیا ۔ چند لوگ شاہی خیمے کے پاس آئے اور ان میں سے ایک نے دربان کو زخمی کیا ۔ شور وغوغا بلند ہوا محافظینِ خیمہ شاہی دوڑ پڑے ۔ جس نے دربان کو زخمی کیا تھا وہ تو بھاگ گیا ۔ باقی کو موقع مل گیا وہ خیمہ میں گھس گئے دو ایک خدمت گار جو خیمہ کے اندر تھے خوف زدہ ہو کر بے حس ششدر کھڑے رہ گئے ۔ شہاب الدین اس وقت نماز پڑھ رہا تھا ۔ سجدہ میں تھا کہ ان بے دینوں نے اُسے اسی حالت میں شہید کیا ۔ اسے قتل کر کے اُن خدمت گاروں پہ بھی ہاتھ صاف کیا ۔ جو اس وقت اس خیمہ میں تھے ۔

ابن خلدونؒ آگے لکھتا ہے کہ :۔

" قاتلین سلطان شہاب الدین محمد غوری کی بابت مورخین میں اختلاف ہے۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ کوکروں نے اُسے شہید کیا تھا جن کے گھر بار کو سلطان شہاب الدین نے تاخت وتاراج اور ان کے اعزہ واقارب کو قتل کیا تھا اور بعض کا یہ قول ہے کہ فرقہ اسمٰعیلیہ میں سے کسی شخص نے شہاب الدین کو شربت شہادت پلایا تھا۔ کیونکہ فرقہ اسمٰعیلیہ نے بہت شورش برپا کر رکھی تھی' شہاب الدین نے ان کی سرکوبی کے لئے ان کے قلعوں کا محاصرہ کیا تھا اور اس کی فوجوں نے بلادِ اسمٰعیلیہ کو تاخت وتاراج کیا تھا۔ ایک مورخ لکھتے ہیں کہ شہاب الدین کو ایک مجنون مسلمان نے قتل کیا تھا۔ مگر یہ روایت اور اسی طرح اسمٰعیلیہ کے قاتل ہونے کی روایت قرین قیاس نہیں ہے۔ بظاہر قیاس یہ کہتا ہے۔ کہ گکروں نے اُسے قتل کیا ہے۔ کیونکہ جہاں سے شہاب الدین گزر رہا تھا وہ گکروں کی سکونت کی جگہ تھی"۔

خواجہ مویدالدین یا خواجہ معین الدین

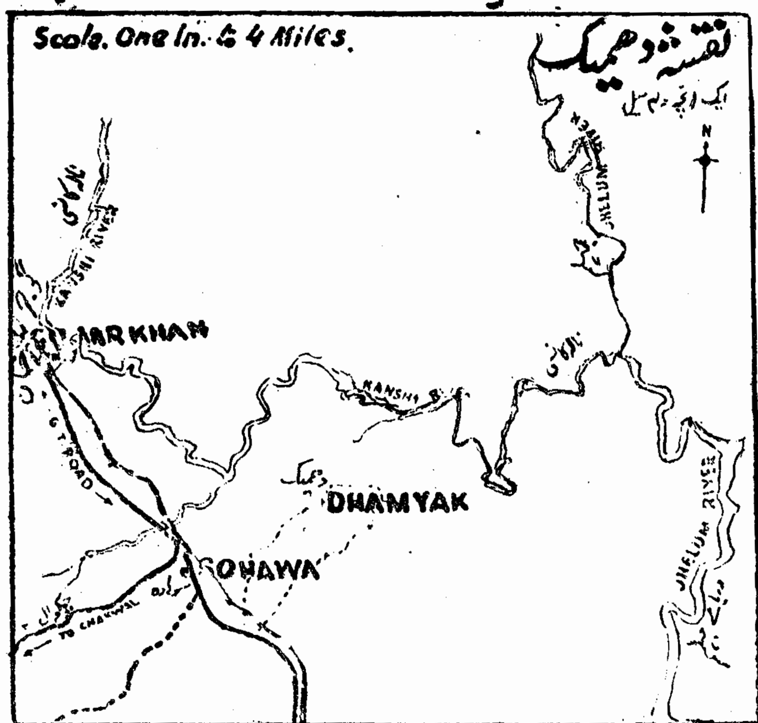
شہاب الدین کے قتل ہونے کے بعد امرائے لشکر اور وزیر سلطنت خواجہ موید الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب کے سب اس پر متفق ہوئے کہ جب تک خاندان شاہی میں سے کوئی شخص تخت کا مالک نہ ہو اس وقت تک شاہی خزانوں کی کامل طور سے حفاظت کی جائے۔ چنانچہ وزیر سلطنت نے سپہ سالار کو طلب کر کے لشکریوں میں امن وامان قائم رکھنے اور نظام حکومت کا پابند رہنے کی ہدایت وتاکید کی۔ نعش کو ایک تابوت میں رکھ کر اور شاہی خزانے کے ساتھ غزنین کی طرف روانہ ہوا۔ شاہی دو ہزار دو سو

اونٹوں پر لدا ہوا تھا... اور ان سب لشکریوں کو ہندوستان کی طرف واپس کر دیا جن کے وظائف اور جاگیریں قطب الدین ایبک کے قبضہ میں ہندوستان میں تھیں ... القصہ شعبان ۶۰۲ھ میں شہاب الدین کا تابوت غزنین پہنچا اور بمقام مدرسہ شاہی بائیسویں تاریخ ماہ مذکور میں مدفون ہوا۔ (تاریخ ابن خلدون۔ حصہ ششم ص ۲۴۳) آگے لکھتا ہے:-

تاج الدین ایلدوز کا لاہور پر قبضہ

ایلدوز یا دز غزنین سے نکل کر ایک ہزار پانچ سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ لاہور پہنچا۔ اس وقت لاہور پر شہاب الدین کا غلام ناصر الدین قباچہ

SKETCH MAP Showing DHAMYAK



حکمرانی کر رہا تھا۔ لاہور کے علاوہ (جنوب میں) ملتان، آجر اور دیبل ٹھٹھہ کے ساحل سمندر تک اس کے قبضہ میں تھے۔ پندرہ ہزار جنگجو سواروں کو لے کر میدان جنگ میں آیا بازار کارزار گرم ہو گیا۔ فریقین کے ساتھ ہاتھیوں کا بھی جھنڈ تھا۔ دز کو پہلے حملہ میں شکست ہوئی۔ ہاتھیوں کا جھنڈ پکڑ لیا گیا۔ دز نے پلٹ کر پھر حملہ کیا۔ اس حملہ میں دز کو کامیابی ہوئی۔ دز کے ہاتھی سوار نے قباچہ کے جھنڈے پر حملہ کیا۔ اتفاق یہ کہ جھنڈا گر گیا۔ قباچہ کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا دز نے شہر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس کامیابی کے بعد دز نے ہندوستان کی طرف قدم بڑھائے۔ تاکہ دہلی وغیرہ پر بھی جو مسلمانوں کے قبضہ میں ہے، قابض ہو جائے اس وقت دہلی میں قطب الدین ایبک کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اس کا غلام شمس الدین حکومت کر رہا تھا۔ شہر سمایا کے قریب مڈبھیڑ ہوئی۔ تاج الدین دز شکست کھا کر بھاگا۔ سارا لشکر تتر بتر ہو گیا اور اثناء جنگ میں اسے بھی مار ڈالا گیا"۔ (تاریخ ابن خلدون ص ۲۵۷)

تجزیہ

لاہور سے بعض جگہ صوبہ لاہور بھی مراد ہے جس کی حدیں اس وقت علاقہ پشاور سے لے کر دریائے جہلم تک واقع تھیں (جیسا کہ پٹھانوں میں اُس زمانے سے ایک مقولہ چلا آرہا ہے: دَ ہرات نہ تر جہلم پښتون آباد دے۔ یعنی ہرات کے علاقہ سے لے کر جہلم تک قوم پختون آباد اور رہائش پذیر ہے یہاں ایک افغان قبیلہ کانسی کی نسبت سے کانسی نالہ اب بھی موسوم ہے اور جہلم سے مشرق کی طرف پنجاب کا علاقہ جس کا مرکزی شہر سیالکوٹ تھا، دہلی کے ماتحت اور قطب الدین ایبک کے زیر حکومت تھا۔ قطب الدین ایبک مندکو ہو سیا کو ہار وہیں جو اس کے بعد لاہور کے نام سے موسوم ہوا، وفات پا

چکا تھا۔ جو دہلی کے صوبہ میں واقع تھا لہذا اسی سبب سے یہی مذکورہ مورخ اسی کتاب کے صفحہ ۳۵۷ پر لکھتا ہے کہ :-

"اُس وقت دہلی میں قطب الدین ایبک کا انتقال ہو چکا تھا اور اُس کا غلام شمس الدین حکومت کر رہا تھا"

اور اس سے پہلے یہ بھی لکھتا ہے کہ :-

"لاہور میں ناصر الدین قباچہ شہاب الدین کا غلام حکمرانی کر رہا تھا۔ اور لاہور کے علاوہ ملتان، آچ اور دیبل ٹھٹھہ کے ساحل سمندر تک اس کے قبضہ میں تھے"

حالانکہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قطب الدین ایبک کا انتقال شہر دہلی میں نہیں بلکہ پنجاب کے موجودہ شہر لاہور میں ہوا تھا۔ جس کا انارکلی بازار میں مزار ہے۔ چونکہ یہ مقام جہاں اب لاہور شہر ہے دہلی کی حکومت اور صوبہ میں واقع تھا، اُس وقت یہ ایک غیر مشہور مقام تھا اور لاہور کے نام سے اُسے شہرت بھی حاصل نہیں تھی، مورخ نے اسی بناء پر قطب الدین ایبک کی وفات کے حادثے کا دہلی میں واقع ہونا بتایا ہے۔ جس سے مراد صوبہ دہلی ہے نہ کہ شہر دہلی۔ بعینہٖ اوپر کی تحریر میں جہاں قتل شہاب الدین کی جائے وقوع کے سلسلے میں لاہور کا نام لیا گیا ہے تو وہ مقام پشاور یا گندھارا و اسلے لاہور کی حکومت اور صوبہ میں واقع تھا۔ اس قسم کی مثالیں بکثرت ہیں کہ ایک شہر کے نام سے کبھی کبھی پورا علاقہ مراد ہوتا ہے۔

ایک بہت اہم اور مفید بیان احکم التاریخ کے مضمون میں ہے جس کے یہ چند الفاظ نہایت پُرمعنی ہیں :-

"کوہ جود (یا جوگی) کے مفسدوں نے فساد برپا کیا، شہاب الدین

بذاتِ خود وہاں (یعنی ٹلہ جوگیاں) گیا اور ان کو سزا دی جب وہاں سے فارغ ہوا تو راستے میں بمقام دمیک (یا دھمیک) چند مفسد قوم کھگر رات کے وقت شاہی خیمہ میں موقع پا کر چھپ رہے اور سلطان کو بحالت خواب جام شہادت پلا دیا۔"

(منشی محمد حسین صدیقی مصنف احکم التاریخ ص۳۰)

لاہور کو شہاب الدین کی واپسی

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہاب الدین نے باغیوں کی خلاف اول کارروائی اس پہاڑی علاقہ کے مغربی حصہ میں کی اور پھر وسطی حصہ میں مکمل طور پر کھکروں اور کفار تراہیہ وغیرہ کو مغلوب کیا اور پھر یہاں سے مشرق کی طرف جودی یا جوگی پہاڑ پر جو اِس وقت مقامی زبان میں ٹلہ جوگیاں کے نام سے مشہور ہے حملہ آور ہوا۔ یہاں آخری فتح پا کہ دانیاں کافر سے بھی فارغ ہوا اور پہاڑ کے مشرق میں نیچے کی طرف واپسی شروع ہوئی اور بمقام "سُکوُدِی سَراں" میں اُترے یہ پہاڑ کے دامن میں عمدہ سا مقام تھا جو قلعہ رہتاس کے قریب سامنے مغرب کی طرف اور دینہ سے جنوب کو چار میل اور جہلم سے بطرف مغرب بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں آرام کرنے کے بعد مکمل واپسی شروع ہوئی اور یہاں سے روانہ ہو کر مغرب میں موضع ڈومیلی کے شمال میں عام راستے پر ایک میدانی علاقہ میں جہاں کوٹ دھمیک واقع ہے ڈیرے لگائے تاکہ یہاں آرام کریں اور رات وہیں گذاریں۔ واضح ہو کہ اُس زمانہ میں جہلم اور گندھارا والے لاہور یا وہیند کے درمیان یہی عام راستہ تھا جو جہلم شہر سے مغرب کی طرف قلعہ رہتاس کے پاس ہی شمال میں گذرتا ہوا ڈومیلی کے مشرق شمال میں گذرتا ہوا کوٹ دھمیک تک اور وہاں سے مندرہ کے قریب رواط

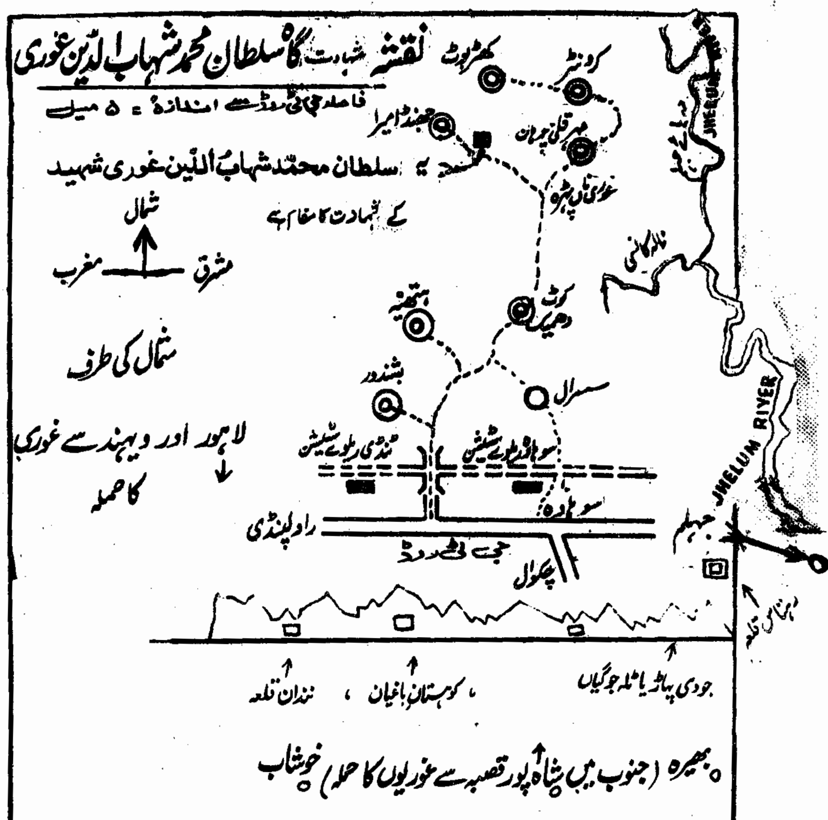
ہوتا ہوا مغرب میں وہہند اور لاہور پہنچتا تھا۔ اب بھی اُس راستے کی بعض جگہ نشانی واضح طور پر اور بعض جگہ صرف آثار موجود ہیں جسے میں نے بعض جگہ خود دیکھا ہے۔

سوویت روس

شمال

حصہ شمالی پاکستان اور ہمسایہ ممالک

(جنوب)



قلعہ رہتاس کے متعلق تاریخ ہند میں یوں درج ہے :-

"شیرشاہ نے پنجاب میں کھوکھروں کی جنگجو قوم سے مقابلہ کر کے بغاوت کو دور کیا اور دریائے جہلم کے مغربی کنارے رہتاس کا مضبوط قلعہ بنوا کر اس میں اپنی فوج رکھی"

(یہ نقشہ پیمانے کے مطابق نہیں صرف مقامات کی نشاندہی اور سمتوں کا اشارہ مقصود ہے)

قبل ازیں قطب الدین کی وفات کا ذکر ہوا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس کے مدفن کے متعلق بھی کچھ لکھا جائے۔ مزار کے متعلق نور احمد اپنی کتاب "تحقیقات چشتی" ص ۲۳۹ میں لکھتے ہیں :۔

احوال مزار قطب الدین غوری

دروازہ لاہوری کے باہر بطرف قصاب خانہ و شرق گدام شراب خانہ واقع بازار انارکلی ایک مکان بنام قطب غوریہ مشہور ہے۔ یہ مکان بہت بڑا عالیشان کشادہ تھا۔ یہاں عمارات عالیشان سنگِ مرمر وغیرہ کی تھی مگر مہاراجہ نے مسمار کر کے روانہ امرت سر کر دیں۔ اب صرف ایک قبر خشتی بلند چبوترہ پر موجود ہے۔ معمر لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اس قبر پہ گنبد دو منزلہ سنگِ مرمر کا دیکھا ہے اور وہ گنبد ایسا خوشنما تھا کہ نواحِ لاہور میں ایسی عمارت اور دوسری نہ تھی۔ واضح ہو کہ اس قبر سے زیادہ پرانی کوئی اور عمارت نواحِ لاہور میں نہیں کیوں کہ یہ قطب الدین غوری میں سے تھا اور سلطنتِ غوریہ شاہان چغتائی (مغل) سے بہت پہلے تھی ... اس وقت شہر لاہور کے بارہ دروازے بڑے اور ایک چھوٹا مفصل ذیل ہیں۔ لاہوری[1] دروازہ شاہ عالمی[2] دروازہ۔ موچی[3] دروازہ۔ اکبری[4] دروازہ۔ دہلی[5] دروازہ ذکی[6] دروازہ۔ (المشہور کی دروازہ)۔ شیرانوالہ[7] دروازہ جس کو خضری دروازہ بھی کہتے ہیں۔ کشمیری[8] دروازہ۔ مستی[9] دروازہ۔ روشنائی[10] دروازہ۔ ٹکسالی[11] دروازہ۔ بھاٹی[12] دروازہ۔ موری[13] دروازہ، یہ چھوٹا ہے"۔

لاہوری دروازہ

تاریخ تحقیقات چشتی کے مصنف نے دو مرتبہ یہ نام درج کیا ہے جو قابل غور و تعجب ہے کہ اسی شہر میں لاہور کے نام سے ایک دروازہ کیوں اور کیسا رکھا گیا تھا۔ اگر یہ لاہوری نام صحیح ہو اور لکھنے میں کاتب سے غلطی بھی نہ ہوئی ہو تو پھر یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ اُس وقت لاہور نامی شہر کسی دوسرے مقام پر موجود تھا جس کی نسبت سے یہاں ایک دروازے کا نام لاہوری دروازہ رکھا گیا جیسا کہ دھلی دروازہ اور کشمیری دروازہ۔

لاہور سے قبل پنجاب کا مرکزی شہر سیالکوٹ

اس سے پہلے پنجاب کا مرکزی مقام سیالکوٹ تھا ابراہیم بٹنی کے قلمی نسخہ میں بھی پنجاب والے لاہور کا ذکر نہیں بلکہ سیالکوٹ کا ذکر اس طرح ہے کہ:۔

"سلطان غوری کہ در ہندوستان اسلام از و شائع شُد و قلعہ سیالکوٹ از بناہائے اواست و راجہ پتھورا را اوکُشت"

زبدۃ الاخبار میں ہے کہ:۔

"سیالکوٹ بنا کردہ شہاب الدین محمد غوری است قبل ترین از بناہائے راجہ سالباہن است"

ٹاڈ راجستان کا مصنف لکھتا ہے:

بھٹی قوم جب زابلستان وغیرہ سے بھاگے تو سالباہنپور، (سیالکوٹ) کو دارالحکومت بنایا"

اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں کہ:۔

"۴۴ ہجری میں ابو مہلب نے بنہ اور الاھوار تک کے علاقہ کو روند ڈالا اور یہ دونوں مقامات گندھارا میں واقع تھے۔ گندھارا پہ اولین اسلامی لشکر سبکتگین سے قبل عہد امیر معاویہ میں ابو مہلب کی زیر قیادت پہنچ چکا تھا۔ مقام بنہ اور الاہوار کے متعلق عرب مورخین کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کابل اور ملتان کے درمیان شاہراہ پر مشہور مقامات کی حیثیت سے آباد تھے اور اس وقت بھی شہر بنہ ایک اونچا ٹیلہ خودوخیل میں قدیم شاہراہ کابل و ملتان پہ الاھوار (لاہور) سے آٹھ میل شمال میں موجود ہے بلاذری نے الاھوار، الاھوار اور ایک جگہ لہور بھی لکھا ہے اور یعقوب نے لاھوار لکھا ہے"۔ آگے لکھتا ہے:

البیرونی پنجاب سے کابل تک ایک سیاحت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"دریائے سندھ کے مغرب میں ویہند تک جو قندھارا کا دارالحکومت ہے پورشاور (پشاور) سے چودہ فرسخ کا فاصلہ ہے"۔ پھر لکھتا ہے کہ:

اب ایسی حالت میں کہ تمام مورخین ضلع مردان کے موضع ہنڈ کو قدیم وہند واہندیا ویہند کے مترادف خیال کرنے لگے ہیں تو لازماً دریائے سندھ کے کنارے لاہور کو الاھوار قرار دینا پڑے گا جو ویہند سے چار میل کے فاصلہ پہ واقع ہے اور جسے ابوریحان، رشید الدین، اور ابو الفداء نے گندھارا کا دارالسلطنت بتایا تھا۔ مسعودی بھی ۹۱۵ء میں سفر ہندوستان کے موقع پر اس لاہور کو ہندو شاہیہ کا دارالحکومت قرار دیتا ہے۔ پھر اس سے بھی تاریخ کی روشنی میں انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محمود غزنوی نے راجہ جے پال کو اسی ہنڈ کے قریب لاہور میں گرفتار کیا تھا نہ کہ پنجاب کے لاہور میں۔ (یوسف زئی پٹھان)

کیرو لکھتا ہے کہ :-

"عرب کابل کے علاقہ میں داخل ہوئے اور اس سے پہلے گندھارا میں لاہور کے قریب دریائے سندھ کے ساحل تک بھی جا پہنچے۔ پشاور کے یوسفزئی سمہ میں ہنڈ کے پاس موجودہ لاہور، ہنڈ کے مقام پر دریائے سندھ کے گھاٹ سے چار میل اندر کی طرف واقع ہے۔ یقینی طور پر یہی وہ جگہ ہے جس پر عربوں نے حملہ کیا تھا۔ آگے لکھتا ہے،

یہ جگہ کابل سے ملتان جانے والی سڑک پر واقعہ ہے اور فرشتہ نے اپنی تاریخ کے دیباچہ میں جس لاہور کو ہندوشاہیہ جے پال کا دارالحکومت بتایا ہے وہ پنجاب کا شہر نہیں ہے بلکہ یہی لاہور ہے۔ راورٹی نے اس نظریہ کا مذاق اڑایا ہے کہ یہ مقام لاہور ہے انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ مقام اہواز ہونا چاہیئے جو بصرہ کے قریب واقع ہے۔ انہوں نے یہ بھی دلیل پیش کی ہے۔ کہ مہلب رضؓ پنجاب کے موجودہ صدر مقام لاہور تک پیش قدمی نہیں کر سکتا تھا۔ بظاہر اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ گندھارا میں دریائے سندھ کے قریب لاہور نام کا ایک گاؤں واقع ہے۔ جس سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ دوسری طرف یہ بات قریب قریب ثابت ہو چکی ہے کہ قندھار سے مراد گندھارا یعنی قدیم ہندوستان کا وہ علاقہ مراد ہے جو زیریں دریائے کابل کی وادی پر محیط تھا۔ عرب مورخ گندھارا کو قندھار لکھتے تھے۔ مسعودی اور بیرونی نے جہاں جہاں قندھار کا لفظ استعمال کیا ہے اس کا موجودہ قندھار شہر سے کوئی تعلق نہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے پر آباد لاہور نے رفتہ رفتہ اپنی اہمیت کھو دی اور جب مغلوں نے اس شاہراہ کو چھوڑ کر اٹک کا راستہ

اختیار کیا تو یہ مقام اور بھی غیر معروف ہو گیا اور دریائے راوی کے کنارے لاہور کو چونکہ مسلسل شہرت حاصل ہوتی رہی اس وجہ سے اکثر لکھنے والے اسے ہی قدیم لاہور سمجھ کر غلطی کے مرتکب ہوتے رہے۔

کتاب الہند اور لاہور

لاہور کے سلسلے میں ہم کچھ اور ثبوت اور دلائل کتاب الہند سے پیش خدمت کرتے ہیں:۔

۱۔ ملک سندھ ہندوستان کا جز ہے اور اس سے پچھم (مغرب) میں ہے۔ ہمارے یہاں سے سندھ پہنچنے کا راستہ مُلک نیم روز' یعنی سجستان ہو کر ہے اور ہندوستان پہنچنے کا کابل ہو کر۔ لیکن یہی راستہ لازمی نہیں ہے اگر موانع رفع ہو جائیں تو وہاں ہر طرف سے پہنچنا ممکن ہے۔ ان پہاڑوں میں جو ہندوؤں کے ملک کو گھیرے ہوئے ہیں ان حدود تک جہاں پر ہندو قوم کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے اسی قوم یا ان کے مشابہ دوسری قوم کے سرکش لوگ آباد ہیں۔ (کتاب الہند جلد اول' از البیرونی اردو ترجمہ سید اصغر علی شاہ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سنہ ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۶۳)

۲۔ ہندوستان کے پچھم کے پہاڑوں میں مختلف افغانی قبیلے رہتے ہیں جن کا سلسلہ مُلک سندھ کے قریب ختم ہوتا ہے (کتاب الہند محولہ بالا صفحہ ۲۷۰)

۳۔ شہر قنوج سے غزنی:۔ قنوج سے پچھم کی طرف دیامو تک دس فرسخ ہے اور ہر فرسخ چار میل اور میل مساوی ہے ایک کروہ کے۔ دیامو سے کُٹی تک دس' اہار تک دس' میرٹھ تک دس' پانی پت تک دس ' ان دونوں کے درمیان دریائے جون (جمنا) واقع ہے۔ کوتیل تک دس' اور سنام تک دس فرسخ ہے۔ پھر پچھم اور اُتر (شمال) کے

درمیان آدت ہور تک نو، جھنیر تک چھ، لوہارو کے صدر مقام "مند کو ہور" تک جو دریائے ایراوہ (راوی) کے پورب (مشرق) میں ہے۔ (یعنی موجودہ شہر لاہور) آٹھ فرسخ۔ دریائے جندراہ (چناب) تک بارہ، جھیلم تک جو دریائے بیت کے پچھم میں ہے آٹھ قندھار کے صدر مقام ویہند تک جو دریائے سندھ کے پچھم میں ہے۔ بتیس، برشاور (پشاور) تک چودہ، دنپور (یا دیبور) تک پندرہ، کابل تک بارہ، اور غزنہ تک سترہ۔ (کتاب الہند محولہ بالا ص ۲۷۳)

(۴) دریائے سندھ کا منبع اس کے پہاڑ اور شہر

دریائے سندھ اننگ پہاڑوں سے جو ترکوں کے حدود میں ہے نکلتا ہے اگر تم مدخل کی گھاٹیوں سے (مغرب کو) صحرا میں نکلو تو تمہارے بائیں طرف دو دن کی راہ پر بلور اور شمیلان ترکوں کے پہاڑ ہیں جو بھتاوریاں کہلاتے ہیں۔ ان کا بادشاہ بھت شاہ ہے ان کے شہر گلگت، اسورہ اور شلتاس ہیں (جو اس وقت ہنزہ اور بھتستان سے موسوم ہیں) اور ان کی زبان ترکی ہے۔ ان کی لوٹ مار سے کشمیر مصیبت میں رہتا ہے۔ اس کے متصل بدخشان کی سرحد تک شکنان شاہ اور وخان شاہ ہیں) بائیں جانب چلنے والا آبادیوں میں ہوتا ہوا (مغرب میں) قصبہ تک جا پہنچتا ہے اور (دریا کے) دائیں جانب چلنے والا چند متصل دیہاتوں سے ہوتا ہوا قصبہ کے دکھن میں نکلتا ہے اور پھر کلارجک پہاڑ (یعنی مہابن) تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ گنبد نما پہاڑ جبل دنباوند کے مشابہ ہے اس کی برف گھلتی نہیں اور ہمیشہ تاکیشر (ٹیکسیر) اور لاہور سے دکھائی دیتی ہے اس کے صحرا اور کشمیر (یعنی جس زمانہ میں موجودہ ایبٹ آباد اور مانسہرہ کی تحصیلیں کشمیر میں شامل تھیں) کے درمیان دو فرسخ کا فاصلہ

ہیے۔ قلعہ راج گرہی اس کے دکھن (جنوب) اور قلعہ "لہور" اس کے پچھم (مغرب) ہے۔ ہم نے ان دونوں سے زیادہ مضبوط قلعہ نہیں دیکھا۔ (کتاب الہند محولہ بالا۔ ص ۲۷۶)۔

حقیقت یہ ہے کہ مورخین جس لاہور کا ذکر کرتے ہیں وہ یہی گندھارا میں ویہند والا لاہور ہے۔ یہاں وہ سب نشانیاں موجود ہیں جو ایک مضبوط قلعہ اور مرکزی مقام کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بڑی دلیل یہ کہ مجدود بن سلطان مسعود اور اس کے اتالیق ایاز کی قبریں اسی خطہ میں موجود ہیں۔ ایاز کی قبر کا ذکر ہو چکا ہے اور مجدود کا مزار لاہور سے شمال میں وادی سوات کے سخرہ درہ میں بمقام نوخارہ (نوشارہ) کے شمال میں پہاڑ کے دامن میں عام راستے کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ یہ مقام اس کے زمانہ میں ایک اہم تفریح گاہ تھی جہاں وہ تفریح کے طور پر مقیم تھا کہ اچانک وفات پا گیا۔

کابل کا دریائے غوروند

آگے پھر البیرونی لکھتا ہے:۔

(۵) "ملکِ کابش یعنی کابل کے قریب پہاڑوں سے ایک دریا نکلتا ہے جو اپنی شاخوں سمیت غوروند کہا جاتا ہے۔ اس دریا میں حسب ذیل ندیاں شامل ہیں:۔

۱۔ غوزک گھاٹی کی ندی (۲) شہر بروان کے نیچے دّرۂ پنجہیر کی ندی (۳) شروت ندی (۴) ساؤندی جو شہر لبنگا یعنی لمغان سے گذرتی ہے۔ قلعہ درونتہ کے پاس یہ سب ندیاں مل جاتی

لہ یہ قلعہ کبل اور گندف کے درمیان ٹپہ گدون ضلع مردان میں تھا۔

ہیں اور نور اور قیرات ندیاں اس میں گرتی ہیں ۔ یہ سب مل کر
شہر برشاور (پیشاور) کے سامنے ایک بڑا دریا بن جاتا ہے جو اپنے
گھاٹ مہنارہ کے نام سے مشہور ہے جو اس کے پورب (یعنی مشرق)
کنارے پر ایک گاؤں ہے اور قلعہ بیتور (تور ڈیرہ) کے پاس شہر
قندھار یعنی ویہند (ہنڈ) کے نیچے دریائے سندھ میں گرتا ہے"
(کتاب الہند ص ۲۴۶)

(اب یہ نام تبدیل ہو گیا ہے اور دریائے مہنارہ کے بجائے دریائے
کابل یا لنڈے بولا جاتا ہے)

(۶) کتاب پانرت پانینی مصنف کے نام پر ہے ۔کتاب شکہت برت'
اوگر بوت نے تصنیف کی " (کتاب الہند ص ۱۷۸)

یہ دونوں کتابیں علم نحو وصرف پر تھیں، قارئین پر واضح ہو کہ یہ دونوں ہی
کتابیں مذکورہ مصنفوں نے اسی مذکورہ بالا قلعہ" لہور" میں تصنیف کی
تھیں ۔اس وقت بھی پانینی' پنی یا پنڑی کے نام پر اسی لاہور میں جانب
مغرب ایک مقام ہے جسے عام لوگ جانتے ہیں ۔جس سے صاف معلوم
ہوتا ہے کہ یہ مقام پنڑی پانینی کا آرام گاہ تھا ۔جو ویہند (ہنڈ) سے چار
میل دو فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے ۔

(۷) کتاب شکہت برت کے متعلق البیرونی لکھتا ہے :۔
" یہ کتاب اوگر بوت نے تصنیف کی ۔ہم سے بیان کیا گیا کہ یہ شخص
(اوگر بوت) راجہ جے پال کے بیٹے انندپال کا جو ہمارے زمانہ
کا راجہ ہے' اتالیق اور معلّم تھا ۔اس نے یہ کتاب تصنیف
کر کے کشمیر بھیجی لیکن کشمیر والوں نے اس فن میں اپنے بڑھے ہوئے
ہونے کے خیال اور غرور سے اس کی طرف توجہ نہیں کی ۔اوگر بوت

نے راجہ سے اس کی شکایت کی اور اس نے شاگردی کا حق ادا کرنے کے لیے استاد کی خواہش پوری کرنے کا ذمہ لیا اور دو لاکھ درہم اور اسی قیمت کے تحفے کشمیر بھیجے تاکہ جو لوگ اس کے استاد کی کتاب میں مشغول ہوں ان میں تقسیم کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب اس کتاب پر گر پڑے اور کل دوسری کتابیں چھوڑ کر اسی کی نقل و کتابت کرنے لگے۔ وہ لالچ سے ذلیل ہوئے اور کتاب کی شہرت در قدر ہو گئی۔ (کتاب الہند ص ۶۷)

(۸) شہروں کے پرانے نام بدل گئے ہیں اور ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں.........

شہروں کے ناموں کی حالت یہ ہے کہ اکثر نام ایسے ہیں جن سے اس وقت یہ شہر نہیں جانے جاتے اوپل کشمیری نے کتاب سنگھٹ کی شرح میں اس مضمون کے متعلق کہا ہے کہ شہروں کے نام بدل جایا کرتے ہیں خصوصاً جگوں (عرصہ دراز) میں چنانچہ ملتان کا نام شب پور تھا۔ پھر ہنس پور ہوا، پھر بگ پور۔ پھر سانب پور۔ پھر مولستان (مولستھان) یعنی اصلی جگہ۔ اس لیے کہ مول کے معنی اصل اور تان (تھان) کے معنی جگہ کے ہیں۔

(۹) نام بدلنے کے اسباب: جگ تو ایک طویل مدت ہے۔ لیکن اجنبی اور دوسری زبان بولنے والی قوم کے غالب آجانے کے وقت بھی تو ناموں کی تبدیلی بہت جلد ہو جاتی ہے۔ غیر قوم کی زبان سے اُن کا ادا ہونا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ ان کو اپنی زبانوں میں (یعنی تلفظ و لہجہ کے مطابق) بدل لیتے ہیں۔ (کتاب الہند ص ۴۰۰ تا ۴۰۱)

(۱۰) البیرونی ہندوؤں کے متعلق لکھتے ہیں:

" بطلیموس ہمیشہ ان راویوں اور ان کی مبالغہ پردازی کے شوق پر افسوس کرتا رہا۔ ہم کو ان کی غلط گوئی کا ایک نیا اصول معلوم ہوا ہے' وہ یہ کہ ہندو اکثر ایک بیل کے بوجھ کا اندازہ دو ہزار اور تین ہزار من فرض کرتے ہیں اور اس لیے قافلے کو منزل کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لے جانے کے لیے مجبوراً بہت دنوں کی ضرورت ہو گی۔ جن میں بیل اپنا پورا بوجھ ایک کنارے سے دوسرے کنارے منتقل کر لے۔ پس یہ لوگ دو شہروں کے درمیان کی مسافت پورے اتنے دنوں کی راہ کو قرار دیتے ہیں جو اس نقل و حرکت میں اول سے آخر تک صرف ہوں گے۔" (کتاب الہند جلد اول باب ۱۸ ص ۲۶۵)

البیرونی مضافات خوارزم کے بیرون نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا سال ولادت ۳۶۲ھ مطابق ۹۷۳ء ہے۔ غالباً ۴۲۱ھ تک ہندوستان میں رہ کر علوم ہند کی تحصیل و تحقیق میں مصروف رہا۔ بیرونی کئی زبانوں کا عالم تھا۔ فارسی تو اس کی مادری زبان ہی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ، عربی، عبرانی، سریانی، سنسکرت پر بھی اسے پوری قدرت حاصل تھی ۔ زبانوں سے زیادہ وہ علوم جانتا تھا۔

ڈاکٹر گستاؤلی بان اپنی تصنیف تمدن ہند میں لکھتے ہیں:۔

لفظ ہندو قومیت کے لحاظ سے کچھ معنی نہیں رکھتا...

اس سے آگے یہی ڈاکٹر "ہندوؤں میں تاریخ کی کمی" کے عنوان سے لکھتا ہے:۔

یہی تحقیق کی کمی ہے جس کی وجہ سے ان ہزار ہا جلدوں میں جو ہندوؤں نے تین ہزار سال کے تمدن میں تصنیف کی ہیں، ایک تاریخی واقعہ بھی صحت کے ساتھ درج نہیں ہے۔ اس زمانہ کے کسی واقعہ کو معین کرنے کے لئے ہمیں بالکل بیرونی چیزوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی تاریخی کتابوں میں انکی عجیب خاصیت "ہر چیز کو غلط اور غیر فطری صورت میں دیکھنے کی نہایت مبیّن طور پر پائی جاتی ہے اور انسان کو اس خیال پر مجبور کرتی ہے کہ ان کا دماغ ہی ٹیڑھا ہے"۔

داتا گنج بخش اور لاہور

لاہور کی قدامت کے ثبوت میں بعض لوگ داتا گنج بخش کی یہاں تشریف آوری اور مزار کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی اور اس کے غلام ایاز کے ساتھ وہ اُس وقت آئے تھے جب کہ ۳۹۳ھ یا ۴۰۲ھ میں لاہور فتح ہوا تھا۔ لہذا اس بارے میں "روحانی رابطہ"

نامی کتاب کا مندرجہ ذیل خلاصہ قابل توجہ ہے ۔

"داتا گنج بخش ہجویری ۔ جن کا نام علی' والد کا نام عثمان اور حسنی سید تھے' غزنی شہر کے محلہ ہجویر کے باشندہ تھے اور جن کا مزار پنجاب کے شہر لاہور میں ہے" شہزادہ دارا شکوہ اپنی تصنیف سفینۃ الاولیا' میں لکھتا ہے :۔

جس زمانہ میں داتا گنج بخش لاہور میں تشریف لائے تو پہلے اپنی قیام گاہ کے پاس ایک مسجد کی بنیاد رکھی یہ وہی مسجد ہے جس کے صحن میں ان کا مزار ہے ۔ مسجد کے متعلق روایت ہے کہ لاہور میں یہ پہلی مسجد ہے ۔ کشف المحجوب اور دوسری تاریخی کتابوں سے ان کے جو حالات معلوم ہوتے ہیں ان کا سال پیدائش اور وفات صحیح طور پر معین نہیں ہو سکتا اور نہ لاہور میں آنے کی تاریخ معلوم ہو سکتی ہے ۔

مورخوں نے متضاد بیانات درج کئے ہیں ۔ مثلاً ان کے لاہور آنے کی تاریخیں ۴۲۳ھ ۴۳۴ھ تا ۴۳۱ تا ۴۴۰ھ اور ۴۶۱ ھجری بیان کی گئی ہیں اور سال وفات ۴۶۵ ھ اور بعض نے ۴۷۰ ھجری بیان کیا ہے ۔ داتا صاحب کے مزار پر جو کتبہ لگا ہے اس پر بھی سال وفات ۴۶۵ھ ہے ۔ لیکن کتبہ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ۱۲۴۵ھ میں میاں عوض نے چار دیواری بنانے کے وقت لگایا ہو یا اس کے بعد ۱۲۷۸ھ میں نور محمد فقیر نے مزار پر گنبد بنانے کے وقت لگایا ہو تحریر کتبہ قابل اعتبار اس لئے نہیں کہ یہ رسم الخط غزنوی دور کا نہیں بلکہ شہنشاہ اکبر کے زمانہ کا بھی نہیں بلکہ اس کے بہت بعد کا رسم الخط ہے ۔ جس سے صاف ظاہر ہے ۔

یہ کتبہ ۱۲۴۵ھ یا ۱۲۷۸ھ کا بنا ہوا ہے جس کا تاریخی اعتبار سے سند کے طور پہ ماننا خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ مورخین کے متضاد بیان اور سال وفات کے متعلق مختلف تاریخیں مثلاً ۴۶۵ھ - ۴۶۹ھ - ۴۷۰ھ صحیح معلوم نہیں ہوتے بلکہ پہلے پہل جس نے غلطی کر کے تاریخ وفات بلغیر تحقیق کے ۴۶۵ھ لکھ دی تو دوسروں نے بھی بلغیر تحقیق کے نقل در نقل کر دی حتیٰ کہ کتبہ کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس غلط اندراج کی وضاحت داتا صاحب کی اپنی تالیف کشف المحجوب سے بخوبی ملتی ہے کہ وہ ۴۷۹ھ میں بھی زندہ تھے۔ جیسا کہ وہ کشف المحجوب میں شیخ سہلکی کا ذکر اس طور سے کرتے ہیں کہ " اُن کے وطن کا تھا اور وہ ایک نیکوکار کا بیٹا بھی تھا"۔ امام ذہبی کی تالیف "تاریخ اسلام" کے بیان کے مطابق شیخ سہلکی ۴۷۷ھ میں وفات پا چکا تھا۔ کشف المحجوب میں امام اشقانی کا ذکر کرتے ہوئے داتا صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ امام اشقانی علیہ الرحمۃ بعض علوم میں میرے استاد تھے' اور یہی امام اشقانی امام ذہبی کی تصریح کے مطابق ۴۷۹ھ میں وفات پا چکے ہیں لہذا دونوں مشائخ کا ذکر صیغہ ماضی بعید سے ہوا ہے تو اس کے نتیجہ میں داتا صاحب ۴۷۷ اور ۴۷۹ھ میں زندہ تھے۔ بلکہ ۴۸۱ کے ثبوت کے علاوہ ۴۸۵ھ تک ان کی زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسا کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء اپنی کتاب " فوائد الفواد" میں لکھتے ہیں کہ:

"شیخ ہجویری داتا گنج بخش اور شیخ حسین زنجانی دونوں ہمعصر تھے اور ایک پیر کے مرید "۔

شیخ زنجانی کے متعلق مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء جلد دوم میں لکھا ہے کہ:

"محمد غوری کی شہادت کے ایام میں جو ۶۰۲ھ بمقام دھمیک واقع ہوئی شیخ زنجانی زندہ تھے۔"

شیخ جمالی کی تصنیف سیر العارفین میں جو بمقام دہلی ۱۳۱۱ھ میں چھپی ہے صفحہ ۱۲ پر لکھا ہے کہ:۔

"حضرت زبدۃ الاولیاء والمشائخ معین الحق والدین حسن سجزی اجمیری ۶۰۰ھ میں جب لاہور پہنچے تو شیخ المشائخ پیر علی ہجویری، قدس سرہ، اسی سال (یعنی ۶۰۰ھ میں) وفات پا چکے تھے اور شیخ زنجانی زندہ تھے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے شیخ زنجانی سے رخصت لی اور دہلی روانہ ہوئے۔" (ص ۱۲)

یہ تھا خلاصہ عبد الحلیم اثر کی کتاب روحانی رابطہ کا۔"

کشف المحجوب[1] از علی بن عثمان ھجویری معروف بہ داتا گنج بخش کے مقدمہ میں مولوی محمد شفیع لکھتے ہیں:۔

ا۔ "خلاصۃ التواریخ" میں ہے کہ "جناب ہجویری غزنین سے سلطان محمود کے ہمراہ آئے اور سلطان نے فتح لاہور کو ان کے برکات قدم کی طفیل سمجھا" یہ بیان غالباً درست نہیں ہے اس لئے کہ اگر بقول عبد اللطیف سلطان محمود نے لاہور ۳۹۳ھ میں فتح کیا جو غالباً داتا صاحب کے بچپن کا زمانہ ہے یا وہ شاید اس وقت ابھی پیدا

---

[1] کشف المحجوب قدیم ترین نسخہ بقلم خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی۔ مقدمہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مطبوعہ ۱۹۰۰ء لیسی و اہتمام احمد ربانی ایم۔ اے پاکستان ریلوے سروس ۴۲۔ میس روڈ لاہور)

بھی نہ ہوئے تھے" (ص ۴)

۲۔ "خلاصۃ التواریخ" کا یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا کہ جناب (داتا صاحب) سلطان محمود کے ساتھ اس ملک میں آئے۔ اس لئے کہ سلطان کے حملوں کے زمانہ بقول لین پول ۳۹۲ھ تا ۴۱۵ھ (۱۰۰۱ تا ۱۰۲۴ء) تھا"۔ (ص ۲۴)

۳۔ "مفصل حالات پرانے تذکرہ نویسوں میں سے کسی نے نہیں لکھے، یہاں تک کہ ان کی تاریخ ولادت و وفات اور ان کے ورود لاہور کی تاریخ بھی قطعی طور پر معلوم نہیں۔ اندازے سے کہا جاتا ہے کہ ان کی ولادت پانچویں صدی ہجری کے شروع میں ہوئی ہوگی اور وفات کی تاریخ مشہور ۴۶۵ھ اور ۴۶۹ھ کے درمیان بتائی جاتی ہے مگر قیاس چاہتا ہے کہ ان کا وصال اس سے بہت بعد ہوا"۔ (ص ۱۷)

۴۔ افسوس ہے کہ جناب شیخ (داتا صاحب) کے شخصی حالات بہت کم محفوظ رہے ہیں۔ آپ کی تاریخ ولادت معلوم نہیں اور تاریخ وفات جو مشہور ہے وہ بھی یقینی نہیں۔ ان کے لاہور آنے کا زمانہ، ان کے قیام لاہور کی مدت، ان میں سے کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ بعض باتیں جو انہوں نے اپنے متعلق اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھ دی ہیں صرف انہیں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ ان کی تاریخ وفات کے سلسلے میں بھی اسی کتاب سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ سفینۃ الاولیاء مطبوعہ میں دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ: ان کی وفات کی تاریخ ۴۵۶ھ ہے اور ایک دیگر

روایت کی رو سے ۴۶۴ھ ہے مگر خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ "سفینے میں ۴۶۴ھ اور ۴۶۶ھ دیا ہے۔ اسی طرح خزینۃ الاصفیاء ہی میں ہے کہ "نفحات الانس" میں آپ کی تاریخ وفات ۴۶۵ھ دی ہے مگر نفحات کے مطبوعہ اور قدیم نسخوں میں جو میں نے دیکھے ہیں کہیں آپ کی تاریخ وفات درج نہیں ہے۔ بہر حال آپ کے احاطہ مزار میں دو جگہ جامی لاہوری کے دو قطعات تاریخ میں ۴۶۵ھ ہی تاریخ دی ہے اور یہی تاریخ ماثر الکرام، حدائق الحنفیہ، اور خزینۃ الخواطر میں اختیار کی گئی ہے۔ مگر بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ (داتا گنج) اس سے کئی سال بعد تک زندہ رہے۔" (ص۲۲)

۵۔ سفینۃ الاولیاء میں ہے کہ تجرد و توکل کے قدم پر وہ سفر میں رہے اور بہت سی سیاحی کے بعد لاہور پہنچ کر مقیم ہوئے۔ اپنے لاہور کے قیام کا ذکر انہوں نے کشف المحجوب میں صرف ایک جگہ کیا ہے۔ ایک بزرگ کے ذکر میں لکھتے ہیں "ان سے بہت سی روایتیں مجھ کو میرے شیخ کے ذریعہ پہنچی ہیں مگر اس وقت اس سے زیادہ درج کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ میری کتابیں دار السلطنت غزنین میں ہیں خدا اس کا نگہبان ہو! اور میں دیار ہند میں ناجنسوں کے درمیان (قلمی نسخہ ص ۱۲۷ اور روسی ص ۱۱۰) گرفتار ہوں۔ اس عبارت کا آخری حصہ بعض نسخوں میں یوں ہے۔ "... اور میں شہر لہانور میں جو ملتان کے مضافات میں ہے ناجنسوں کے درمیان گرفتار ہوں" اس جملہ سے ظاہر ہے کہ کشف المحجوب کا اقلاً کچھ حصہ لاہور میں

مرتب ہوا" (ص۳)

مولوی محمد شفیع نے داتا صاحب کی تاریخ پیدائش و وفات اور ورود لاہور کے متعلق کافی تحقیق کی ہے جو قابل تعریف ہے لیکن لاہور کے متعلق انہوں نے بھی دوسرے مورخین کی طرح ٹھوکر کھائی۔ حالانکہ اسی مطبوعہ کشف المحجوب کے ص۹۶ (اور قلمی نسخہ ص۱۲۷ اور روسی ص۱۱۱) پہ داتا صاحب کا خود اپنا بیان اس طرح ہے۔

" امّا اندر وقت ہیش ازیں ممکن نشد کہ کتب من بحضرت غزنین حرسہا اللّٰہ ماندہ بود و من اندر دیار ھند درمیانِ ناجنسان گرفتار شدہ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلَی السّراء والضّراء۔"

ان کے اس الفاظ میں لاہور کا ذکر قطعاً نہیں۔ البتہ دیار ھند کا ذکر ہے۔ داتا صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ غزنی خاندان کے زوال کا ہے اور اغلباً غزنی شہر اُس وقت غوریوں کے قبضہ میں آچکا ہے اور خطرے کا وقت ہے، کتابوں کے حصول کے لئے اب وہاں رسائی مشکل ہے اور کتابوں کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ بلکہ اپنی عزت کے متعلق بھی تشویش ہے اور فکر و اندیشہ ہے کہ کہیں بادشاہت کی تبدیلی میں ان کو غزنی سے نسبت کے سبب تکلیف نہ پہنچے۔ وہ ان خدشات کے باعث اپنی حفاظت کے لئے دعائیں بھی مانگتے ہیں۔ لہذا اُن کی اس تحریر سے ان کا زمانہ متعین کرنے میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔

دیار ھند سے مراد موجودہ شہر لاہور نہیں ہو سکتا ہے وجہ یہ کہ ان ایام میں ھند اور لاہور دونوں مقامات دریائے سندھ کے مغربی کنارے جو ہندو شاہیہ اور بعد میں سلاطینِ غزنی کا دارالسلطنت تھا، کے قریب شمال

مشرق میں سولہ میل کے فاصلہ پر پہاڑیوں میں دارھند ہندوؤں کے چند دیہاتوں کا مجموعی نام تھا۔ یہی علاقہ اُس وقت دیار ھند کے نام سے معروف تھا۔ یہاں اب بھی چند گاؤں ہیں جو دارھند کے نام سے یاد کیئے جاتے ہیں۔ اس لئے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ دیارھند سے موجودہ ہندوستان کے دیار و امصار مراد نہیں بلکہ مذکورۃ الصدر ہند کے قرب وجوار کے علاقہ کی طرف اشارہ ہے۔

کافی تحقیق کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ داتا صاحب جب لاہور میں تشریف لائے تو اُس وقت یہ خالص ہندوؤں کا ایک گاؤں تھا جس کا نام بقول البیرونی "مندکوہور" تھا جو کوہار اور کوہارو سے بھی یاد کیا گیا ہے' یہاں انہوں نے اپنی قیام گاہ کے پاس ایک مسجد کی بنیاد رکھی جو اس شہر میں یقیناً پہلی مسجد ہے۔ داتا صاحب کے پاس یہاں سکونت کے لئے کچھ اور لوگ بھی آئے جو غزنوی خاندان کے زوال اور شکست کے باعث گندھارا والے لاہور جو ہندو شاہیہ کے بعد غزنوی سلاطین کا مرکزی مقام تھا' سے نکلنے پر مجبور ہوئے تھے لہٰذا اُنہیں یہاں اقامت پذیر ہونے کے سبب اور نیز قطب الدین ایبک کی خاص توجہ کے باعث "کوہارو" کا یہ چھوٹا سا گاؤں موجودہ شہر میں تبدیل ہوتا رہا اور رفتہ رفتہ لاہور کے نام سے شہرت پائی۔ الغرض لاہور کو قدیم ثابت کرنے کی غرض سے داتا صاحب کی ذات گرامی کا بطور دلیل پیش کرنا درست نہیں۔ سلطان محمود غزنوی کا زمانہ داتا صاحب سے بہت پہلے گذر چکا تھا اور گندھارا والے لاہور میں انہوں نے جامع مسجد بھی بنوائی تھی۔ مندکوہور یا کوہارو یعنی موجودہ لاہور میں مسجد اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ نہ اِس طرف آئے تھے اور نہ یہ شہر اُس وقت اِس نام سے موجود تھا۔

تاریخ کی مزید روشنی

یہاں تک یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ مولوی ابوظفر ندوی کی تاریخ سندھ نظر سے گزری۔ اس کے بعض بیانات سے بھی ان مقامات کی تاریخی اور جغرافیائی حیثیت اور ان کے محل وقوع پر روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ ان سے میری تحقیقات کے نتائج متاثر نہیں ہوتے لیکن میری تحقیق اور ان کے نتائج کی تصدیق اور توثیق ان سے ضرور ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے مطالعے میں آپ کو بھی شریک کر لیا جائے۔ تاکہ آپ میرے اس اطمینان میں بھی شریک ہو جائیں جو اس کے مطالعے سے مجھے ہوا ہے۔

(۱) ویہند۔ ولاہور

مولوی ابوظفر ندوی لکھتے ہیں:-

"۴۴ھ میں ابو مہلب بن ابی صفرہ جو ابن سمرہ کی فوج کے ایک سردار تھے، اپنی فوج لئے ہوئے "ہند" کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کی یہ روانگی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ عربوں میں یہ پہلے شخص ہیں جو "ہند" کے اس دروازے سے داخل ہوئے جس سے آج تک قدیم قومیں آتی رہی ہیں، یہ درہ خیبر تھا۔ مہلب کابل اور پشاور کی درمیانی گھاٹیوں کو طے کر کے سرزمین ہند میں پہنچے تاخت و تاراج کر کے واپس ہوئے۔ مہلب پہلا شخص ہے جو اصل ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ (صد ۲۵ و ۲۶)

(۲) گندھارا

اس زمانہ میں ایک اور ریاست قندھار کی تھی اگو اس کا شمار سندھ میں ہوتا تھا، مگر اس کا حاکم ایک غیر مسلم راجا تھا۔ یہیں سے ایک دریا،

بھی نکلا ہے جو دریائے سندھ میں جا کر مل گیا ہے ... ونسنٹ اے اسمتھ "دی ارلی ہسٹری آف انڈیا" میں لکھتا ہے کہ

جب ۲۵۶ھ میں مسلمانوں نے کابل فتح کر لیا تو وہاں کے راجہ نے قندھار کے ضلع میں آکر مقام "ویہند" کو اپنا پایہ تخت بنایا جو آہستہ آہستہ بڑا شہر ہوگیا، چنانچہ بیرونی کے عہد تک یہ قندھار کا پایہ تخت رہا (ص ۲۰۹ و ۲۱۱)

اس سے آگے بشاری مقدسی (۳۷۲ھ) اور مسعودی (۳۰۳ھ) کے حوالہ سے ویہند پر ان الفاظ میں مزید روشنی ڈالی ہے۔

(۳) ویہند :۔ یہ ریاست عرصہ سے قائم تھی، اس کو قندھار کا ملک کہتے ہیں، اسی کا پایہ تخت "ویہند" ہے، عام طور اس کو سندھ سے الگ اور ہندوستان میں شمار کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہ سندھ میں شامل تھا۔ اس کے متعلق متعدد شہر تھے ان میں سے مشہور یہ تھے، وذہان[۱]، بیتر[۲]۔ لوار[۳]۔ سمان[۴]، قوج[۵] اس کا پایہ تخت ویہند ہے اور اسی نام سے ریاست بھی موسوم اور مشہور ہے۔"

وذہان، سمان اور قوج نام کے شہر اب مفقود ہیں۔ رہا بیتر تو یہ وہی مقام ہے جسے البیرونی نے بیتور کے نام سے یاد کیا ہے اور اب بھی ایک گاؤں کی صورت میں موجود اور مقامی طور پر تور ڈیر کے نام سے معروف ہے اور لوار نامی شہر وہی ہے جسے البیرونی نے ایک جگہ لہور اور دوسرے مقام پر لاہور کے نام سے یاد کیا ہے یہ شہر اب بھی ایک قصبے کی صورت میں موجود اور لاہور ہی کے نام سے موسوم ہے اور یہ دونوں قصبے یعنی لوار (یا لہوار

یا لہور یا لاہور یا الاہوار جو سب ایک ہی مقام کے مختلف نام ہیں) اور بیتر (یا بے تور یا بیتور یا تورڈیر جو سب ایک ہی مقام کے مختلف نام ہیں) ۔ اِس وقت بھی دریائے سندھ کے کنارے پر واقع اور موجود و مشہور قصبہ وسے ہند (یا ویہند یا وِہند یا ہند یا ہنڈ یا انڈ جو سب ایک ہی مقام کے مختلف نام ہیں) کے قریب علاقہ قدیم گندھارا (یا قندھارا یا القندھارا یا قندھار یہ سب بھی ایک ہی علاقہ کے مختلف نام ہیں) میں موجود اور مشہور ہیں۔ زمانہ قدیم میں ویہند اور لاہور ایک ہی شہر تھا جو تین حصوں پر مشتمل تھا، ایک حصہ کا نام ویہند اور دوسرے کا لاہور تھا اور دونوں کے بیچ میں آریانا کا عظیم الشان شہر تھا جو تقریباً چار میل میں پھیلا ہوا تھا اس عظیم الشان شہر کے مغربی کنارے پر بیتور واقع تھا جس میں اِس شہر کی حفاظت کے لئے ایک قلعہ بھی تھا یہ قلعہ بیتور کے نام سے موسوم تھا جسے البیرونی نے بھی قلعہ بیتور ہی کے نام سے یاد کیا ہے ۔ اب بھی ویہند، لاہور اور بیتور کی آبادیاں قصبوں کی صورت میں الگ الگ موجود ہیں لیکن ان کے درمیان میں آریانا کی قدیم آبادی کی جگہ بڑے بڑے مٹی کے ٹیلے نظر آتے ہیں جو آریانا کی قدامت اور اس کی تاریخی عظمت کی کہانی سناتے ہیں ۔ نیز مٹی کے ان ٹیلوں کے گردو پیش میں اسی علاقے میں جہاں آریانا آباد تھا، چھوٹے چھوٹے متعدد گاؤں موجود ہیں ۔ اِن مواضع میں ایک گاؤں آریان ہی کے نام سے ہے ۔ اِس کے علاوہ شیخ، ذکریا، نبے، بیکا تھانو، مانکی، جبر، بازار، ڈھیری اور اللہ ڈیرہ مواضع ہیں۔ آریانا کے مشرقی کنارے پر انبار، کنڈا، اور زیدہ کے گاؤں موجود ہیں ۔ یہ آبادیاں جو اب دیہات کی شکل میں ہیں، درحقیقت آریانا کے محلے تھے ۔

(۴) آگے چل کر ایک اور مقام پر مولوی ابوظفر ندوی لکھتے ہیں :

" وہیند منصورہ سے بڑا شہر ہے، یہاں بکثرت تروتازہ اور پاکیزہ باغات ہیں، جو سطح زمین پر پھیلے ہوئے ہیں، دریا بھی بکثرت ہیں، بارش بھی خوب ہوتی ہے، یہ شہر مجموعہ اضداد ہے، یہاں کے درخت لمبے لمبے ہوتے ہیں، پھلوں کی پیداوار بھی اچھی ہے چیزوں کا نرخ بھی ارزاں ہے، چنانچہ شہد ایک درہم کا تین من (ایک من عربی مساوی ۲۶ تولے، موجودہ وزن تقریباً دو سیر انگریزی) ملتا ہے، اس کے بعد روٹی کے متعلق تو سوال ہی بیکار ہے، یہاں موذی جانور نہیں ہے، تمام شہر بادام اور اخروٹ کے درختوں سے ڈھکا ہوا ہے، کیلے اور دوسرے ترمیوؤں کی بڑی کثرت ہے، ہوا مرطوب ہے، گرمی بھی خوب پڑتی ہے، مکانات لکڑی اور نرکل کے ہیں جن میں کبھی آگ بھی لگ جاتی ہے جیسے مقام سابور (ایران) میں ہیں، یہاں کے لوگوں کے چہروں سے امارت ٹپکتی ہے، اور وہ بری باتوں سے محفوظ رہتے ہیں، غیر مسلموں کی آبادی بہت زیادہ ہے اور مسلمان بہت کم ہیں، پھر بھی ان کے لئے ایک الگ حاکم مقرر ہے جو ان پر اسلامی طریقہ سے حکومت کرتا ہے ۔" (ص ۲۴۲-۲۴۳)

(۵) آگے چل کر ایک مقام پر پھر وہیند کا ذکر ان الفاظ میں آگیا ہے۔

" ہندوستان کی طرف سلطان محمود نے توجہ کی اور ۳۹۲ھ میں ریاست " وے ہند " کو فتح کیا جو قندھار کے علاقہ میں راجہ جے پال کے ماتحت راجپوتوں کی ایک مشہور ریاست تھی ۔"

آگے چل کر لکھتا ہے :

...ملتان کی سرحد سے متصل مقام بھاٹیہ میں ایک مضبوط قلعہ تھا، اگرچہ یہ "لاہور" کے راجہ کے تابع تھا مگر اس کا حاکم بجے راؤ "لاہور" کے راجہ کی پروا نہیں کرتا تھا اور اپنے کو خود مختار سمجھتا تھا، انہی دنوں اپنی طاقت کے نشہ میں غزنہ کے حاکم کے ساتھ کسی سرحدی معاملہ میں بدعنوانی سے پیش آیا سلطان محمود کو جب خبر ہوئی تو ۳۹۵ھ میں ایک جرار لشکر لے کر ملتان کی سرحد پر مقام بھاٹیہ جا پہنچا۔ بجے راؤ نے اپنی شکست سے دل گشتہ ہو کر خودکشی کر لی، قلعہ فتح ہو گیا۔ اور محمود مال غنیمت لے کر غزنہ واپس آیا۔ چونکہ یہ جنگ ملتان کی سرحد پر ہوئی تھی اس لئے سلطان محمود کو یہ خیال تھا کہ ملتان کی ریاست اس معاملہ میں امداد دے گی لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ نوجوان داؤد نے اپنی ناتجربہ کاری سے اس کی مدد نہ کی جس سے محمود ناراض ہو گیا۔ محمود اس وقت تو کچھ نہ بولا لیکن غزنہ پہنچ کر فوجی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ ۳۹۶ھ میں ایک تازہ دم فوج لے کر ملتان پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا مگر اسی کے ساتھ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر میرے اس حملہ کی خبر داؤد کو ہو گئی تو وہ اپنے بچاؤ کی فوراً کوئی تدبیر ضرور کرے گا۔ اس لئے درۂ بولان کے قریبی راستہ کو چھوڑ کر درۂ خیبر کی طرف سے دریائے سندھ پار اتر کر ملتان پر حملہ کرنا چاہا۔ لاہور کے تخت پر اس وقت جے پال کا لڑکا انندپال تھا اور یہ علاقہ اُسی کے ماتحت تھا، محمود نے اس سے کہا کہ مجھے راستہ دے دو کہ میں آسانی کے ساتھ ملتان چلا جاؤں، انندپال راضی ہی نہیں ہوا۔ بلکہ جنگ کے لئے بھی تیار ہو گیا"۔ (صفحہ ۲۶۷، ۲۶۸)

اس کے بعد "حدود العالم من المشرق الی المغرب" ۳۷۲ھ کی ایک تصنیف کے حوالے سے ان مقامات پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ ان معلومات کو بھی ہم یہاں ترتیب کے ساتھ جمع کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) ویہند :-

ویہند بڑا شہر ہے یہاں کا حاکم راجہ جے پال ہے اور خود جے پال راجہ قنوج کے ماتحت ہے، یہاں مسلمان تھوڑے رہتے ہیں اور ہندوستان کے جہاز زیادہ تر اسی جگہ ٹھیرتے ہیں، مشک، موتی، اور قیمتی کپڑوں کی تجارت ہوتی ہے۔

(۲) **لمغان** :- دریا کے کنارے بیچ راہ جو غزنہ کی طرف جاتی ہے، میں ایک شہر ہے جو ہندوستان کی سرحد پر واقع ہے، یہ تجارت کی منڈی ہے، یہاں بھی مندر متعدد ہیں۔

(۳) دینور :

لمغان کے برابر ایک شہر دریا کے کنارے واقع ہے، تجارتی منڈی بھی ہے، لوگ خراسان سے آتے ہیں، مندر بھی بہت ہیں۔ اور ان دونوں شہروں میں بہت سے مسلمان تاجر مقیم ہیں۔ خوش حال اور آباد شہر ہیں (صفحہ ۴۰۱ و ۴۰۲)

(واضح ہو کہ تاریخ فرشتہ نے اس شہر کا نام دیبور اور البیرونی نے دنبور رکھا ہے اور یہاں دینور درج ہے یہ سب نام ایک ہی مقام کے لئے ہیں)

(۴) سندھ :

سندھ کے متعلق مصنف کا خیال ہے کہ وہ دریائے سندھ کے پار کے (مغربی) علاقہ کا نام ہے، سندھ کا حدود اربعہ اس طرح تحریر کیا ہے۔

"اس ملک کے مشرق میں دریائے سندھ اور جنوب میں دریائے اعظم (بحرعرب) مغرب میں کرمان اور شمال میں وہ بیابان ہے جو خراسان سے متصل ہے۔ یہ گرم ملک ہے جس میں بیابان زیادہ اور پہاڑ کم ہیں، یہاں کے باشندے گندمی رنگ کے ہیں اور تیز دوڑنے والے "جمّازہ"، جوتے، خرما، اور مصری کی بہ آمد

خوب ہوتی ہے۔" (صفحہ ۱۰۱۴ و ۴۰۲)

لاہور کی وجہ شہرت

برصغیر کی تاریخ میں لاہور (پنجاب) کو آج جو شہرت حاصل ہے۔ اس سے اس کے دور گمنامی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی شہرت کی بنیاد کی پہلی اینٹ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے رکھی گئی۔ شہاب الدین محمد غوری نے بتیس سال اور چند مہینے حکومت کرنے کے بعد وفات پائی تو اس کا بھتیجا محمود غور کا بادشاہ ہوا۔ محمود قطب الدین کے حسن انتظام سے بہت خوش تھا اور اسے اس کی اعلیٰ صلاحیتوں پر بڑا اعتماد تھا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کی حکومت اُسے سونپ دینے کا فیصلہ کر لیا تا کہ وہ آزادانہ طور پر حکومت چلا سکے۔ محمود نے فیروزکوہ سے قطب الدین کے نام ہندوستان کی بادشاہت کا پروانہ بھیجے جانے کا حکم دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ محمود کا پروانہ اس تک پہنچے کسی نے اسے اس حکم کے اجرا کی خوشخبری سنائی اور مبارک باددی قطب الدین کو یہ معلوم ہوا تو فوراً لاہور (گندھارا) کے لئے روانہ ہو گیا تا کہ بادشاہ کے فرمان کا استقبال کرے لیکن وہ ابھی مندکوہور (پنجاب کے موجودہ لاہور) تک پہنچا تھا کہ قاصد سے ملاقی ہوا چنانچہ ۱۸ ذیقعدہ ۶۰۲ھ مطابق ۲۶ جون ۱۲۰۶ء بروز منگل لاہور (گندھارا) کے بجائے لاہور (پنجاب) میں تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی اور قطب الدین ایبک ہندوستان کا فرمانروا بن گیا۔ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کے مطابق قطب الدین ۱۱ ذیقعدہ کو نواحِ لاہور میں پہنچا تھا، ۱۷ کو لاہور شہر میں داخل ہوا اور اس

لہ اس حصہ مضمون میں تاریخ سندھ سے جو حوالے نقل کئے ہیں وہ مولانا سید ابوظفر ندوی کی تصنیف ہے اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ۱۹۷۰ء میں دوسری بار شائع ہوئی ہے۔

سے اگلے روز رسم تاجپوشی ادا ہوئی۔

اس کی تاجپوشی کو پانچ سال گزرے تھے کہ ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۰ء میں اسی شہر میں ایک روز چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر اس کا انتقال ہو گیا اور بالآخر یہی شہر اس کا مدفن بنا (طبقات ناصری و تاج المآثر) تاریخ کے یہ دو واقعات (تاجپوشی و وفات) اور ایک "اثر قدیم" (ایبک کا مقبرہ) جو سلطان شمس الدین التمش نے تعمیر کرایا تھا (تاریخ مبارک شاہی) پر لاہور (پنجاب) کی شہرت کی بنیاد استوار ہوئی ہے۔

ان واقعات و اثر کو نظر انداز کر کے لاہور (پنجاب) کی شہرت کو دیکھا جائے تو اس کے پونے دو سو سال بعد محمد تغلق (ف ۱۳۵۱ء) اور فیروز تغلق (ف ۱۳۸۸ء) کے عہد تک کی اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پروفیسر محمد شجاع الدین لکھتے ہیں:-

"مشہور سیاح ابن بطوطہ ... ۱۳۳۴ء میں دہلی پہنچا۔ اس نے ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیر کی وہ پنجاب میں بھی آیا لیکن اس نے اپنے سفرنامہ میں نہ لاہور کا ذکر کیا نہ وہ اس شہر کو دیکھنے آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت لاہور ایک معمولی قصبہ تھا اور اُسے کوئی شہرت حاصل نہ تھی۔ محمد تغلق اور فیروز تغلق کے زمانے میں بھی لاہور کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔" (نقوش لاہور لاہور نمبر ص ۴۲)

عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:-

"غوری عہد حکومت، جس نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت قائم کی۔ سلطان شہاب الدین غوری نے نے اُس کی بنا رکھی ... نواحی لاہور کے کھوکھروں نے سر اٹھا رکھا تھا

شہاب الدین نے ان پر چڑھائی کردی اور مدد کے لئے قطب الدین ایبک کو دہلی سے بلوا بھیجا دونوں نے مل کر کھوکھروں کی خوب گوشمالی کی۔ اس کے بعد سلطان غزنی کی طرف لوٹ گیا راستہ میں ابھی توابع غزنی کے ایک مقام دمیک تک پہنچا تھا کہ ایک فدائی کھوکھر نے موقع پاکر اُسے شہید کردیا۔... سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد اس کے برادرزادہ محمود نے فیروزکوہ سے چتر اور خلعت بادشاہی دونوں چیزیں ملک قطب الدین کو بھیجیں اور سلطان کے نام سے مخاطب کیا، سلطان قطب الدین ایبک ۶۰۲ھ ہجری میں دہلی سے لاہور جاکر بروز منگل ۱۷ ماہ ذلیقعدہ کو تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ ابھی اس کی حکومت کو زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی کہ وہ لاہور میں مصروف چوگان بازی تھا کہ گھوڑے سے گر کر جان بحق ہوا اور اسی شہر میں دفن کردیا گیا۔ اس کی قبر آج بھی زیارت گاہِ مردم ہے۔ اس کی مدت حکومت بیس سال تھی۔ مگر اس میں سے صرف چار سال وہ بحیثیت سلطان رہا۔"

مصنف مفتاح التواریخ لکھتا ہے:۔

"شہاب الدین محمد غوری کی وفات ہوئی تو اُس کا بھتیجا، غیاث الدین محمود غور کا بادشاہ ہوا اور اُس نے قطب الدین کو تاج و تخت کے فرمان اور دیگر چیزیں ارسال کرکے خطاب شاہی عطا فرمایا۔ چنانچہ قطب الدین لاہور میں تخت شاہی پر بیٹھا اور ہندوستان کا بادشاہ ہوا، اور کامیاب حکومت کی ۶۰۷ھ میں وہ گھوڑے سے گر کر فوت ہوا۔ اس کی قبر لاہور میں ایبک روڈ پر واقع ہے اس کے بعد اس کا لڑکا آرام شاہ بادشاہ ہندوستان ہوا۔

گندھارا کی سلطنت اور ہندو

۱۸۰ ق۔م کے قریب وسط ایشیا (ملک تاتار و خطا) کی ایک بدوی قوم یہیوچی ملک خطا سے نقل مکانی کرتی ہوئی ترکستان اور افغانستان کی چراگاہوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی کیوں کہ اس وسیع خطے کی ایک اور بدوی قوم ہی اُنگ نُو جو بعد میں ہُن کہلائی، اس سرزمین میں طاقت پکڑنے لگی تھی۔ یہیوچی قوم کے ایک سردار کادفس اول نے ۴۰ء میں شاہی اقتدار حاصل کر کے پشاور میں کشن خاندان کی بنیاد رکھی۔ اور پنجاب اور افغانستان کے ملکوں کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اس کے ایک جانشین کادفس دوم نے ۸۵ء میں اپنی سلطنت کو مشرق کی طرف بنارس تک وسعت دی اور جنوب کی طرف سیستان، بلوچستان، سندھ، راجپوتانہ، کاٹھیاواڑ کو سر کر کے ہندوستان میں ایران کے پارتھیوں کے اقتدار کا خاتمہ کیا۔ اسی خاندان کے ایک اور بادشاہ کنشک نے شمال مشرق میں چینی ترکستان کو اور شمال مغرب میں خراسان کے ملک کو بحیرۂ خزر تک سر کیا اور کوشن خاندان کے اقتدار کو بہار سے لے کر بحیرۂ خزر تک اور چینی ترکستان سے لے کر کاٹھیاواڑ تک وسعت دی۔ کنشک اعظم بہت بڑی شان و شوکت رکھنے والا بادشاہ تھا۔ اشوک اعظم کی طرح یہ بادشاہ بھی بدھ مت کا پُر جوش پیرو اور مبلغ ہو گزرا ہے۔ اس بادشاہ نے دوآبہ جالندھر میں بدھ مت کے پیروؤں کی ایک بہت بڑی کونسل منعقد کی۔ اس وقت تک بدھ مت کے پیروؤں میں بدھ کی مورتی کی پوجا کا رواج بہت زور پکڑ گیا تھا۔ لہٰذا کنشک کے عہد میں سنگ تراشی کے فن کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ جا بجا بدھ کے مجسمے تراش کر نصب کئے گئے۔ پتھر کے علاوہ سونے

اور چاندی کے بڑے بڑے مجسمے بھی بنائے جاتے تھے۔ کوشن خاندان کے بادشاہوں اور خاص کر کنشک کے عہد کے بنے ہوئے بہت سے آثار اس وسیع سلطنت کے مختلف حصوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ بامیان افغانستان کی کھدائی سے بدھ کا ایک مجسمہ ملا ہے جس کی اونچائی ساٹھ فٹ ہے، اس کے علاوہ کشن خاندان کے بادشاہوں کے بہت سے سکے بھی ملے ہیں جو دنیا کے عجائب گھروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ کنشک اعظم کا عہد حکمرانی ۱۲۵ء سے ۱۵۲ء تک تھا۔ دوسری صدی مسیحی میں وسط ایشیا سے ہنوں کی ایک اور بدوی قوم کا ریلا اٹھا جس نے ۲۲۶ء میں نہ صرف یہوچیوں کی گندھارا سلطنت کا خاتمہ کر دیا بلکہ جنوبی ہند کی اندھرا سلطنت اور جنوب مغربی ہند میں ایران کے پارتھیوں کی سلطنت کو بھی پامال کر ڈالا۔ اس قوم کا نام ساکا تھا۔

ساکا خاندان کا آخری بادشاہ لگتورمان تھا۔ اس زمانہ میں ایک برہمن وزیر نے اس خاندان سے حکومت چھین لی اور ہندو برہمن شاہی خاندان کی بنیاد رکھ دی، اس برہمن کا نام کلریا للیہ تھا۔ تقریباً دو ہزار سال بعد "وے ہند" دوبارہ ہندو سلطنت کا مرکز بن گیا۔ وے ہند (ہنڈ) دریائے سندھ کے مغربی ساحل پر پشاور سے چودہ فرسخ (۵۶ میل) مشرق کی طرف واقع تھا (بحوالہ البیرونی)

ہندوؤں کی قدیم تاریخ پر ایک نظر

ڈاکٹر گستاؤلی بان تمدن ہند میں لکھتے ہیں کہ "لفظ ہندو قومیت کے لحاظ سے کچھ معنی نہیں رکھتا۔"

آریوں کا تیسرا جتھا مشرق کی طرف چلا۔ یہ لوگ راستہ کی تکلیفیں برداشت کر

کے اپنے عیال و اطفال کے ہمراہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر پہنچے عرصہ دراز تک دریائے سندھ پر رُکے رہے۔ یہاں اس علاقے میں اس وقت کالی نسل کے لوگ یعنی کول اور دراوڑ آباد تھے۔ ایرانیوں نے چار ہزار سال قبل ان کا ہند نام رکھا تھا۔ "ہند" ایرانیوں کے ہاں بمعنی سیاہ و کالا تھا۔ جیسا کہ حافظ شمس الدین شیرازی کا ایک شعر ہے۔ ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا — بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

کول اور دراوڑ کی مرکزی مقام کا نام انہیں کے سبب سیاہ یعنی ہند سے مشہور تھا۔ اور ہند کے قریب لاہور (لاہوار) بھی ان کا صدر مقام تھا اور یہاں ان کی انتظامیہ رہا کرتی تھی۔ مقصد یہ کہ ہند (وے ہند) اور لاہور (الاہوار) جو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع تھے۔ یہ دونوں شہر آریوں سے قبل موجود تھے۔ آریوں کے یہاں پہنچتے ہی ان سے مڈبھیڑ ہوئی مختصر یہ کہ آریوں نے کول اور دراوڑ سے دریائے سندھ کے مغربی علاقہ پر جہاں ان کی بودوباش تھی، زبردستی قبضہ کرکے ان کو پنجاب کی طرف جلاوطن کر دیا۔ آریہ نے کول اور دراوڑ کے شہر "ہند" اور لاہور کو بھی مرکزی مقام بنا لئے اور ان دونوں کے درمیان ایک عام بڑا شہر آریانا کے نام سے آباد کیا جو اس موجودہ وقت میں آریان کہلاتا ہے۔ "ہند" نام شہر میں بادشاہ کی رہائش اور دیگر خصوصی مکانات تھے اور تحقیق علم کا مرکز بھی یہیں تھا۔ اور یہ شہر قلعہ بند تھا۔

آریہ لوگ پہلے ماد، مادئی میدی اور میڈی کے ناموں سے اُس وقت پکارے جاتے تھے جب یہ خراسان اور اس کے متعلقہ علاقوں میں آکر بس گئے تھے۔ قیاس یہ

ہے کہ جلاوطن اسرائیلیوں نے ان کو آریا نام دیا ہوگا۔ وجہ یہ کہ یہ لوگ آگ کے پجاری تھے تو انہوں نے دیکھ کر اسے آرین سے یاد کیا ہوگا۔ آرین یعنی آگ والے جس کا مطلب آگ کے پجاری ہے جو پشتو لفظ ہے اموسوم کیا ہوگا۔ اُر بہ معنی آگ اور لفظ " ن " نسبت کے لئے جیسا کہ یمن۔ مانگین۔ خاورین وغیرہ معلوم رہے کہ اُر نام کا شہر حضرت ابراہیم کا مسکن تھا۔ اس شہر میں آگ کی پرستش کی جاتی تھی ۔ اور اس شہر میں ہمیشہ اُر یعنی آگ جلنے کے سبب یہ اُر کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ الغرض آرین یعنی آگ کے پجاری جو ایک مذہبی نام معلوم ہوتا ہے۔ یعنی جو لوگ اس عقیدے کے قائل تھے وہ آرین ، آریا پکارے گئے اور جب یہ آریا لوگ ہند (دے ہند) پہنچے اور یہاں سکونت اختیار کی اور اس کے علاوہ حکومت بھی بنائی تو اسی "ہند" کے وجہ سے ہندو مشہور ہوئے لفظ " و " نسبت کے لئے ہے یعنی ہند والے یا ہند کے باشندے۔ مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہندو نام نہ نسب کے وجہ سے اور نہ مذہب کے وجہ سے ہے، بلکہ یہ مسکنِ "ہند" کی نسبت کے لئے معلوم ہوتا ہے، جس کے سبب یہ ہندو کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہاں انہوں نے کافی عرصہ بعد ہندی زبان بنائی۔ ہندی میں لفظ "ی" نسبت ہے ہند کو یعنی "ہند" کی زبان۔ اگرچہ پہلے وقت میں یہ اقوام ایک ہی زبان بولتی تھیں۔ جس کا نام اریک تھا۔ اور پھر سنسکرت کی بنیاد رکھی۔ ابتدائی "وید" نامی کتاب بھی یہاں بنائی گئی تھی۔ وید بھی "دے ہند" کا مخفف معلوم ہوتا ہے۔ یہاں انہوں نے اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان مذکورہ تصانیف میں تختون قوم کے علماء سے زیادہ امداد لی گئی۔ ان علماء میں پنی (پنڈی) اور جلو کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی

لاہور کے مغربی حصہ میں پنی (پنڈی) کی جائے رہائش کے آثار اسی کے نام سے آج تک موجود ہیں* ہندوؤں کی ریاست جب "ہند" میں مضبوط ہوئی اور جتنے علاقے اس کے زیر اثر آئے اس علاقے کا نام ہندوستان ہوا یعنی راجدانی ہند کا زیر اثر علاقہ۔

اور عرصہ دراز گزارنے کے بعد دریائے سندھ جس کا پشتو نام اباسین ہے، جو عبرانی نام دریائے آباتا کے مترادف ہے، کو عبور کر کے پنجاب میں داخل ہوئے۔ یہاں انہیں اصلی باشندوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن آریا اصلی باشندوں کی نسبت زیادہ مضبوط اور فن جنگ میں ماہر تھے آخر فریق مخالف پر غالب آئے اور دن بہ دن تمام موجودہ شمالی ہندوستان پر قابض ہوئے۔ بعد میں اسی علاقے کا نام بارت یا بھارت مشہور ہوا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ بارت یا بھارت "عبرتا" سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ "عبرتا" آرامی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں جائے عبور مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جب ان لوگوں نے دریائے سندھ عبور کیا تو بارتی کہلائے اور اس پار علاقے کا نام بارت ہوا۔ یہ نام بھی اسرائیلیوں کا رکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں ہندوؤں سے پہلے جو قوم رہتی تھی وہ سیاہ یعنی کالے تھے۔ اور اسی سبب ان کے مرکزی مسکن کو ہند کہا جاتا تھا مگر آریا سرخ سفید رنگ کے تھے لیکن یہ ان کالے لوگوں کے وارث بننے کے سبب سے بھی ہندو مشہور ہوئے۔ آریا یعنی مادی یا میدی لوگ اسرائیلی جلاوطنوں سے کافی عرصہ پہلے سارے ملک خراسان اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں آباد تھے اور نینوا کے اشوریوں کے ماتحت ایک کمتر زندگی گزارتے تھے پہاڑوں سے اترے ہوئے وحشی اور جاہل قسم کے لوگ تھے۔

تعلیم و تمدن سے بے بہرہ تھے۔ ان میں نہ کوئی سیاسی شعور تھا اور نہ کوئی تنظیم یا حکومت' یہ تو ان کی خوش قسمتی سمجھئے کہ اسرائیلی جلاوطنوں کے جتھے در جتھے یکے بعد دیگرے انکے ہاں بسانے کے لئے اشوری بادشاہوں نے شام اور نینوا سے بھیج دیئے۔ واضح ہو کہ اسرائیلیہ کا پہلا جتھہ شاہ اشوری پال یا پلول کے ہاتھوں جلاوطن ہوا جو کہ سات سو اکہتر (۷۷۱) برس قبل از مسیح تھا۔ ان جلاوطنوں میں روبن اور جد کے دو قبیلے تھے۔ جد کی اولاد اِس وقت تک افغانستان میں آباد ہے اور جدرانی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

ان دنوں اسرائیلیہ کا بادشاہ ناحم تھا اور یہودا کا بادشاہ عزریا تھا۔ اس کے بعد بھی بنی اسرائیل کی جلاوطنی کا یہ سلسلہ جاری رہا تھا جو اس واقعہ سے ایک سو اسی سال کے بعد بخت نصر کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی پر ختم ہوا۔ اور ان اسرائیلی جلاوطنوں کی بدولت ۸۰۰ ق م کے بعد سے آریہ لوگوں میں لکھنے کا رواج بھی شروع ہوا۔

الغرض ان کے آنے سے میدیوں یعنی ان آریا لوگوں کو بہت فائدے حاصل ہوئے کیونکہ اس وقت آریوں کی حالت خراب تھی۔ اس بارے میں فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستا ولی بان کا بیان اس کی اپنی تصنیف "تمدن ہند" میں یوں درج ہے کہ

"ان میں مطلق کسی قسم کی سیاسی نظامات یا ذات یا حکومت نہ تھی۔ ان کی معاشرت کی بنیاد خاندان پر تھی اور ساری قوم ایک تھی اور اس میں بالکل مدارج نہ تھے، ہر ایک خاندان کا باپ خود ہی پروہت، کاشتکار اور سپاہی تھا۔ یہ مختلف پیشے جو آگے چل کر ذات کی تقسیم کے باعث ہوئے اُس وقت ملے جُلے ہوئے تھے۔ رگ وید کے بڑے دیوتا اگنی آگ کا دیوتا ہے "سوم" مُنَشّی

عرق ہے جو اس کو تند کرتا ہے" اور اس کے برعکس اسرائیلی جلاوطن، تعلیم یافتہ ہنر مند حکما نجومی طبیب اور ماہر نفسیات تھے تمدن و معاشرت میں بہت آگے تھے غرض یہ کہ جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہے کہ ہر کام میں اسرائیلی جلاوطن، ان کے استاد بنے اور نیز ان مقامی لوگوں کو زندگی گزارنے کے اچھے طریقے سکھائے۔ اور نظم و ضبط سے بھی واقف کرایا۔ اسرائیلیوں نے جہاں اپنے ملک شام کی طرح کوئی چیز یعنی دریا، پہاڑ، گاؤں۔ ندی نالہ۔ اور علاقہ دیکھا تو اس کا وہی شامی نام رکھا۔ سیاست میں بھی ان جلاوطنوں کو بڑا دخل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میدیوں اور پھر خورس کی سلطنت بننے میں انہی کا ہاتھ تھا۔ اشوریوں اور پھر بابلیوں سے انتقام لینے کے جذبات بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کو ایک گونہ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔

جیسا کہ قصص القرآن جلد سوم ص ۱۷۱ میں درج ہے کہ :۔

"بابلی سرداروں کا ایک وفد خورس کے پاس اس وقت پہنچا جب کہ وہ اپنی مشرقی مہم میں مصروف تھا۔ خورس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ وہ اپنی مہم سے فارغ ہو کر ضرور بابل پر حملہ کرے گا اور ان کو بابل کے ظالم اور عیاش بادشاہ سے نجات دلائے گا۔ خورس جب اپنی مہم سے فارغ ہو گیا تو حسب وعدہ اُسنے بابل پر حملہ کر دیا" اسرائیلی تو اپنے آپ ہر فن مولا تھے۔ میدی یعنی آریا لوگ ہمیشہ ان کے محتاج رہتے۔ اس کے علاوہ ہخامنشی خاندان کے عہد سلطنت میں جو دو سو بیس سال سے مستحکم اور مضبوطی سے قائم تھا، اسرائیلی، حاکم قوم کی شکل میں

تھے اس وجہ سے ان کی ہر بات میں وزن تھا جو نام رکھتا قبول عام ہوتا اور جو بولتا وہی ہوتا۔ انکی ہی زبان سے آریا لوگوں نے بہت الفاظ سیکھے اور ہر کام میں ان سے امداد لی اور سبق حاصل کر لیا۔ اسرائیلی قوم اور ان کے انبیاء اس علاقہ میں دینی تبلیغ اور راہنمائی کرتے تھے۔ علم و فضل کے مالک تھے۔ کمی صرف یہ تھی کہ اپنے ملک سے جلاوطن تھے اور منتشر حالت میں آباد تھے لیکن پھر بھی ان کی فضیلت اپنی جگہ پر قائم تھی۔ مثال کے طور پر اگر کوئی وکیل، قاضی، عالم، حکیم، ماہر فن یا کوئی ہنرمند شخص بادشاہ وقت کے قانون کی خلاف ورزی کے سبب جیل خانہ میں چلا جائے تو ان کا علم و ہنر جیل کے دروازے پر ہی نہیں رہ جاتا بلکہ وہ علم و ہنر وغیرہ اس کے ساتھ جیل کے اندر ضرور جائے گا۔ لہذا اسرائیلی خدا سے نافرمانی کے جرم میں تباہ و برباد ہوئے اور غلامی کے سزاوار بن گئے لیکن ان کی سمجھداری اور علم و ہنر اس حالت میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ؕ (سورہ دخان)

اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے ان کو جہان والوں کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہے۔

معلوم رہے کہ ہندکا نام آج کل پشتو زبان میں انڈ اور ہنڈ زیادہ استعمال ہوتا ہے اور انگریزی میں بھی انڈ بولا جاتا ہے اس وقت سارے ہندوستان کو انڈیا اور اس کے باشندگان کو انڈین کہتے ہیں۔ مگر گذشتہ دور میں یہ نام محدود تھا۔

آریا نسل کی کوئی حقیقت نہیں

اس سلسلہ میں ایک نامور مورخ محمد مجیب بی اے آکسن پروفیسر تاریخ و سیاست

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اپنی تالیف تاریخ تمدن ہند عہد قدیم ۱۹۵۱ء عثمانیہ یونیورسٹی پریس حیدرآباد دکن میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

۱ ؛ یورپ میں سنسکرت کا مطالعہ شروع ہوا۔ اور اس کا پتہ چلا کہ سنسکرت۔ ایرانی لاطینی۔ یونانی اور جرمن زبانیں ایک اصل سے ہیں۔ تو ہند جرمانی یا ہند یورپی زبان اور تہذیب اور اس تہذیب کو پھیلانے والی آریہ نسل کا تصور قائم ہوا۔ اصل میں یہ تصور بے بنیاد تھا آریہ نسل کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ جسمانی خصوصیات جو آریہ نسل کی پہچان مانی جاتی ہیں ان قوموں میں جو اپنے آپ کو آریہ کہتی ہیں۔ اس کثرت سے نہیں پائی جاتی ہیں کہ ان کے آریہ ہونے کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے لیکن قومیت کے پرستاروں نے اس عقیدت کے ساتھ آریہ نسل کے گن گائے کہ ایک دنیا دھوکے میں پڑ گئی نسل کا لفظ اب اس قدر رائج ہو گیا ہے کہ غلط فہمی کے اندیشوں کے باوجود اسے ترک کرنا مشکل ہے۔ (صفحہ ۱۹)

۲ ؛ آریوں کے مذہب میں آگ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اور آریوں میں مورتوں (بتوں) کی پوجا کا رواج نہ تھا۔ صفحہ ۵۳

۳ ؛ سنسکرت ابجد کے دندانی حروف ٹ وغیرہ اور کسی ہند جرمانی زبان میں نہیں ملتے۔ سنسکرت کے بہت سے الفاظ کا مادہ آریائی نہیں معلوم ہوتا۔ صفحہ ۵۴۔

۴ ؛ آریہ دراصل کسی نسل کا نام نہیں ہے۔ بہتر تو یہ ہوتا ہم اس لفظ کو بالکل چھوڑ دیتے۔ اور ان لوگوں کے لئے جو اپنے آپ کو ہندوستان میں آکر "آریہ" کہنے لگے کوئی اور نام تجویز کر لیتے مگر یہ اصطلاح اس قدر رائج ہو گئی ہے کہ اسے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اسی سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ غلط فہمی سے بچنے کی یہ صورت ہے کہ ہم یاد رکھیں کہ آریہ سب گورے اور قد آور نہیں تھے

سب کی ناک اونچی۔ بال سنہرے اور آنکھیں نیلی نہیں ہیں۔ انہیں آریہ صرف اس بنا پر کہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے آپ کو آریہ کہتے تھے۔ آریوں کے اصل وطن کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ اب اکثر محقق اس پر متفق ہیں کہ آریہ نسل کا گہوارہ دریائے ڈینیوب کی وادی تھی یہاں سے اس کے قبیلے اِدھر اُدھر جاتے رہے وہ قبیلے جو ہندوستان پہنچے درۂ دانیال سے گزر کر ایشیائے کوچک اور شمالی ایران ہوتے ہوتے آئے۔ ۱۲۰۰ ق م کے لگ بھگ شمالی ہندوستان میں آباد ہونے لگے تھے۔ زرتشتی مذہب کی مقدس کتاب ژنداوستا اور رگ وید کی زبان میں اتنا کم فرق ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ آریا کے ہندوستان آنے اور رگ وید کے مرتب ہونے کے درمیان بہت لمبا عرصہ نہ گزرا ہوگا۔ (صفحہ ۵۵)

۵ ؎ سات سو ق م کے بعد سے ان میں لکھنے کا رواج بھی آہستہ آہستہ شروع ہوا اشوک کے کتبات یا تو کھروشٹی (خروشتی) رسم خط میں ہیں جو مشرقی افغانستان اور پنجاب میں رائج تھا یا براہمی رسم خط میں ہیں۔ کھروشٹی (خروشتی) ایک قدیم آرامی رسم خط سے اخذ کیا گیا ہے جو پانچ سو ق م میں رائج تھا یہ دائیں سے بائیں طرف لکھا جاتا تھا۔ آریوں نے اس رسم خط کی علامتوں کو اپنی زبان کی اصوات اور حروف میں تبدیل کر لیا۔ براہمی ابجد کے چھیالیس حروف کی شکلیں معین کی گئیں اور اسے دائیں سے بائیں طرف کے بجائے بائیں سے دائیں طرف لکھنے کا قاعدہ بنا۔ غالباً پانچ سو ق م تک براہمی ابجد مکمل ہو گئی تھی۔ پانی نی (پنی) نے جس کا زمانہ چوتھی صدی ق م تھا اس کو صحیح مانا ہے اس زمانے میں یا اس کے کچھ بعد براہمی رسم خط کی دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک شمالی دوسری جنوبی۔ پانی نی (پنی) کے قواعد نے رسم خط کے ساتھ زبان کو بھی ایک معیاری شکل دے دی اور جو کام کئی سو برس سے آہستہ آہستہ ہو

ساتھ اس کی تکمیل کر دی۔ یہیں سے ویدی زبان کا سلسلہ ختم اور سنسکرت کا شروع ہوتا ہے۔ بول چال کی زبانیں اس کے بعد بھی رہیں۔ اور ان کو کچھ نہ کچھ ترقی بھی ہوتی رہی لیکن پڑھے لکھے شائستہ لوگوں کی زبان سنسکرت تھی۔

(صفحہ ۵۷)

۶ ÷ آریوں نے شمال مغربی ہندوستان (یعنی ہند) میں آباد ہونے کے بعد تمام بھجن یکجا کر لئے۔ اور اس مجموعے کا نام رگ وید رکھا۔ رگ وید ہند جرمانی تہذیب کی سب سے پرانی یادگار ہے اور اس کی ادبی خوبیوں کو دیکھئے تو ایک کرشمہ سے کم نہیں۔ رگ وید کے بھجن اس وقت گائے جاتے جب پوجا کے لئے آگ جلائی جاتی۔ یا سوم کے پودے کا رس نکالا جاتا اس سے شراب بنتی تھی جس کا پینا عبادت میں داخل تھا اور اسے آریہ پسند بھی کرتے تھے۔ رگ وید مرتب ہو گیا تو اس کے وہ بھجن جن میں سوم کو مخاطب کیا گیا تھا الگ کر کے ایک نیا مجموعہ تیار کیا گیا جو سام وید کہلاتا ہے۔ صفحہ ۵۸

۷ ÷ آریوں کی خاندانی رسمیں مثلاً گھر کے ایک مرکزی مقام پر ہر وقت آگ جلتی رکھنا اور دولہا دلہن کا اس آگ کے گرد چکر لگانا۔ صفحہ ۶۹

۸ ÷ عورتیں بس گھر میں پوجا کی آگ جلتی رکھتیں اور چڑھاوے اور نذر کے لئے ضروری سامان مہیا کرتیں۔ صفحہ ۷۱

۹ ÷ دولہا کے ساتھ برات ضرور آتی۔ دلہن کا ہاتھ دلہا کے ہاتھ میں دیا جاتا۔ دونوں پوجا کی آگ کے گرد طواف کرتے۔ صفحہ ۷۲

۱۰ ÷ ہندو مذہب عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ زندگی کا ایک نظام ہے اور جو شخص اس نظام کو قبول کر لے وہ عقائد میں آزادی کے ساتھ انتخاب کر سکتا ہے۔

(صفحہ ۱۴۲)

۱۱ ۔ اس نئے دور میں مذہبی اتحاد پسندی نے ہر فرقے اور نسل کو جس نے ہندو نظام زندگی کو قبول کیا۔ سماج اور مذہب میں داخل کر لیا۔ صفحہ ۲۱۴ ۲ ،،
اور پروفیسر مکس میولر کے نزدیک یہ آریا یا جیسا کہ ہم اس وقت انہیں آرین پکارتے ہیں ایک کلچرل گروپ تھا۔" (احمد چاگلا بحوالہ یوسفی)

پنی' پانیئی' پینیئی' پر ایک نظر

قبل ازیں پنی کا ذکر ہو چکا ہے لہذا ضروری ہے کہ اس کا تعارف بھی کیا جائے اس کو غیر افغان مورخین نے پانینی اور پینینی، کے نام سے بھی یاد کیا ہے لیکن اس کا اصل اور صحیح نام پنی تھا۔ اور وہ نسلاً ان اسرائیلی جلاوطنوں کے اولاد سے تھا جو مادیوں کے ملک میں جلاوطن ہو چکے تھے افغان مورخین نے اس کو غرغشت افغان قبیلہ سے منسلک بتایا ہے۔ غرغشت یعنی وہ اسرائیلی افغان قبائل جو غرجستان یا گرجستان میں آباد ہو چکے تھے اور وہاں ان کی اپنی ریاست بھی بن گئی تھی جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ لہذا ان کا ایک گروپ یعنی قبیلہ بنایا گیا تھا جس سے افغانوں کا تیسرا بڑا قبیلہ غرغشت کے نام سے موسوم کیا گیا۔ غرغشت میں تین بڑے قبائل شامل تھے۔ جن کے نام یہ ہیں دانی، مندو، اور بابی'۔ دانی کے چار بیٹے، کاکڑ، ناغر، پنی، دادی، تھے۔ بموجب بیان تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی پنی کے اٹھارہ بیٹے تھے اور اس کے تمام بیٹوں کے نام سے الگ الگ خیل اور قبیلے بن گئے ہیں۔ پنی کے بڑے بیٹے کا نام سہودا اور سہودا کے ایک بیٹے کا نام پتھان تھا۔ شجرہ نسب یوں ہے۔ پنی بن دانی بن غرغشت بن قیس عبدالرشید واضح ہو کہ دانی قبیلہ (بنی دان) شام میں بھی موجود تھا جس کا ذکر کتاب مقدس کے قضاۃ (اردو) باب اٹھارہ صفحہ ۲۲۹ یوں ہوا ہے کہ۔

"بنی دان کے گھرانے کے چھ سو مرد جنگ کے ہتھیار باندھے ہوئے (مقام)

صرعہ واستال سے روانہ ہوئے ۔ ۔۔ بنی دان نے شہر بنایا اور اس میں رہنے لگے ۔ اور اس شہر کا نام اپنے باپ دان کے نام پر جو اسرائیل کی اولاد تھا، دان ہی رکھا لیکن پہلے اس شہر کا نام لیس تھا۔ باب ۱۳ ۔۔۔ جس کا نام سمسون تھا اس دانی گھرانے کے منوحہ نامی کا بیٹا تھا ،،

یعنی دور قضاۃ کے مشہور رہنما اور بہادر شخص سمسون نامی اس دانی خاندان سے تھا۔ اب ایک اور دانی کے متعلق بھی ذکر ضروری ہے ۔ وہ دانی ایل نبی ہے جو اسرائیلی اسیران میں تھا اور وہ خورس شاہ ایران کے بابل کو فتح کرنے کے وقت بابل میں موجود تھا ۔ اور دارا کے ابتدائی عہد میں زندہ تھا جس کا ذکر کتاب مقدس میں دانی ایل کے عنوان سے کیا گیا ہے ۔ پنی بن دانی کا زمانہ بھی اس کے ساتھ ایک ہی معلوم ہوتا ہے ۔ دوئم یہ کہ دانی ایل نبی کی سمجھداری اور علمی مدارج بہت ہی اونچے ہیں اور یہی علمی قابلیت اور سمجھداری پنی مذکورہ میں بھی ظاہر ہے لہذا غالب رائے یہ کہ پنی اس دانی نبی کا بیٹا ہے اور افغان مورخین کے شجرہ نسب کے مطابق بھی پنی بن دانی درج ہے ۔ پنی ،، اس وقت افغانوں کا ایک بڑا نامور قبیلہ ہے اور مختلف مقامات پر بہت پھیلا ہوا ہے یہاں تک کہ ضلع چٹا گانگ میں بھی ایک قصبہ پنیلی کے نام سے موجود ہے غرغشت قبائل کا اصل وطن کوہ سلیمان کا علاقہ ہے ۔ ان میں سے قبیلہ پنی زیادہ تر علاقہ سیوی (سبی) میں آباد ہیں ۔

ہندوؤں کے عقائد و تعارف ان کی اپنی نظر میں

ہندوؤں کے عقائد و تعارف پر ان کے اپنی تحریر سے یہ بات سامنے آتی ہے ۔ کہ زمانہ قدیم میں وہ بت پرست نہیں بلکہ آتش پرست تھے اور ہندوستان میں آنے کے بعد بت پرست بنے ۔ تاتاری اور ساسانی نسل کے قدیم باشندوں کو وہ اپنا ہم نسل سمجھتے ہیں البتہ افغان نسل کو اسرائیلی کہکر ایک علیحدہ قوم تصور کرتے اور انہیں اسرائیل، پٹھان اور افغان قوم کے ناموں سے پکارتے ہیں نیز محمد غوری سے تغیر شاہ تک کا زمانہ وہ افغانی دور سمجھتے ہیں ۔ اس کی تصدیق میں تاریخ ٹاڈ راجستان جلد اول مترجم منشی دوارکا پرشاد افق

لکھنوی ۱۹۱۴ء کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱ ؛ قدیم شجروں میں ہندوؤں کا نام دیوتاؤں کے نام پر موجود نہ ہونے سے یہ باور کرنا خلاف عقل نہیں کہ بیشنو مذہب کے قبل مورتی پوجا کا رواج نہ تھا۔ قدیم تواریخ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ منتر جنتر۔ نوگرہوں اور مورتیوں کا رواج کرشن چندر کے بعد ولایت کشمیر سے ہندوستان میں مروج ہوا۔ مورتی پوجا کی رفتہ رفتہ ایسی ترقی ہوئی کہ عوام الناس کل چیزوں کو پوجنے لگے۔ دیوتا تینتیس کروڑ ہو گئے جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں، دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی ایسی باقی نہ رہی جس کی پرستش نہ کی گئی ہو۔ سورج سے لے کر چمار کی ماپی (رالپی) کو بھی لوگوں نے پوجنا شروع کر دیا۔ کرشن ایک، مگر پرستش سات صورتوں میں۔ کرشن جی کی مورتیں راجپوتانہ کی مختلف ریاستوں میں موجود ہیں۔ صفحہ ۹۴

۲ ؛ اب سے بارہ سو برس پہلے شری رام چندر جی کے تخت حکومت پر ایک گئو خوار (ایرانی) نے قدم رکھ کر ہندوؤں کے سورج کا خطاب حاصل کیا۔ وہ کبھی باور نہ کریں گے کہ دنیا کی قدیم ترین قوم کی موجودہ نسل یزدجرد بادشاہ خاندان ساسانی کے بقائے نام ہے راجہ گرو ہا بھیل بہرام گور کا بیٹا تھا جس کے ایک بیٹے کو پٹن کی حکومت حاصل تھی۔ ہم آگے چل کر رانا کے خاندان کا ایرانی نسل سے تعلق ظاہر کریں گے۔ صفحہ ۵۷، ۵۶، ۴

۳ ؛ اودے پور کے تاجدار تمام ہند کے فرمانرواؤں سے افضل و صاحب عظمت ہیں ہندوستان کے راجے تاجپوشی کی تقریب میں رانا اودے پور ہی کے ہاتھ سے تلک کراتے اور اس رسم کے وقت ان کے سامنے سر ادب خم کرتے ہیں۔ تلک آدمی کے خون سے لگایا جاتا ہے۔ اودے پور کے فرمانرواؤں کا خطاب رانا ہے اور وہ اپنے کو نوشیرواں عادل کی اولاد سمجھتے ہیں۔ جس نے علاوہ اور ملک کے

ولایت ہندوستان میں بھی علم فتح گاڑا۔ نوشیرواں کی زندگی میں نوشیزاد اس کا بیٹا جو شہزادی قیصرِ روم کے بطن سے تھا۔ عیسائی ہو گیا اور بہت سے رفقاء کو ساتھ لے کر ہندوستان میں قیام پذیر ہوا۔ اس کی اولاد ہندوستان میں باقی رہ گئی۔ اودے پور کے رانا کو اس کی نسل سے تعلق ہے۔ صفحہ ۵۹ ہم

۴ ⁂ چونکہ دہلی کے تاتاری شہنشاہ کو لڑکیاں دینا ہندوؤں کے ہاں ایک بدنما دھبہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے داغ بدنامی سے بچنے کے لیے یہ بات پیدا کی کہ گو سلسلہ حسب و نسب بہت پرانا اور رشتہ بہت دور کا ہے تاہم ہمارے اور تاتاری بادشاہ کے بزرگ ایک ہی تھے آخر میں اس خیال نے ان کے دل کو قدرے مطمئن کر دیا کہ آمیزش خون بزرگان قدیم کے خون ہی سے ہے۔ صفحہ ۵۸ ہم

۵ ⁂ محمود غزنوی کی یورشوں اور خاندان افغان (محمد غوری) کے حملہ اول کے موقعوں پر اس دیوتا (یعنی کرشن جی کا بت) کو برج چھوڑنا پڑا۔ غیر متعصب شاہان مغلیہ کے مذہب ہندو سے مخالفت کرنا کیا معنی، ان کے اس دیوتا کو برج میں دوبارہ متسلط کر کے یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ خود بھی کنھیا جی (کرشن جی) کی معتقد اور آدھے ہندو اور آدھے مسلمان ہیں۔ جسے دیو کی نظمیں جن میں رادھا کشن کے حسن و عشق کی تصویریں کھینچی ہوئی ہیں اکبر کے بہت ہی پسند خاطر تھیں ہندو اسے کرشن کا پریمی مانتے ہیں۔ جہانگیر جس میں بھی راجپوت خون کی آمیزش تھی۔ اکبر کی طرح کنھیا جی کا بہت معتقد تھا۔ شاہ جہان جس کی ماں راجپوت راجکماری تھی۔ شیو جی کا بڑا بھگت اور سدھ روپ سنیاسی کا مرید تھا۔ صفحہ ۸۸۶

۶ ⁂ بابر نے جو یک جہتی کا رشتہ قائم کیا تھا اور اکبر، جہانگیر و شاہ جہان نے جس تعلق کو مضبوط کیا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی حماقت سے توڑ دیا۔ ۶۶۹

۷ ⁂ اورنگ زیب قوم راجپوت کا جانی دشمن تھا مظلوم راجپوتوں نے اس کے ظلم

کے انتقام میں اس کی نسل کو نیست و نابود کر دیا۔ صرف ایک صدی میں ملک نے اس کے کمبخت ہاتھوں سے خلاصی پائی۔ لیکن ظالم اسرائیل کی آخری نسل کے ظالم (افغان) ہمیشہ کے واسطے اورنگ زیب کی طرح گناہ کے شریک رہیں گے کیونکہ انہوں نے ہر ایک بت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے میں ذرا بھی خیال رحم نہ کیا۔ اگر یہ ظالم (افغان) ایک یادو نشانی باقی رہنے دیتے تو میں شاید ان کے احکام و رسوم، دستور و رواج، دلاوری شجاعت، عدل و انصاف کا فوٹو دنیا کے سامنے کھینچ سکتا۔ لیکن ان کی نقصان رسانی و غارت گری کی عادت نے ایک بھی نقش باقی نہ رکھا جو چیزیں قابلِ دید و پرستش تھیں ان کو تباہ کر ڈالا صفحہ ۱۲۰۶

۸:۔ لکھشمی نے سمت ۱۳۳۱ بمطابق ۱۲۷۵ء میں تخت پدر پر جلوہ فرمایا۔ اس کے عہد حکومت کو تاریخی دنیا میں خاص شہرت حاصل ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پٹھان بادشاہ علاؤالدین خلجی نے وحشیانہ بے رحمی سے چتوڑ پر ۱۲۹۰ء میں دھاوا کیا۔ ہندوستان کے تمام شہروں سے بارونق اور مال و دولت سے مالا مال تخت گاہ تباہ و برباد کی گئی۔ صفحہ ۴۹۸

۹:۔ ہمایوں کے عزل سلطنت سے ان کی بھی مٹی خراب رہی۔ شیر شاہ نے چغتائی فرمانرواؤں سے حکومتیں چھین لیں اور پٹھانوں کی بادشاہت کے قدم جما دیئے۔ ۵۸۹"

ملتان میں افغانوں کی حکومت

لودھی خاندان:۔ اس سے پیشتر کہ عہدِ اکبری کے بعد عہدِ جہانگیر وغیرہ کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس تسلسل کو قائم رکھا جا سکے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر سی روداد ملتان کے لودی افغان سربراہان کی قلمبند کی جائے جو دلچسپی کا باعث ہوگی اور ایک بہت اہم غلطی فہمی کا ازالہ بھی۔ ان افغان سربراہان نے الپتگین اور سبکتگین (۳۵۱ء تا ۳۹۰ھ) کے دورِ حکومت میں ملتان میں اپنی بادشاہت کا آغاز کیا تھا اور تین پشت حکومت کرنے کے بعد سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ان کی بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔ ان کا پہلا

بادشاہ شیخ حمید تھا جس کا مختصر ساذکر اس کتاب میں کیا جا چکا ہے۔اس کے بعد اس کا بیٹا نصر یا نصیر ، بادشاہ ہوا اور پھر اس کا بیٹا ابو الفتح داؤد بادشاہ بنا۔ نصر اور اس کے بیٹے کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ملحد ہو گئے تھے جو در حقیقت ایسا نہ تھا بلکہ مخالفین کی ایک سیاسی چال تھی۔جس کا انجام سلطان محمود غزنوی کے دوبار ملتان پر حملہ آور ہونے اور ابو الفتح داؤد کو ۳۹۶ھ میں شکست دے کر باجگزار بنانے اور پھر ۴۰۲ھ میں ملتان سے افغانوں کی حکومت کو ختم کرنا تھا جیسا کہ اسی دوران ۴۰۱ھ میں غور کے بادشاہ محمد سوری افغان پر قلعہ آہنگراں میں سلطان نے وعدہ خلافی کر کے اچانک حملہ کیا اور غوریوں کی بادشاہت کو ختم کیا تھا۔الغرض اسی سیاسی چال اور پروپیگنڈے کو اس قدر ہوا دی گئی تھی کہ غیر تو غیر خود افغان قوم بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔نصر کے چچازاد بھائی شیخ رضی لودی علیہ رحمتہ جس کو شیخ حمید نے ملتان سے قندہار کی طرف دین اسلام کی تبلیغ کے لئے بھیجا تھا اور اس نے دو سال پہاڑوں میں مسلسل تبلیغ کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔اس پر بھی اس پروپیگنڈے کا برا اثر ہوا تو اس نے قندہار سے ایک تادیبی خط نصیر کو پشتو زبان میں نظم کی شکل میں لکھا جسے محمد ہوتک نے اپنی مشہور تصنیف . . . . . . پٹہ خزانہ میں جو حکومت کابل کی وساطت سے شائع ہوا ہے ، من وعن شائع کیا ہے جس میں اس نے نصر کو لکھا ہے کہ تم الحاد کی طرف مائل ہو گئے ہو جو ہمارے لئے باعث شرم ہے اور لودی خاندان تمہاری وجہ سے بدنام ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔نصیر نے ان کو اس خط کے جواب میں الحاد اور قرامطہ و اسماعیلی عقائد سے انکار اور اپنے اسلامی عقیدے کا اظہار بھی ملتان سے خط کے ذریعہ پشتو زبان میں نظم کی شکل میں کیا۔جسے مصنف پٹہ خزانہ نے من وعن شائع کیا ہے۔

نصیر کے اس جوابی خط کو ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے حضرات اس سے مستفید ہو سکیں اور نصیر کے دلی جذبات اور اسلامی عقیدہ کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔

دَ الحاد پہ تور، تورن سوم — زہ لرغون خو ملحد نہ یم
زما دښمنہ ہسې تورا کړی — کہ ملحد یم لہ دښمنہ یم
لہ اسلامہ نہ تر پلمہ — تورانو څخہ پہ تر پلہ یم
گروہ می ہغہ لرغونی دی — اوس ہم کروړ پہ لرغونہ یم
دَ اسلام پر ہسک بہ ځلم — وَ تورانو تہ زہ تیارہ یم
دَ لودی زوئے سنتی یم — د حمید لہ لوړ کہالہ یم
تورانی دښمن چې وائی — زہ لہ گروہہ پہ آمرہ یم
وائي تور تاسی ډرو ہوی — زہ مومن ستاسی پہ تلہ یم
دَ دښمنو وینا دی مغلکہ — زہ لودی یمہ څو زہ یم

غفر اللہ الماضین ورحمت اللہ علی الذین اعتصمو بحبل اللہ المتین ط

ترجمہ:۔ میں الحاد کے الزام سے بدنام ہوا اگرچہ میں ابتدا ہی سے ملحد نہیں ہوں۔ میرے دشمن ویسے ہی بہتان لگاتے ہیں۔ درحقیقت میں دشمن کا ملحد ہوں۔ جب سے بحیثیت قوم ہم مسلمان ہوئے ہیں آج تک میں اسی دین پر قائم ہوں لیکن تورانیوں کے نزدیک میں دین سے کنارہ کش ہوں۔ میری جماعت اور گروہ وہی پیشرو آباؤاجداد ہیں اور ابھی بھی میں ان کے نقش قدم پر مضبوطی سے قائم ہوں۔ میں اسلام کی بلندی کو چمکاؤں گا اور چمکتا ہوں اگرچہ تورانیوں کے نزدیک میں اندھیرا ہوں۔ میں لودی کا بیٹا اور اہل سنت ہوں۔ حمید کے بلند گھرانے اور نسل سے ہوں۔ تورانی دشمن کا کہنا ہے کہ میں اپنے گروہ یعنی اسلام سے روگردان ہوا ہوں۔ یہ سب بہتان ہے بدگمانی پیدا کر کے مجھے آپ کی نظروں میں حقیر بنانا ہے۔ اگرچہ درحقیقت میں مومن ہوں اور آپ کے نقشِ قدم پر قائم ہوں۔ دشمنوں کا پروپیگنڈا اور باتیں نہ سنو۔ میں لودی اور پکا مسلمان ہوں، جب تک میں زندہ ہوں۔ گزرے ہوؤں کو خدا بخشے اور خدا کی رحمت ہو اُن پر جس نے خدا کے احکام مانے ہیں ''

اب ایک اور موضوع :۔ نصر کے خط میں تورانی دشمن سے فریاد اور تورانیوں کی اس دشمنی کو جسے وہ اوائل اسلام کے وقت سے یاد کرتا ہے' کی تشریح اور کچھ بحث ضروری سمجھتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اوائل اسلام میں ماہویہ نامی ایک افغان حکمران جو سوری خاندان سے تھا اور اس وقت وہ مع اپنے قبیلہ کے مذہباً دین عیسوی پر قائم تھا' یزدگرد ساسانی شاہ ایران کے ماتحت مرو کا مرزبان تھا۔ اسی زمانہ میں یزدگرد عرب سے شکستہ اور پریشان حال اِدھر اُدھر پھرتے تھے۔ اچانک مرو اس خیال سے روانہ ہوا کہ ماہویہ عربوں کو شہر سے نکال کر اس کو پناہ اور امداد دے گا لیکن اس کے برعکس ماہویہ نے یزدگرد کو مرو میں داخل ہونے سے روک دیا اور عربوں کے تحفظ کا خیال رکھ کر جنگ پر آمادہ ہوا۔ یزدگرد مرو سے ناکام پھرا اس واقعہ کے متعلق تاریخ ابن خلدون حصہ اوّل رسولؐ اور خلفائے رسولؐ میں درج ہے کہ :۔

یزدگرد بعدہ' خراسان آیا۔ اس قصد سے کہ لشکر جمع کر کے مسلمانوں سے مقابلہ کرے' مرو کی طرف روانہ ہوا۔ اس سفر میں فرخ زاد اور مملکت ایران کے دہقانوں کے لڑکے بھی یزدگرد کی رکاب میں تھے۔ یزدگرد نے ملوک چین' فرغانہ' خزر اور کابل سے مدد طلب کی۔ کوچ و قیام کرتا ہوا مرو کے قریب پہنچا۔ مرو کے مرزبان ماہویہ کے لڑکے نے یزدگرد کو مرو میں داخل ہونے سے روک دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یزدگرد نے مرو کی حکومت ماہویہ سے چھین کر اپنے برادر زادہ کو دینے کا قصد کیا تھا۔ اتفاق یہ کہ ماہویہ' مرزبان مرو اس سے مطلع ہوگیا یزدگرد بخوفِ جان بھاگ کر مرو سے دو فرسخ کے فاصلہ پر ایک چکی چلانے والے کے گھر میں جا چھپا۔ چکی چلانے والے نے اس سے چار درہم طلب کئے۔

یزدگرد نے کہا' میرے پاس روپیہ' پیسہ نہیں ہے لیکن میری یہ پیٹی

لے لو۔ چکی والے نے کہا، مجھے درہم کی ضرورت ہے اور تم مجھے پیٹی دیتے ہو۔ چکی چلانے والے نے اس کے ظاہری لباس سے اسے جھوٹا سمجھ کر مار ڈالا اور لاش کو اسی کے پاجامے میں باندھ کر دریا میں ڈال دیا اور عیسایان مرو نے یہ سن کر ایک جلسہ کیا اور اس کے حقوق سابقہ کے لحاظ سے دریا سے نکال کر تابوت میں رکھ کر تادس (دخنہ) میں دفن کیا۔ یزدگرد کی حکومت بیس برس رہی، ازاں جملہ سولہ برس عرب کی لڑائیوں میں مصروف رہا۔ ملوک ساسانیہ کی حکومت کا سلسلہ اس کے مرنے سے منقطع ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قتیبہ نے فتح صغد (علاقہ توران) کے وقت دو عورتیں گرفتار کی تھیں۔ جو مخدج بن یزدگرد کی اولاد سے تھیں۔ مخدج کی ماں سے یزدگرد (یا یزدجرد) نے بہ زمانہ قیام "مرو" میں تعلق قائم کر لیا تھا، پس اس کے بطن سے بعد از موت یزدگرد، ذاہب الشق نامی لڑکا پیدا ہوا چونکہ وہ یزدگرد کے قتل کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس وجہ سے مخدج کے نام سے موسوم ہوا۔ پھر اس کی اولاد خراسان میں پیدا ہوئی۔ قتیبہ نے ان دونوں عورتوں کو جو اس کی نسل سے تھیں حجاج کے پاس بھیجا۔ اور حجاج نے دونوں یا ان میں سے ایک کو ولید کے پاس بھیج دیا جس کے بطن سے یزید ناقص بن ولید پیدا ہوا۔"

کہتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کا والد سبکتگین، مخدج بن یزدگرد کی نسل سے تھا اور ترکستان یا توران کا باشندہ تھا۔ افغانوں سے ان کی یہ دشمنی قدیمی تھی اور اس دشمنی نے البتگین کے وقت سے زیادہ شدت اختیار کی اگرچہ سبکتگین کے وقت میں جنگ نہ کرنے کا معاہدہ آپس میں ہوا تھا لیکن سلطان محمود غزنوی کے عہد میں پھر حالات سخت خراب ہو گئے تھے۔

توران کے متعلق جغرافیہ خلافت مشرقی باب سی ویکم میں درج ہے کہ:۔

"دریائے آکس (جیحون) فارسی بولنے والی قوموں اور ترکوں کے درمیان یعنی
ایران وتوران کے درمیان، ایک حد فاصل مانا جاتا تھا"
تمدن ہند کے مصنف گستاولی بان لکھتا ہے کہ :۔
"لفظ تورانی سے دراصل وہ اقوام مراد ہیں جو ترکستان کے باشندے ہیں"
تاریخ ابن خلدون حصہ ششم، غزنوی اور غوری سلاطین، اردو ترجمہ علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی صفحہ ۲۴۹ پر سلطان محمود کے نسب کے بارے میں یوں درج ہے کہ:۔

"سلطان محمود حکومت فارس کے آخری بادشاہ یزدجرد (یا یزدگرد) کی نسل سے تھا۔ ابوالقاسم حمادی نے تاریخ مجدول میں لکھا ہے کہ امیر سبکتگین محمود کا باپ، یزدجرد کی نسل سے تھا جس وقت زمانہ خلافت امیرالمومنین عثمان رضی اللہ میں یزدجرد مقام مرو میں ایک چکی پیسنے والے کے مکان میں مارا گیا۔ اس کے اہل وعیال اور خاندان بحال پریشان ترکستان چلے آئے اور ضرورت اور زمانہ کے لحاظ سے ان سے اور ترکوں سے باہم رشتہ داریاں اور قرابت پیدا ہوگئی۔ دو چار پشت کے بعد علم و دولت مفقود ہونے کی وجہ سے ترک کے نام سے مشہور ہوگئے ایک مدت تک ان اطراف میں ان کے عالیشان مکانات ان کے بزرگوں کے نام کو زندہ کئے ہوئے تھے۔ اس کا سلسلہ نسب یزدجرد تک اس طرح سے پہنچتا ہے کہ محمود بن سبکتگین بن جوق قراالحکم بن قرارسلان بن قراملت بن قرانعمان بن فیروز بن یزدجرد بادشاہ فارس"

سلاطین غزنوی

الپتگین، سبکتگین محمود غزنوی، مسعود بن محمود، محمد بن محمود، مودود بن مسعود، مسعود ثانی بن مودود، علی بن مسعود، عبدالرشید بن محمود، فرخ زاد بن عبدالرشید، ابراہیم بن مسعود ثانی، مسعود ثالث بن ابراہیم، شیرزاد بن مسعود ثالث،

ارسلان شاہ بن مسعود ثالث، بہرام شاہ بن مسعود ثالث، خسرو شاہ بن بہرام شاہ
خسرو ملک بن خسرو شاہ آخری تاجدار (بحوالہ سالنامہ کابل ۱۹۳۳ء)

اور آگے ایک دلچسپ واقعہ مذکورہ ابنِ خلدون کے صفحہ ۲۶۲ پر یوں درج ہے کہ :-

"کہ سلطان محمود نے ایک بار خلیفہ عباسی قادر باللہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی کہ چونکہ اکثر بلاد خراسان میرے قبضے میں ہیں اور فلاں فلاں شہروں پر خلافت مآب (یعنی آپ) قابض ہیں۔ بنظر سہولت انتظام مملکت ان شہروں کو اس خانہ زاد کو (یعنی مجھے) عنایت فرمائیں۔ خلیفہ عباسی نے اس درخواست کو منظور فرما کر فرمان شاہی بھیج دیا۔ دوبارہ سلطان محمود نے اسی قسم کی درخواست سمرقند کی بابت بھیجی۔ خلیفہ عباسی درخواست دیکھتے ہی برہم ہو گیا اور لکھ بھیجا کہ 'معاذ اللہ میں اس درخواست کو منظور نہ کروں گا اور اگر تم بغیر میری اجازت اس طرف قدم بڑھاؤ گے تو میں تم پر دنیا کو تنگ کر دوں گا' سلطان محمود کے تیور اس جواب سے چڑھ گئے۔

ایلچی سے ترش رو ہو کر بولا' جا خلیفہ سے کہہ دے کہ سمرقند کے نہ دینے کا خمیازہ برا ہوگا۔ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ میں ایک ہزار ہاتھی لے کر دار الخلافت بغداد پر چڑھ آؤں اور اسے ویران کر کے اس کی خاک ہاتھیوں پر بار کر کے غزنی لاؤں، ایک مدت کے بعد دربار خلافت سے ایلچی واپس آیا اور سلطان محمود کو ایک خط سر بمہر دیا۔ خواجہ ابو نصر زوزنی نے خط کھولا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد الف، لام، میم لکھا ہوا تھا اور آخر میں الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد و صحابہ اجمعین' تحریر تھا۔ سوائے اس کے اور کچھ نہیں لکھا تھا۔ سلطان محمود اور اس کے درباری امراء، وزراء، کاتب دنگ رہ گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ ابوبکر قہستانی (افغان) نے جو ابھی کسی امتیازی درجہ پر نہیں پہنچا تھا۔

عرض کی کہ چونکہ سلطان نے بغداد کی پامالی کی دھمکی دی تھی خلیفہ عباسی نے سورہ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ کی طرف جواب میں اشارہ کیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے ابرہہ اصحاب فیل کا کیا تھا وہی نتیجہ بغداد پر ہاتھیوں کی فوج کشی سے تمھارا دیکھنے میں آئے گا۔ سلطان محمود اس جواب سے بیحد متاثر ہوا۔ معذرت کا عریضہ لکھا اور تحائف کے ساتھ ایلچی کو رخصت کیا۔

سلطان محمود کی پیدائش دسویں محرم ۳۶۱ھ اور وفات ۴۲۱ھ ہے"

الغرض یزدگرد کے قتل کے بعد ماہویہ سوری نے مزید طاقت پکڑی اور اپنی تمام قوم کے ساتھ وہ مسلمان ہو کر عربوں کا پورا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اپنی فوجی قوت کو از سر نو مرتب کیا اور عربوں کی حمایت میں ہر جنگ میں وہ شامل ہوتا۔ مسلمانوں کے لئے "مرو" ایک اہم اور مضبوط مقام بن گیا۔

واضح رہے کہ خاندان سوری، لودی، خلجی اور سروانی وغیرہ افغانوں کے ایک ہی گروہ "بتنی" کی ذیلی شاخیں ہیں۔ بتنی کی کل ذیلی شاخیں ۷۷ ہیں جو طوالت کے سبب بیان نہیں کر سکتا تھا اور انہیں مذکورہ افغان قبائل نے محمد غوری سے لے کر شیر شاہ و سلیم شاہ اور آخر میں احمد شاہ ابدالی تک ہندوستان پر بادشاہتیں کی ہیں۔ ان کی دینداری اور دین اسلام کی اشاعت کا سلسلہ، ان کی طرز حکومت اور نیک اعمال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ لوگ اسلام کے شیدائی تھے اور کفر و الحاد کے سخت مخالف حالانکہ یہی لوگ انہیں سوری، لودی اور خلجی (غلزئی) وغیرہ کی نسل سے تھے جن کے متعلق سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں الحاد اور بے دینی کا فتویٰ لگایا گیا تھا۔ اگر وہ کفر و الحاد کی مشتہری درست ہوتی تو کم از کم انہی کی اولاد میں ضرور وہ اثر قائم رہتا مگر ایسا کوئی اثر نہیں دیکھا گیا بلکہ ان کی دینداری کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ انہوں نے شہنشاہ اکبر کے مذہبی خیالات کی سخت مخالفت کی اور مقابلہ کیا۔ اور کچھ تو افغانوں کی لامرکزیت اور زیادہ تر اکبر کے ساتھ ہندوؤں کے مضبوط

تعاون کے سبب افغان حکومتیں تباہ و برباد ہوئیں۔ اکبر نے ہندوؤں کو دوست اور معزز بنایا اور افغانوں کو دشمن۔

غزنوی خاندان اور ہندو

اس میں شک نہیں کہ سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی نے ہندوؤں سے بار بار جنگیں لڑیں۔ ان جنگوں میں افغان قوم کی اکثریت بھی جہاد کی نیت سے شریک تھی اور فعال کردار ادا کیا تھا۔ ہندوؤں کو مغلوب کر کے صرف باجگزار تو بنائے گئے لیکن وہ اپنے مساکن اور ریاستوں پر بدستور چھوڑے گئے۔ پھر ان سے قریبی تعلقات بھی بنا کر حکومت کے کاموں میں شریک کر لئے گئے۔ فوجی خدمات سپرد ہونے کے علاوہ سلطنت اور ملکی سیاست میں بھی ہندوؤں کا بڑا دخل تھا۔ بڑے بڑے عہدوں پر وہ فائز تھے۔ ان سب مراعات کے باوجود وہ شرارت اور سرکشی کیا کرتے تھے۔ ان کا بڑا کام یہ تھا کہ سلاطین غزنی کو افغانوں کے متعلق ناراض اور بدگمان کریں۔ نتیجہ یہ کہ دونوں فریقوں کے درمیان میں نفاق و نفرت نے شدت اختیار کی۔

واقعہ یہ ہے کہ[1]: ہندوؤں نے سلطان محمود کی وفات پر اس کے بیٹوں یعنی محمد اور مسعود کو آپس میں لڑا دیا۔ مسعود نے ان کی شہ پر اپنے بھائی محمدؔ پر حملہ کر کے اس کو گرفتار کر کے اندھا کرا دیا اور ایک قلعہ میں قید کر دیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسی ہندو لشکر نے سلطان مسعود کو گرفتار کر کے تمام شاہی خزانہ لوٹ لیا اور اس کے بھائی محمد کو جو قید میں تھا۔ آزاد کر کے اسے زبردستی تخت نشین کرایا اور مسعود کو اس کے سامنے بطور مجرم پیش کیا۔ محمد نے مسعود کو قید کر دیا لیکن محمد کے بیٹے احمد نے اپنے باپ کی اجازت کے بغیر اپنے چچا مسعود کو قید خانہ میں قتل کر دیا۔ سلطان مسعود کے قتل کا حال

---

[1] خلاصہ از آئینہ حقیقت نما (ص ۲۴۴ سے ۲۶۴ تک) مصنفہ مؤرخ اسلام مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی مطبوعہ نفیس اکیڈمی بلاسس اسٹریٹ کراچی۔

سن کراس کا بیٹا مودود باپ کا انتقام لینے کی غرض سے بلخ سے روانہ ہوا۔ محمد نے اس کا مقابلہ کیا لیکن محمد اور اس کا بیٹا احمد دونوں لڑائی میں مارے گئے۔ سلطنت مودود کے قبضے میں آگئی۔ چونکہ مودود کی کامیابی زیادہ تر ہندوؤں کی مرہونِ منت تھی۔ اس لئے مجبوراً ان کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ وقت گزرتا رہا تاآنکہ سلطان بہرام شاہ کا دور آیا۔ ہندوؤں نے اس کو بھی افغانوں کے خلاف بھڑکایا اور اسے فوجی مدد بھی بہم پہنچائی۔ بہرام شاہ نے ہندوؤں کی فوج اور ماتحت ہندو راجاؤں اور ٹھاکروں کو ہمراہ لے کر غوریوں پر حملہ کر دیا لیکن اس جنگ کا نتیجہ ہندوؤں اور بہرام شاہ کی توقعات کے خلاف نکلا۔ بہرام شاہ کو جنگ میوند[1] میں عبرتناک شکست ہوئی۔ اس کی فوج کے سپاہی اور ہندو بری طرح مارے گئے۔ غوریوں نے مکمل فتح کے بعد پہلے کام یہ کیا کہ دریائے سندھ

[1] میوند کی لڑائی میں افغانوں کی تعداد کم تھی اور دشمن کی تعداد بہت زیادہ اور ہر قسم کے اسلحہ سے لیس تھے۔ جس سے افغان سراسیمہ ہو کر پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ زنانہ سنگر میں جب یہ حال محسوس ہوا تو ملالی نامی ایک خاتون نے بلند آواز سے گانا شروع کیا۔ جس کا پہلا شعر یہ تھا:۔

کہ پہ میوند کِہ شہید نہ شوی موڑی خدائیگو۔ لالیہ بی ننگی تہ دِہ ساتینہ[2]

ترجمہ :۔ (اگر میوند کی لڑائی میں تم شہید نہ ہوتے خدا کی قسم میرے محبوب یہ تمہاری بہت بے غیرتی کی زندگی ہوگی) افغانوں پر اس شعر نے جادو جیسا اثر کیا، نئے ولولے اور جوش کے ساتھ دشمن پر زخمی شیروں کی طرح ٹوٹ پڑے اور بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ میوند کی لڑائی میں انہیں ایسی شاندار فتح حاصل ہوئی کہ ان کو صرف مملکتِ غزنی پر ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان پر قبضہ حاصل ہوا۔

[2] اتفاقاً اسی نام کی ایک خاتون نے اسی مقام پر انگریز کے خلاف بھی یہ گانا گایا تھا۔ جو ۲۷ جولائی ۱۸۸۰ء کا دن تھا جس میں انگریزی فوج تباہ و برباد ہو چکی تھی اور افغانوں کو فتح نصیب ہوئی تھی

سے مغرب کی طرف کا علاقہ ہندوؤں کی رہائش کے لئے ممنوع قرار دیا اور ان کو دریائے سندھ سے مشرق کی طرف پار جانے کا حکم ہوا۔ علاؤالدین جہان سوز نے غزنی کی فتح کے بعد ایک فخریہ نظم لکھی تھی جس کے بعض اشعار اس طرح ہیں :۔

بہرام شاہ بہ کینۂ من چوں کمان کشید
کندم بہ کینۂ از کمرِ او کمان را
پشتۂ خصم گرچہ ہمہ رائے و رانا بود
کردم بہ گرز خورد سرِ رائے و رانا را

ان اشعار میں رائے اور رانا خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ جس سلطان محمود غزنوی کو آج کل ہندوؤں کا سب سے بڑا دشمن بنایا جاتا ہے اسی محمود غزنوی کی اولاد کے طرف دار بن کر ہندوؤں کے رائے اور رانا غوریوں سے لڑنے کے لئے نہ صرف غزنی بلکہ حدود غور تک پہنچے تھے۔

مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی اپنی تصنیف "آئینۂ حقیقت نما" میں لکھتے ہیں کہ :۔

"سلطان محمود کے زمانے میں ایک ہندو سپہ سالار بجے رائے تھا جو بارگاہ محمودی میں رتبہ عالی رکھتا تھا اور ندیم خاص سمجھا جاتا تھا اور ہندو لشکر کا سپہ سالار سوندی رائے تھا۔ راجہ تلک پسر جے سنگھ سلطان محمود کے دربار میں مترجم کے علاوہ باہر کے پیغامات لاتا اور وزیر اعظم تک پہنچاتا تھا۔ اسی طرح شہزادہ ولیعہد یعنی مسعود بن محمود کا میر منشی بھی ایک ہندو تھا۔ جس کا نام بیر پال تھا۔ سلطان مسعود تخت نشین ہو کر سوندی رائے کے مرنے کے بعد اس کی جگہ ناتھ کو ہندو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا اور جب ناتھ جنگ میں مارا گیا تو اس کی جگہ تلک کو ہندو فوج کا سپہ سالار بنایا گیا۔ سلطان مسعود کو تلک

کی پیش قدمی بہت پسند آئی تو احمد نیالتگین کی سزادہی کے لئے تلک کو سپہ سالار ہند بنا کر بھیجا اور پیغام دیا کہ ہم تم کو تمام سرداروں پر فوقیت و برتری دینا چاہتے ہیں۔ تلک نے ہندوستان آ کر احمد نیالتگین سپہ سالار کو ۴۲۶ھ میں قتل کیا اور سلطان کی خدمت میں واپس پہنچ کر مورد تحسین ہوا۔"

سلطان محمود غزنوی کے خاندان کے زوال کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد یعنی ۵۷۰ھ میں ملتان پھر غوری افغانوں کے قبضہ و حکمرانی میں آیا اور ۱۰۰۳ھ تک وقتاً فوقتاً کئی افغان حکومتیں وہاں پر قائم رہیں۔

غوری خاندان کے مختصر حالات

پہلے محمد سوری حاکمِ غور کا ذکر آ چکا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے اس کے خلاف لشکر کشی کیا تھا اور بالآخر سخت معرکے کے بعد گرفتار و مقتول ہوا تھا۔ اس محمد سوری کا خاندان عرصۂ دراز سے غور کے پہاڑی علاقے میں برسر حکومت چلا آتا تھا۔ اس کا مورثِ اعلیٰ شنسب بن حریق جو علاقہ غور کا رئیس اور نسباً وہ آرمینیہ کے بادشاہ سہاک کی نسل سے اور شامبات کے جلاوطن اسرائیلی خاندان سے تھا۔ شنسب اوائل اسلام میں مسلمان ہوا تھا۔ مؤرخین کی زبانی اس کی اولاد افاغنہ شنسبی کہلائی لیکن وہ عوام میں زیادہ تر خاندان غوری سے مشہور ہے۔ محمد سوری مذکور اسی شنسب بن حریق کی اولاد میں تھا۔ عباسیوں اور علویوں نے مل کر جب بنی امیہ کے خلاف سازشیں اور کوششیں شروع کیں تو علاقہ غور کا یہ خاندان جو اس علاقے میں حکومت و سرداری بھی رکھتا تھا۔ ابومسلم خراسانی کا شریک کار بن گیا۔ خلافت عباسیہ کے قائم ہو جانے پر اس خاندان کی عزت افزائی کی گئی اور اس کو علاقہ غور کی سندِ حکومت، خلیفہ کی طرف سے مل گئی۔

سلطان محمود غزنوی نے ناقابلِ تسخیر پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے محمد سوری کے

بعد اس کے بیٹے ابوعلی کو غور کا حاکم تسلیم کیا۔ غزنی سے تعلقات استوار ہو کر معمول پر آ گئے۔ ابوعلی کے بعد اس کا بھائی شیش غور کا امیر ہوا۔ شیش کے بعد اس کا بیٹا عباس امیرِ غور ہوا۔ عباس کے بعد اس کا بیٹا امیر محمد اور امیر محمد کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین حسن اور اس کے بعد اس کا بیٹا عز الدین حسین غور کا امیر مقرر ہوا۔ یہ سب کے سب اپنے مورثِ اعلیٰ محمد سوری کی تقلید میں رہے مگر سلاطین غزنی کے مطیع رہے ہے۔

ملک عزالدین حسین جس زمانے میں غور کے علاقے پر حکومت کرتا تھا۔ اس زمانے میں غزنی کی سلطنت سلطان ابراہیم غزنوی کی وفات کے بعد بہت کمزور ہو چکی تھی۔ ملک عزالدین حسین نے سلطان سنجر سلجوقی سے مراسم پیدا کر کے سلطنت غزنی کی اطاعت سے عملی طور پر کامل آزادی حاصل کر لی تھی۔ غزنی کے سلطان مسعود بن ابراہیم اور اس کے بیٹے ارسلان نے بھی چشم پوشی اور بے التفاتی سے کام لے کر عزالدین حسین کی آزادی کو تسلیم اور گوارا کر لیا تھا۔

عزالدین حسین جب فوت ہوا تو اس کے سات بیٹے تھے جو سب کے سب جوان اور مردان کار تھے۔ ان کے نام یہ ہیں فخر الدّین مسعود، قطب الدّین محمد، سیف الدّین سوری، بہاؤالدّین سام، علاؤالدّین جہان سوز، شہاب الدّین سوری، شجاع الدین علی، باپ کی وفات کے بعد بالاتفاق سیف الدّین سوری باپ کا جانشین اور غور کی ریاست کا جو عزالدین حسین کے زمانے میں بہت وسیع ہو چکی تھی فرماں روا مقرر ہوا۔ لیکن سیف الدین سوری نے تنہا فرماں روا بن کر باقی بھائیوں کو حکومت و فرماں روائی کے لطف سے محروم رکھنا گوارا نہ کر کے غور ریاست کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے ہر ایک بھائی کو ایک ایک ریاست کا خود مختار فرماں روا بنا دیا۔ اپنے پاس بھی بہ حصہ مساوی ایک چھوٹی سی ریاست رکھی۔ اتفاق کی بات قطب الدین محمد کی باقی بھائیوں سے اَن بن اور ناچاقی ہو گئی۔ اور اس آپس کی مخالفت نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ قطب الدّین محمد خفا ہو کر اپنی ریاست

چھوڑ کر غزنی چلا آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ غزنی میں بہرام شاہ فرماں روا تھا۔ بہرام شاہ قطب الدین کے ساتھ بہت خاطر اور عزت سے پیش آیا۔ چند روز کے بعد حاسدوں اور فتنہ پسند ہندوؤں نے بہرام شاہ سے قطب الدین کی شکایت کی کہ وہ آپ کو قتل اور غزنی کے تخت پر قبضہ کرنے کی سازش اور کوشش کر رہا ہے۔ بہرام شاہ نے قطب الدین کو قتل کرا دیا اور وہ غزنی میں مدفون ہوا۔ قطب الدین کے حادثہ کا سن کر سیف الدین محمد سوری نے فوج لے کر اور اپنی ریاست اپنے بھائی بہاؤالدین سام کی نگرانی میں چھوڑ کر غزنی پر انتقاماً چڑھائی کی۔ بہرام شاہ غزنوی نے مقابلہ کر کے شکست کھائی اور ہند کی طرف چلا آیا۔ سیف الدین محمد سوری نے غزنی پر قبضہ کر کے تخت سلطنت پر جلوس اور اپنے نام کے ساتھ سلطان کے لقب کا اضافہ کیا۔ خاندان غوری میں سیف الدین سب سے پہلے سلطان ہوا۔ سیف الدین نے غزنی میں نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ جب موسم سرما آیا اور برف باری سے غور اور غزنی کے درمیان آمد و رفت کا راستہ بند ہو گیا تو بہرام شاہ نے ہندوؤں کی فوج اور ہندو ماتحت راجاؤں اور ٹھاکروں کو ہمراہ لے کر غزنی پر حملہ کیا۔ سیف الدین مقابلہ کے لئے غزنی سے باہر نکلا۔ اہل غزنی جو سیف الدین کی فوج میں شامل تھے۔ میدان جنگ میں پہنچتے ہی بہرام شاہ سے جا ملے اور سیف الدین بہ آسانی گرفتار کر لیا گیا۔ بہرام شاہ نے سیف الدین سوری کو نہایت ذلت کے ساتھ ایک مریل بیل کے اوپر سوار کرا کے شہر میں تشہیر کرایا اور پھر قتل کرا دیا۔

سیف الدین سوری کے وزیر مجد الدین موسوی کو بھی اسی ذلت کے ساتھ قتل کیا گیا۔ یہ حال سن کر بہاؤالدین سام نے غور کی ریاست اور تمام علاقہ اپنے چھوٹے بھائی علاؤ الدین حسین کے سپرد کیا اور خود فوج لے کر اپنے دونوں مقتول بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لئے غزنی کی جانب روانہ ہوا لیکن ابھی راستے ہی میں تھا کہ فوت ہوا۔

علاؤالدین نے یہ خبر سن کر ایک زبردست لشکر فراہم کیا اور علاقہ غور کے تمام جنگجو

افغانوں کو اپنے مقتول بھائیوں کی مظلومی کے حالات سنا سنا کر انتقام پر مستعد اور بے حد پُر جوش بنا دیا۔ علاؤالدین کی فراہمی لشکر اور غزنی پر فوج کشی کے ارادے کا حال سن کر بہرام شاہ نے اپنی ہندو فوج اور رایوں و راناؤں کو ہمراہ لے کر غور کی طرف پیش قدمی کی۔ مقام زمینداور کے قریب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل خیمہ زن ہوئے، آخر لڑائی ہوئی چنانچہ سخت جنگ اور تباہی کے بعد غوری لشکر نے غزنی فوج کو بھگا دیا۔ تگین آباد میں آکر بہرام شاہ نے اپنی فوج اور مفرور ہندو سرداروں کو سمیٹ کر پھر ایک مقابلہ کیا مگر اس مرتبہ بھی شکست کھائی۔ یہاں سے فرار ہو کر خاص شہر غزنی کی دیواروں کے نیچے ایک سخت مقابلہ کیا لیکن اس مرتبہ پھر شکست کھائی اور ہند کی طرف بھاگ آیا۔ علاؤالدین حسین سوری نے غزنی میں داخل ہو کر سات شبانہ روز قتل عام کرایا اور شہر میں آگ لگا کر ایک ایک عمارت کو جلایا۔ غزنی کا کوئی گھر اور کوئی خاندان جلنے اور قتل ہونے سے نہیں بچا۔ اسی لئے علاؤالدین کو جہاں سوز کا خطاب ملا۔ علاؤالدین جہاں سوز غزنی کو برباد کر کے اپنے بھائیوں کے تابوت لے کر غور کی جانب چلا گیا اور اس کی ہیبت و شوکت کا دور دور تک سکہ بیٹھ گیا۔ شہر فیروزہ کوہ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور اپنے آپ کو سلطان کے لقب سے ملقب کیا۔

بقایا تفصیل صفحہ ۴۴۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔



پایۂ تخت دہلی (ہندوستان) پر افغانوں کی حکومت

افغانوں نے تقریباً چار صدیوں تک ہندوستان پر مسلسل حکومت کی، جن کے اسمائے گرامی کا ذکر بالترتیب یوں ہے :-

شہاب الدین محمد غوری نے پشاور اور اس کے ملحقہ علاقہ پر ۵۷۵ھ میں قبضہ کیا۔ اور ۵۸۲ھ میں حسین خرمیل افغان کو سیالکوٹ کا حاکم اعلیٰ مقرر کر کے ۵۸۸ھ میں دہلی پر قابض ہوا۔ اس وقت سیالکوٹ کو پنجاب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد شہاب الدین محمد غوری نے اپنے سپہ سالار قطب الدین ایبک کے ذریعہ وہاں پر سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی۔ جہاں پر رائے پتورا کا بت خانہ تھا۔ اور ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت قائم کی۔ ۳۲ سال چند ماہ حکومت کرنے کے بعد ۲ شعبان ۶۰۲ھ کو وفات پائی۔ اس کی وفات پر اس کا بھتیجا محمود بن غیاث الدین غور کا بادشاہ ہوا اور اس نے قطب الدین کو تاج و تخت کے فرمان اور دیگر چیزیں ارسال کر کے خطاب شاہی عطا فرمایا چنانچہ قطب الدین ایبک لاہور میں تخت شاہی پر بیٹھ کر ہندوستان کا بادشاہ ہوا اور اس طرح بجائے سیالکوٹ کے لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور اسکی رونق میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ شاہی قلعہ لاہور اور جامع مسجد کی بنیاد اسی نے رکھی تھی جس میں بعد میں مغل حکومت نے از سر نو اضافہ کیا۔ وہ نہایت کامیاب حکومت کرنے کے بعد ۶۰۷ھ میں گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہوا اور ایبک روڈ انار کلی پر دفن کیا گیا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا آرام شاہ ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ اس کے بعد شمس الدین التمش جو قطب الدین کا داماد تھا سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا رکن الدین فیروز شاہ بادشاہ بنا۔ اس کے بعد التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ تخت

پر رونق افروز ہوئی۔ اس کی قبر شاہ جہان آباد میں ہے۔ اس کے عہد میں ملک ایاز پنجاب کا گورنر تھا جس کی قبر اس وقت رنگ محل لاہور میں موجود ہے۔ اس کے بعد معزالدین بہرام شاہ بن سلطان رکن الدین فیروز شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد علاؤالدین پسر سلطان شمس الدین تخت نشین ہوا اور اس کے بعد اس کا بھائی ناصرالدین محمود بادشاہ ہوا اور اس کا وزیر غیاث الدین بلبن مقرر ہوا اور سلطان ناصرالدین محمود کے بعد یہی وزیر غیاث الدین بلبن بادشاہِ ہندوستان ہوا۔ پھر اس کا پوتا سلطان معزالدین کیقباد تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی (غلزئی) بادشاہ ہوا۔ پھر اس کا بھتیجا و داماد سلطان علاؤالدین خلجی سکندر ثانی بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ بادشاہ ہوا۔ اگرچہ لائق بادشاہی نہ تھا۔ قطب الدین مبارک شاہ کے وقت میں اور پھر اس کے بعد حالات کافی خراب ہو گئے۔ کافور اور خسرو شاہ نے فضا مکدر کر دی لیکن اراکین جرگہ نے ملک غیاث الدین خان کو تخت پر بٹھایا۔ اس کا نام ملک غازی الدین تھا اور قبیلہ تغلق بن کاکڑ بن غرغشت سے تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا محمد تغلق تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد اس کا برادر زادہ سلطان فیروز باربک تخت نشین ہوا اور تقریباً ۳۹ سال حکومت کر کے فوت ہوا۔ اس کے بعد غیاث الدین بن فتح خان بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد امرائے دربار نے ابوبکر بن ظفر خان بن فیروز شاہ کو تخت پر بٹھایا مگر جلد ہی محمد شاہ بن فیروز شاہ نے تخت پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ بنا۔ اس کے بعد سلطان محمد شاہ کا بیٹا سلطان ہمایون بادشاہ ہوا پھر اس کا بھائی سلطان ناصرالدین محمود شاہ بن محمد شاہ تخت پر بیٹھا مگر اس کی حکومت کے دوران تیمور بادشاہ نے دہلی پر قبضہ کیا۔ اور محمد شاہ شکست کھا کر گجرات چلا گیا۔ تیمور پندرہ دن کے بعد دہلی سے واپس ہوا۔ سلطنت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ نصرت شاہ بن فتح خان بن فیروز شاہ نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور جونپور میں ابراہیم بادشاہ ہوا۔

چنانچہ کئی سال تک لڑائی ہوتی رہی آخر میں نصرت شاہ سے اقبال خان لودی نے دہلی

حاصل کر کے چند سال بادشاہی کی لیکن ہندوستان میں خلفشار قائم تھا جس کے سبب باہر کے غیر افغان جو تیمور کے ساتھی تھے اور اپنے آپ کو سید کہتے تھے، دہلی پر قابض ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد سلطان بہلول لودی نے افغانوں کو متحد کر کے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ بنا۔ اور ہندوستان میں سابقہ امن بحال کیا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا سکندر بادشاہ بنا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا ابراہیم لودی بادشاہ بنا۔ جس کے دورِ حکومت میں بدقسمتی سے افغانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ وہ سازشوں کا شکار ہو گئے اور باہمی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پانی پت کے مقام پر مقابلہ ہوا اور ابراہیم لودی ۷ رجب ۹۳۲ ہجری بروز جمعہ صبح کے وقت شہید ہوا۔ اور یوں ہندوستان پر افغانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ جو تین سو پچاس سال تک قائم رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد افغانوں کو ہوش آیا اور متحد و متفق ہو کر شیر شاہ کو بادشاہ بنایا جس نے ہمایون سے حکومت چھین لی اور افغانوں کی بادشاہت دوبارہ قائم کی۔ اس نے ایک مثالی حکومت کی لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا تو اس کی وفات پر اس کے لڑکے سلیم شاہ نے حکومت سنبھالی۔ جس نے کامیاب حکومت کی لیکن اس کی وفات پر جب اس کے لڑکے نے حکومت سنبھالی تو اختلاف کے سبب اس کی حکومت کامیاب نہ ہوئی اور افغانوں میں پھر پھوٹ پڑ گئی۔ وہ متحد نہ رہ سکے اور مغل حکمران ہمایون کو ۱۵ سال بعد دوبارہ حکومت سنبھالنے کا موقع ملا اور یوں افغان حکومت کا ایک بار پھر خاتمہ ہوا۔

جلد ۵ اقبال نامہ اکبری میں صفحہ ۱۰۰۵ پر درج ہے "بابر کے عہد سے ہندوستان کے انتظام بندوبست نے ایک نئی صورت پیدا کی لیکن شیر شاہ نے سلطنت کے بالکل صحیح اصول قائم کئے اس نے ساری قوموں اور فرقوں کو انتظام سلطنت میں شریک کر لیا۔ یہ بیج جو اس نے بویا تھا وہ اکبر کی آبیاری سے بڑا بار آور درخت ہوا۔ اکبر نے اپنی ابتدائے سلطنت میں شیر شاہ کے تمام ضوابط و سرشتے و مبیغے بدستور قائم رکھے۔ شیر شاہ و سلیم شاہ کی قابلیتوں اور لیاقتوں کا

شہنشاہ اکبر ایسا قائل تھا کہ ان کو ملائک السلاطین کہتا تھا گو کہ شیر شاہ نے اس کے باپ ہمایوں کو شکستیں دیکر ہندوستان سے نکالا تھا۔“

افغان اولیاء

افغانوں کی ہندوستان پر حکومت کے دوران وقتاً فوقتاً کئی علماء مشائخ اور اولیاء کرام ہندوستان میں وارد ہوتے رہے اور اشاعت و تبلیغ کے لئے انہوں نے نمایاں کام کیا۔ جس طرح ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں دہلی کے مقام پر سب سے اولین مسجد کی بنیاد شہاب الدین محمد غوری نے رکھی تھی۔ اسی طرح دین اسلام کی اشاعت کا کام بھی اسی افغانی دور میں ہوا اور دین اسلام ان اولیاء کرام کی تبلیغ و اشاعت کی وجہ سے پنجاب، ہندوستان اور بنگال میں پھیلتا چلا گیا۔ یہ حضرات تقریباً سبھی افغان تھے۔ ادارہ اخبار وطن لاہور نے اس دور کے تمام علماء مشائخ اور اولیاء کرام کے ان کارناموں کو کتابی شکل میں افغان اولیاء کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ ان کی زیادہ تر زیارتیں لاہور ملتان اور دہلی میں اور باقی ہندوستان کے کونہ کونہ نیز بنگال میں کوئی جگہ ان سے خالی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دو ایک کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شیخ فریدالدین گنج شکر کا جد اعلیٰ فرخ شاہ غوری کابل کے حاکم تھے۔ اس کے پوتے شیخ کمال الدین بن سلیمان سلطان شہاب الدین محمد غوری کے عہدِ سلطنت میں کابل سے ملتان آئے اور بادشاہ نے قصبہ کھوتوال جو ملتان کے قریب ہے عنایت کیا اور کمال الدین بن سلیمان نے وہاں سکونت اختیار کی اور فریدالدین یہیں پیدا ہوئے۔ جن کا شجرۂ نسب یوں ہے ”فریدالدین بن کمال الدین بن سلیمان بن فرخ شاہ غوری“۔ پاک پٹن پنجاب میں زیارت ہے وہ ان کی عقیدت کی وجہ سے پاک پٹن شریف مشہور ہوا۔

مجدّد الف ثانی: شیخ سرہندی کابلی الاصل تھے جن کا اصلی نام شیخ احمد تھا۔ کابل میں پیدا

ہوئے۔ دینی تعلیم انتہائی درجے تک حاصل کی تو ہندوستان آکر سرہند میں سکونت پذیر ہوئے۔ مریدوں کا جمگھٹا رہتا تھا اور تعلیم و تدریس کے علاوہ دین اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں ہمہ تن مصروف رہے یہیں وفات پائی اور دفن ہوئے۔ ان دو حضرات کی زیارتوں پر زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے اور اظہر من الشمس، مزید کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔"

(بحوالہ زبدۃ الاخبار صفحہ ۱۴۰ و ۱۷۳، مؤلفہ مولوی احمد حسن شوری)۔

بختیار کاکیؒ

بختیار کاکی کا نام قطب الدین، سیّد بنی افغان، بن احمد بن موسیٰ ساکن اوش علاقہ خراسان پیدائش ۵۸۲ھ وفات ۶۳۴ھ

جو مذکورہ بالا شیخ فریدالدین کے پیر و مرشد تھے۔ وہ بادشاہ التمش کے عہد میں دہلی میں مقیم رہے تمام عمر دین اسلام کی تبلیغ کے لئے وقف کر دی تھی اور دہلی میں ہی وفات پا کر وہیں مدفون ہوئے۔

ان کے نماز جنازہ کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے انہوں نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازے کی نماز وہ پڑھائے جو حرام سے ہمیشہ بچا رہا ہو۔ جس نے فرض نماز برابر جماعت کے ساتھ پڑھی ہو اور اس سے پہلی تکبیر کبھی نہ چھوٹی ہو اور جو بھی ہر قسم کے بُرے اعمال و بد فعلی سے پاک ہو چنانچہ سلطان التمش ان شرائط پر پورے اترے اور انہوں نماز جنازہ پڑھائی۔ (بحوالہ تاریخ ابراہیم بٹنی) اس سے افغان سلاطین دہلی کے اعمال اور دین داری کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اب افغانوں کی قائم مقام مغلیہ سلطنت اور ان کے کردار ملاحظہ فرمائیں۔

مغل:۔ بابر لکھتا ہے، ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کی ابتداء اس سے ہوئی جس وقت بابر نے لودھی کے افغانی خاندان کو شکست دے کر آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ بابر آگرہ ہی میں ہندوستان اور کابل کا بادشاہ مرا۔ اس کے بیٹے ہمایوں کو حکومت قائم کرنے کے لئے بہت سی تکالیف

کا سامنا کرنا پڑا اور مغلوں کی حکومت اس وقت قائم ہوئی۔ جب کہ اس خاندان کا تیسرا بادشاہ اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت پر بیٹھا اور پچاس سال تک حکومت کرتا رہا۔ اس بادشاہ نے جو تاریخ عالم کے بادشاہوں میں ایک بہت بڑا فرمانروا گزرا ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھا۔ اس نے فاتح و مفتوح میں شادی بیاہ کو مروج کیا اور خود راجپوت راجاؤں کی لڑکیوں سے شادی کی۔ اسلام اور براہمنی مذہب کو ملا دینے کی جو کوشش اس نے کی، اس میں تو وہ کامیاب نہ ہوا۔ لیکن ان دونوں اقوام کی طرز تعمیر کو ترکیب دینے میں اسے پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ مغلوں کی اصلی حکومت تمام ملک پر دو سو سال تک رہی اور اس زمانہ میں بھی دکن میں کئی اسلامی حکومتیں علیحدہ قائم رہیں۔۔

"مغلیہ حرم" سلاطین مغلیہ کے دربار میں عورتوں کا بہت بڑا درجہ تھا۔ ان بادشاہوں نے راجپوت شہزادیوں کے ساتھ شادیاں کر کے اس امر کی کوشش کی کہ دونوں اقوام آپس میں گھل مل جائیں اور انہوں نے نہ خود یہ طریقہ اختیار کیا بلکہ اپنے ارکان دولت کو بھی اس کی ترغیب دی۔ بادشاہی محل سراؤں میں عورتوں کی تعداد غیر محدود تھی کیونکہ یہ سلاطین اس خاص مسئلہ میں نیز بہت سے اور مسائل میں بھی شرع محمدی کے پابند نہ تھے۔ مثال کے طور پر شاہ جہان کے حرم میں دو ہزار بیبیاں تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تعداد کو وہ کافی نہیں سمجھتے تھے اور ہمیشہ اپنے امراء کی بیبیوں میں خوبصورت عورتوں کے جویا (متلاشی) رہتے تھے۔" (تاریخ تمدن ہند مصنف فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤلی بان، حصہ چہارم باب پنجم فصل دوم اردو مترجم سید علی بلگرامی مطبوعہ حیدرآباد دکن۔)

واضح ہو کہ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ خاندان کے زوال کے وقت جب احمد شاہ ابدالی افغانستان میں برسر اقتدار ہوا تو وہ آکر ان کو مرہٹوں کے جبر و ستم سے خلاصی دے کر پھر ان کو دوبارہ تخت دلی پر بٹھائے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

احمد شاہ ابدالی

احمد خان جو بعد میں احمد شاہ ابدالی سے مشہور ہوا، وہ زمان خان بن دولت خان صدوزئی، ابدالی، ترین، سڑابنی حاکم ہرات کا بیٹا تھا۔ زمان خان کی وفات پر اس کی چھوٹی بیوی جو حاملہ تھی، اپنے بھائی جلال خان کے پاس ملتان آگئی۔ یہاں اس کی بطن سے ۱۷۲۲ء میں احمد شاہ ابدالی پیدا ہوا جو سات سال تک ملتان میں رہا اور بمقام قندھار ۱۷۴۷ء میں بادشاہ منتخب ہوا اور ۱۷۷۳ء میں بقضائے الٰہی بمقام قندھار وفات پاکر وہیں دفن ہوا۔ غفر اللہ لہٗ احمد شاہ ابدالی ایک بڑا عالم، فاضل، ادیب اور اچھا شاعر بھی تھا۔ ان کا یہ شعر جو پشتو زبان میں ہے۔ اس کے دیوان سے یہاں درج کرتا ہوں۔

دَ حمیداو دَفرید دَوَر بہ بیاشی   پښتانہ کہ کړی دَتورو ګزار ونہ

(حمید اور فرید کا دور پھر ہوگا اگر افغان بہادری کے جوہر دکھائیں)

حمید سے مراد حمید لودی ہے جو ۳۷۰ھ میں ملتان کا حکمران ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نصر اور پھر اس کا بیٹا ابوالفتح داؤد بادشاہ بنا۔ فرید سے مراد شیر شاہ سوری ہے جس نے مغل حکمران ہمایوں کو شکست دی تھی اور اس کے بعد اس کا بیٹا اسلام شاہ بادشاہ بنا۔ حمید نسلاً لودی افغان تھا اور فرید سوری افغان، اور دونوں نے سرزمین ہندوستان پر اپنی بہادری اور جرأت سے حکمرانی کی تھی۔ احمد شاہ کا کہنا ہے کہ اگر آج بھی افغان حمید اور فرید کی طرح بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کریں تو وہ گزشتہ دور پھر آسکتا ہے۔

حمید اور فرید کی حکمرانی نے بلاشبہ افغانوں کی تاریخ کا ایک زرین باب ہے اور احمد شاہ ابدالی نے ان افغان مشاہیر کے زرین دور کو یاد کرتے ہوئے خود ہی آگے بڑھ کر تلوار کے جوہر دکھائے تھے۔



عہدِ اکبری پر ایک نظر

مغل فرمانروا شہنشاہ اکبر کی افغانوں کے ساتھ لڑائیاں

مغل درباری مورخین کی زبانی (از مولوی ذکاء اللہ دہلوی مصنف تاریخ ہندوستان جلد پنجم اقبال نامہ اکبری کی تمہید (صفحہ ۲۷۰) کا خلاصہ پیش خدمت ہے :-

شہنشاہ اکبر نے توران کے باب میں جو پالیسی اختیار کی تھی اس نے افغانوں کے ساتھ لڑنے کا وقت مقرر کر دیا۔ گو وہ ابتدائی سبب اس لڑائی کا نہ ہوا۔ عبداللہ خاں والیٔ توران کی قوت روز افزوں کے سبب سے تاخیر ہوئی۔ جب اکبر کی توجہ شمال مغرب کی طرف ہوئی تو افغانستان میں ایک مذہبی طوفان اٹھ رہا تھا اور (افغان) قومی تحریک ہو رہی تھی اور وہ ایسی قوی تھی کہ اکبر کو اس کا روکنا ناگزیر اس لئے تھا کہ توران کوئی خوفناک حملہ نہ کر دے۔ پچیس برس پہلے سے افغانستان میں ایک نیا مذہب روشنائی پھیل رہا تھا۔ اس فرقہ کا بانی بایزید انصاری تھا۔ وہ افغانستان میں نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ پنجاب کے جالندھر میں۔ جب بابر نے افغانستان کی سلطنت لی اس سے ایک سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ بایزید*

---

* چونکہ تحریک روشنائی پر مفصل و مدلل بحث " تواریخ حافظ رحمت خانی " اشاعت سوم (اردو) ۱۹۷۷ع میں کی جا چکی ہے اس لئے طوالت کی خاطر میں نے اس پر مزید کچھ لکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

واضح رہے کہ بعض مؤرخین بایزید انصاری اور اس کے مخالفین اخون درویزہ اور پیر بابا کے اختلافات کو سیاسی سمجھتے ہیں نہ کہ مذہبی۔ مثال کے طور پر چند ایک کے خیالات اس بارے میں پیش کئے جاتے ہیں۔

ابراهیم عطائی مصنف " دِ پختونستان مسئلہ " مطبوعہ کابل ۱۳۴۸ھ ص ۷۱ پر لکھتا ہے :-

کا خیال تھا کہ افغانوں کی سلطنت پھر بحال ہو اور افغانستان میں مغلوں کی حکومت پائمال

”سید علی (پیر بابا) اور اخون درویزہ اور کچھ مزید با رسوخ روحانی لوگ یہاں موجود تھے۔ جن کے پاس اپنی انفرادی قوت کے علاوہ مغلیہ دربار کی طاقت اور امداد بھی موجود تھی۔ حالات ایسے تھے کہ پیر روخان (پیر روشن) مغلوں کے ساتھ بر سر پیکار رہا اور چاہتا تھا۔ کہ اُن کا اقتدار افغانوں کے سروں سے ختم کر دے۔ لہذا پیر روخان مجبور تھا کہ افغانوں کو روحانی طاقت سے جمع کر کے اپنے سیاسی مسئلہ کو مذہبی رنگ دے تا کہ وہ اسے جلدی اور با آسانی قبول کر سکیں۔“

یہی مصنف آگے چل کر صفحہ ۹۷ پر یوں لکھتا ہے:۔

”مغلوں کی طرف سے سید علی ترمذی (پیر بابا) اور اخون درویزہ افغانوں کے درمیان ایسے لوگ تھے جن کی مغلوں کے ساتھ قدیمی دوستی اور نسلی تعلق بھی رہا تھا۔ اور وہ ان کی حکومت کے طرفدار بھی تھے۔ چنانچہ طبعی طور پر ان کو پیر روخان (پیر روشن) کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا گیا نتیجہ کے طور پر کچھ افغان پیر روخان کی طرف اور کچھ اخون درویزہ کے طرف ہو گئے اور داخلی جنگ شروع کی۔ ان جنگوں میں ہزاروں افغان آپس میں مارے گئے اور مغلیہ حکمرانوں کا جو مقصد تھا وہ انہیں بخوبی حاصل ہو گیا۔“

پروفیسر ش ضحیٰ۔ ایم۔ اے اسسٹنٹ ڈائرکٹر شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ یونیورسٹی آف کراچی لکھتے ہیں کہ:۔

”پٹھانوں میں پیر روشن یا پیر تاریک کا نام بہت مشہور ہے لیکن اس کے حالات سے واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ تحریک با یزید انصاری نے اس وقت شروع کی تھی کہ جس وقت ہندوستان میں مغل حکومت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ قطع نظر با یزید کے مذہبی عقائد کے اس نے پٹھانوں کے مختلف

قبائل کو بڑی حد تک ایک منظم قوم کی شکل دینے کی کوشش کی تھی ۔ اور اس میں اسے بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ۔ وہ عوام میں پیر روشن پکارا گیا اور اس کی تحریک نے تاریخ کے اوراق پر تحریک روشنائی کے نام سے جگہ حاصل کی ۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو شاید ہندوستان میں مغل اقتدار قائم نہ ہو سکتا ۔ مذہب کے نام سے جو تحریک شروع ہوئی تھی مذہب کے نام سے ہی اس کی مخالفت ہوئی اور اس شدت سے ہوئی کہ تحریک کو علاقہ یوسفزئی میں کلیتاً دفن کر دیا گیا ۔ اس تحریک کا کوئی حسن بیان کرنے کو نہ رہا اور مخالفین نے عیوب کا وہ انبار لگا دیا کہ پیر روشن پیر تاریک پکارا جانے لگا ۔ یک طرفہ ڈگری دے دی گئی کہ بایزید ملحد اور کیا کچھ نہ تھا ۔ آج اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تحریک روشنائی اور مخالفت روشنائی دونوں سیاسی تحریکیں تھیں دونوں کو مذہبی رنگ دیا گیا اور ایسا رنگ دئیے بغیر کوئی تحریک اس علاقہ میں نہ کامیاب ہو سکتی تھی اور نہ ہو سکتی ہے ۔ روشنائیوں کا مقصد اپنی آزادی قائم رکھنا تھا لیکن مرزا حکیم (شاہ کابل) اور اکبر اعظم کی تگ و دو اپنی سلطنت کو وسعت دینا تھی اور اس آزاد قوم کے گلے میں اپنا طوق غلامی ڈالنا تھا اور اسی زنجیر غلامی کی کڑیوں کو مضبوط کرنے کے لئیے اخون درویزہ اور اس کے رفقاء سرگرم عمل تھے ۔"

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ :-

" اخون درویزہؒ کے بیان کو بہت ہی احتیاط سے پرکھنا چاہئیے کیونکہ وہ بایزید کی تعلیمات کا عقیدتاً مخالف تھا ۔"



دریاؤں گومل اور کورم کے درمیان ہے یہ دونوں دریائے سندھ میں ملتے ہیں۔

بایزید کے خیالات کی بلند پروازی کے سبب مہمند کے سردار سلطان احمد نے اس کا خیر مقدم کیا۔ یہاں افغانوں میں اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے مذہب کا وعظ سنایا اور ان کو مرید کیا مگر جب اس پر عرصہ گزرا تو تاجیک کے سنّی ملّا (اخون درویزہ) نے اس کا ناک میں دم کیا۔ (کابل) دریا کے داہنے کنارے جنوب مشرق میں غوریہ خیل اقوام رہتی تھیں اور دریا کے بائیں کنارے اشنغر میں محمدزئی رہتے تھے۔ بایزید کو بڑی کامیابی ہوئی اور یہ لوگ اس کے پکے چیلے ہو گئے۔ وہ خود اور اس کا بیٹا کلید پر (کلہ ڈھیر) میں عمرزئیوں کے درمیان مقیم ہوئے۔ یہ ایک خیل اشنغری ہے گو تاجیک ملّا نے اس سے نفرت کی مگر افغانوں نے اس سے رغبت کی غرض اب وہ دونوں دین و دنیا کا رہنما بن گیا۔ مذہبی و ملکی معاملات کا پیر و مرشد ہو گیا۔ اب پیر جی کو بھی الہام ہونے لگا۔

مریدوں نے اس کو پیر روشن کہا۔ وہ قرآن کے اسرار بیان کرنے لگا۔ اس نے ایک کتاب خیرالبیان تصنیف کی۔ جس میں اپنے مذہب کے سب مسائل قرآن و حدیث کے موافق بیان کئے گئے مگر ان کو اہل سنت بالکل قرآن و حدیث کے مخالف جانتے ہیں اور ان کو زندقہ اور الحاد کہتے ہیں۔ نمازیں قبلہ کی جانب اڑا کر دل کو کعبہ بنایا۔ وضو کو سلام کیا۔ رمضان کے روزوں کو مقرر کیا کہ فصل بہار کے شروع میں دس روزے رکھ لیا کریں۔ اس نے یہ کہا جو آدمی اپنے تئیں اور خدا کو نہیں پہچانتا وہ آدمی نہیں ہے۔ اگر وہ موذی ہے تو گرگ۔ شیر۔ افعی۔ اژدہا سمجھنے چاہیے۔ حدیث قتل الموذی قبل الایذا پر عمل کرنا چاہیے۔ اس لئے حکم دیدیا کہ جو اس کے سخت دشمن ہیں ان کو درندوں کی طرح مارنا چاہیئے۔ اس نے بے ایمان کے مال لوٹنے اور غارت کرنے کی اجازت دی۔ بے ایمانوں میں مخالف مسلمان اور ہندو دونوں شریک تھے۔ وہ ترکی سنّیوں کا بہ نسبت ہندوؤں کے

لے اخون درویزہ اور ان کے ساتھیوں۔

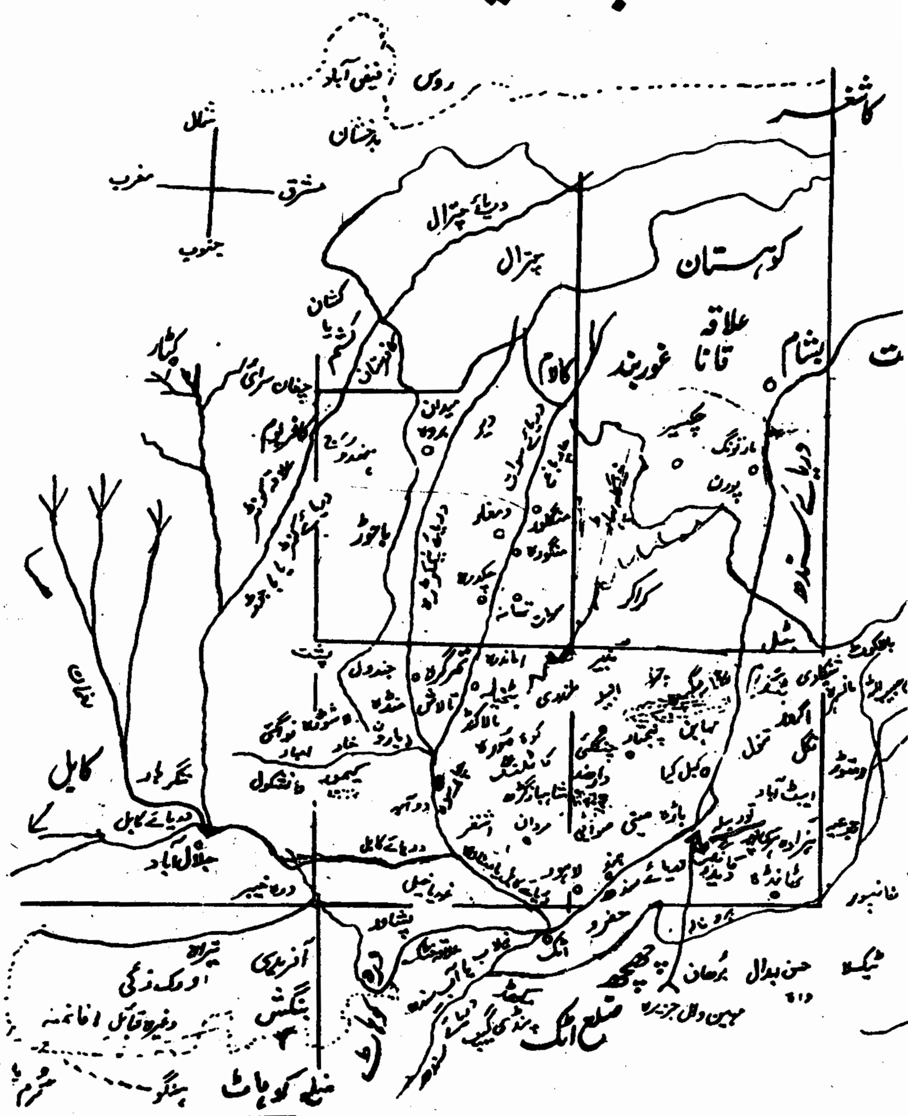
زیادہ دشمن تھے اور کہتا بے ایمان اپنے تئیں نہیں جانتے اور اپنی بقا کو نہیں جانتے اس لئے وہ مُردہ ہیں اور مُردوں کے مال کے زندہ وارث ہوتے ہیں۔ اس نے گداگری کو خلافِ شرع و حرام بتایا۔ اس فقیری کے حرام کرنے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مریدوں کا ایک گروہ بنائے کہ وہ لٹیر اپن کیا کریں۔ اس نے اور اس کے بیٹوں نے ایک بیت المال بنایا جس میں مالِ غنیمت کا خمس داخل ہوتا تھا۔ بایزید اس حال میں کہ ایک غار میں وہ بیٹھتا تھا اور سر پر باپ کی تلوار کھچی ہوئی تھی۔ پختون خیل کا ہادی بن گیا اور اس وحشیانہ طرز میں اس نے مذہب کا بیج ڈال کر اپنی نشو و نما کرلی۔ اس نے بار بار کہا کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ جو لوگ خدا کو نہیں جانتے ان کو قتل کر دوں۔ اس نے چھوٹے چھوٹے حملے کلیدار (کلہ ڈھیر) اشنغر سے کئے۔ جس کے سبب سے کابل کے فرمانروا مرزا محمد حکیم کی توجہ اس کے حال پر ہوئی اور نُنہار کے سُبنوں[1] کے کان کھڑے ہوئے۔ نُنہار (نُنیر) اشنغر کے شمال میں دریائے سندھ سے ملی ہوئی ایک مرتفع زمین ہے اور اس میں یوسف زئی رہتے ہیں۔ یہاں کے عالموں نے یوسف زئی کے بہت سے آدمیوں کو روشنائی مذہب کے اختیار کرنے سے روکا اگرچہ یوسف زئی بایزید کے اوّل اوّل بڑے طرفدار ہوئے مگر اس کے مرنے کے بعد وہ اکثر اس کے سخت دشمن ہو گئے۔

کابل کی حکومت کے حکم سے محمد زئی کے ملک (اشنغر) میں محسن خان غازی آیا اور بایزید کو پکڑ کرلے گیا۔ وہاں علماء سے اس کا مباحثہ کرایا۔ اس نے یہاں یہ فطرت کی اور بیان کیا کہ میں نے کوئی بدعت کی بات مذہب میں نہیں پیدا کی۔ تمام فرائض صوم و صلوٰۃ حج و زکوٰۃ کا پابند ہوں۔ بغرض اپنی فصاحت بیانی اور طاقت لسانی سے اپنے تئیں بالکل ہر الزام سے بری کیا جس سے حکومت کو کوئی خوف اس کی جانب سے نہ رہا۔ اب اس نے اپنے کاموں کے لئے ایک تماشگاہ دشوار گزار کوہستان تیراہ میں کھولی۔ غوریہ خیل جو میدان میں روشنائی مذہب

---

[1] سید علی (پیر بابا) اور اخوند درویزہ وغیرہ

علاقہ پشاور یا گندھارا



یہ نقشہ پیمانے کے مطابق نہیں۔ صرف مقامات کی نشاندہی اور سمتوں کا اشارہ مقصود ہے۔

رکھتے تھے وہ تیراہ کے قریب تھے تیراہ میں بنگش افغان بستے تھے جو روشنائی مذہب میں سخت متعصب تھے۔ اس بلند کوہستانی وادی میں بہ نسبت اشتغر کے بایزید کے لئے زیادہ عافیت تھی۔ یہاں آکر وہ اہل سنت اور مغلوں کی سلطنت کا دشمن ہو گیا۔ اس نے کوہستانی آزاد افغان قوموں کو اپنے مسائل سمجھا کر جہاد پر افروختہ کیا اور چغتائیوں کے ظلم سے افغانوں کو ڈرایا اور ان کو ہندوستان اور اس کے بادشاہ کے مال و دولت کا لالچ دلایا۔ اس نے پہلے ہی سے ہندوستان کے اضلاع اپنے مریدوں کو تقسیم کر دیئے اور جہاد کے لئے ہر طرح سے تیاری کی۔ سواروں کی زبردست سپاہ جمع کرنے کے لئے گھوڑوں کو طلب کیا اور ان کے مالکوں سے وعدہ کیا کہ ہندوستان کی دولت سے دو چند قیمت ان کو دی جائے گی۔ اس نے سب مریدوں سے بے ریا اطاعت چاہی اور مکار پر لعنت کی۔

بایزید بہت سی سپاہ لئے شمال کی طرف ننگرہار کے میدان میں نیچے اترا۔ وہ پہاڑوں میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ محسن خان (مغل افسر) اس کے پیچھے تورراغہ کے قریب آ گیا۔ پیر بایزید نے حتی الوسع اپنے مریدوں کو سمجھایا کہ دشمن کے سامنے کھڑے رہیں۔ مرید اس کے کہنے کے مطابق میدان جنگ میں جم گئے مگر جب خنجر مصری کی شپاشپ ان کے اوپر ہونے لگی اور مغلوں کے سواروں کی ٹاپوں تلے آنے لگے تیز پائی سے وہ بالکل پراگندہ اور پریشان ہو گئے۔ بایزید خود گرتا پڑتا بھاگ کر اشتغر آیا اور تیز پائی سے اس سفر کی تکان سے بخار کا اور اضافہ ہوا اور اس نے زندگی کو پورا کیا اور اشتغر میں دفن ہوا مگر بایزید کے مرنے سے روشنائی مذہب کی روشنی بالکل بجھی نہیں۔ وہ شاہ جہان کے زمانہ تک کچھ نہ کچھ اپنی چمک دکھاتی رہی۔ بایزید کے بیٹوں نے باپ کے مذہب کو اور پھیلایا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے عمر نے تلوار کو ہاتھ میں لیا اور اپنے مریدوں کو یوں مخاطب ہوا کہ :۔

تمہارا پیر مرا نہیں ہے بلکہ وہ اپنی جگہ اپنے بیٹے شیخ عمر کو دے گیا ہے اور اس کو اور اپنے مریدوں کو دنیا کی سلطنت عطا کر گیا ہے۔ شیخ عمر نے نہایت محنت و مشقت سے افغانوں

میں از سر نو جوش پیدا کیا اور ایک سال بعد اپنے باپ کی سفید ہڈیاں ایک صندوق میں رکھ کر ہر لڑائی میں آگے رکھی جانے لگیں۔ شیخ عمر نے ہر چند کوشش کی مگر وہ یوسف زئیوں کے ہاتھ میں بری طرح پھنس گیا۔ پہلے وہ روشنائیوں کے بڑے طرفدار دوست تھے۔ اب وہی ان کے جانی دشمن ہو گئے۔ یہ زبردست خیل صحرانوردی پہاڑوں کے کشادہ زمینوں میں بستے تھے جو دریائے کابل کے شمال میں ہیں اور دریائے سندھ سے مغرب کی طرف پھیلتے ہیں اور ان میں اضلاعِ ننہار (بنیر پنج کورہ، بجور اور چھچھ ہزارہ سے دریائے کنیر (کنڑ) تک ہیں جو جلال آباد کے نیچے تک بہتا ہے۔ مشرق میں مخالف یوسف زئیوں نے شیخ عمر پر باڑہ میں دریائے سندھ کے مغربی کنارہ پر آخری حملہ کیا۔ اس کو شکست دی۔ اسے اور اس کے بھائی خیرالدین کو مار ڈالا۔ انہوں نے شیخ عمر کی لاش کو جلا کر خاکستر بنایا۔ اس کو اور بایزید کی ہڈیوں کو دریائے سندھ میں پھینک دیا ساتھ ہی ان کے حمایتی یوسف زئی بھی شکست خوردہ ہو کر مصلحتاً خاموش ہو گئے) بایزید کے بیٹوں میں نورالدین کو گوجروں نے مار ڈالا، سب سے چھوٹا بیٹا جلال الدین مخالفین کی قید میں آیا۔ تمام بیٹوں میں سے یہ ایک ہی بیٹا بچا تھا۔ یہ اہم واقعہ ملا میر و کی وفات پر ۹۸۹ھ مطابق ۱۵۸۱ء کے آخری ایام میں پیش آیا تھا۔

۹۸۹ھ میں جب شہنشاہ اکبر کابل سے لاہور (اٹک) میں آیا تو اس وقت اس نے یہ لڑکا جلال الدین جو چودہ برس کا تھا اس کے مخالفین سے درخواست کر کے لے لیا۔ بادشاہ کو اس وقت اس بات کی ضرورت تھی کہ روشنائیوں میں سے کسی کو یوسف زئیوں کا دشمن بنائے۔ اس لئے کہ جتنی ان چور قزاق قوم کے درمیان نا اتفاقی ہو گی اتنا ہی خیبر اٹک شاہراہ میں امن و امان رہے گا۔ اس لئے اس نے جلال الدین کی بڑی خاطر داری کی مگر یہ شوخ بیباک لڑکا بادشاہ کے دم میں نہ آیا اور موقع پا کر بھاگ کر تیراہ میں جا پہنچا جو سب سے زیادہ روشنائیوں کے لئے مامن تھا۔ اس نے تیراہ میں بیٹھے بیٹھے بنگش آفریدی اورک زئی قبائل سے اخلاص پیدا کیا۔ یہ افغان قبائل خیبر کی راہ میں مغلوں کے سخت دشمن تھے۔ یہ لڑکا ایسی خوف کی مشعل بنا کہ اس کے شعلے اکبر تک پہنچنے لگے۔ اس جلالہ نے ایسے اپنے طرفدار پیدا کر لئے کہ پشتونوں کا بادشاہ اس کا خطاب ہوا۔

---

[1] شکست کے بعد جلال کو ۱۵۸۱ء میں اکبر کے سامنے اٹک میں پیش کیا گیا (بحوالہ یوسفی)

اور اس نے ہندوستان پر جہاد کیا۔ اس کے ایما سے بگرام کے نزدیک مہمند و غوریہ خیل نے فساد مچایا۔ ۹۹۲ھ میں انہوں نے مہمند اور غوریہ خیل کی مدد کی۔ یہ لوگ دس ہزار خانہ وار پشاور کے قریب رکھتی تھیں۔ پشاور میں مغلوں کے جاگیردار سید حامد بخاری اور اس کے نائب موسیٰ کے ظلموں سے یہ قوم جان سے عاجز ہو رہی تھیں۔ سید حامد پر بگرام میں انہوں نے حملہ کیا اور اس کو شکست دے کر اس کو اور اس کے چالیس آدمیوں کو مار ڈالا۔ ۹۹۲ھ میں سید حامد کے مارے جانے اور پھر اس کے امدادی سپہ سالار مان سنگھ کو شکست دینے کے بعد وہ بہت مغرور اور بدمست ہو گئے اور مہمند و غوریہ خیل نے پشاور سے تیراہ تک خیبر کی دونوں راہوں کو سنگ چین کر کے بند کر دیا۔ یوسف زئی اور ان کے متعلقین نے ان کے اس ہنگامہ کو رونق دی۔ دریائے کابل کے دونوں طرف مغلوں کے مقابلے سخت ہونے لگے جن کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوا۔

جنگ نے طول پکڑا بادشاہ کو فکر دامن گیر ہوئی چنانچہ اس نے ایک بھاری لشکر کے ساتھ مشرقی و مغربی اور جنوبی اطراف سے حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ مادھو سنگھ اور راجہ بھگونت داس اٹک پہنچے اور حملہ آور ہوئے۔ سوم دے ۹۹۵ھ لولان سے مان سنگھ اور قلی بیگ روانہ ہوئے۔ راستہ میں ادلس آفریدی پر تاخت کی اور ان کا بہت مال چھینا اور رود چورہ سے غوریہ خیل کی بنگاہ پر حملہ ہوا۔ جب تنگ نائی میں شاہی لشکر آیا تو جلالہ پیچھے سے نمودار ہوا۔ ہر طرف سے افغانوں کا جوش و خروش اٹھا۔ تختہ بیگ ہراول دستہ لے کر ان سے لڑا مگر عاجز ہوا تو واپس ہو کر اپنے لشکر سے جا ملا۔ مان سنگھ نے پھر ایک اور تازہ دم سپاہ کارزار میں بھیجی۔ لڑائی خوب ہوئی۔ مخالف کی شوخی کم ہوئی۔ مان سنگھ نے اپنے بیٹے جگت سنگھ کو لشکر کا اہتمام دے کر خود علی مسجد کی راہ لی۔ تھوڑے عرصہ میں پھر افغان ہر طرف سے آکر جمع ہو گئے اور کام زیادہ دشوار ہو گیا۔ طرفین کے سپاہی دست و گریبان ہوتے تھے اور عجیب لڑائیاں ہوتی تھیں۔ کابلی لشکر کارزار میں اٹھنے آئے اور پھر کارنامہ پہلوانی ظاہر ہوا۔ شام کے قریب لشکر اپنی منزل میں آیا۔ جلالہ گھات میں تاک لگا کے بیٹھا اور رات گئے افغانوں نے جا بجا ہنگامہ برپا کیا۔ تجویز یہ تھی کہ صبح قلعہ سے باہر جا

کر لڑیں گے لیکن تھکان اور ماندگی کے سبب سے یہ صورت نہ ہوئی اور (محصور بیٹھے رہے)
دوپہر کو مشرق سے بھگونت داس کا لشکر مادھو سنگھ لے کر نمودار ہوا اور اس عرصہ میں کابل سے
زین خان کوکہ بھی لشکر سمیت پہنچ گیا۔ سب نے مل کر روشنائیوں کے غار بند اکیھڑ میں بہت کوشش
کی تو یکبارگی روشنائی پراگندہ ہوئی۔ سخت دشواری میں بادشاہی لشکر کو فتح ہوئی۔ جلالہ کوہستان
تیراہ میں اورس آفریدی و اورک زئی اور بنگش میں آیا۔ وہاں اس نے ایک ہزار سوار اور پندرہ ہزار
پیادے تیار کر کے دربمند میں حملے شروع کر دیئے۔ (یعنی ضلع کوہاٹ میں محاذ جنگ قائم کر لیا)۔
۹۹۲ھ میں شہنشاہ اکبر کی جو لڑائیاں افغان اقوام سے ہوئیں۔ وہ پشاور کے میدان اور کوہستانی
زمین سواد۔ باجوڑ۔ مہمند اور تیراہ کے ملک میں ہوئیں۔ اس ملک میں بڑی بات یہ ہے کہ وہ مغربی
ایشیا اور ہندوستان کی شاہراہ ہے۔ جس شغال سے کشمیر کی لڑائی ہوئی اسی طرح اس افغان قوم سے
بھی لڑائی ہوئی مگر اس میں اکبر کے ساتھ یہ قوم سینہ زوری کے ساتھ بڑے بڑے مقابلوں سے
پیش آئیں اور اس کو کامیابی اور اکبر کو ناکامی۔
یہ لڑائیاں کابل کے شمال مشرقی علاقہ کے افغانوں سے ہوئی جو پشاور کے میدان (گندھارا) اور
اس کے گرد پہاڑی ملکوں میں بستے ہیں۔ یہ میدان بڑا وسیع اور نہایت زرخیز ہے۔ اس میں زمین
ہندوستان کی سی زرخیز اور بارآور ہے۔ اس میدان کے شمال میں سلسلہ کوہستان ہندوکش کا بڑا سلسلہ
ہے۔ مغرب میں اس میدان کی کوہ سلیمان کا بلند سلسلہ اور جنوب میں کوہستان خیبر کا سلسلہ جو
کوہ سلیمان سے دریائے سندھ تک پھیلتا ہے۔ افغانوں کا جو خاص ملک ہے اس کا دسواں حصہ یہ
ملک بھی ہے۔ زمانہ حال میں یہاں کے باشندے کو بردرانی کہتے ہیں۔ وہ اپنی چال ڈھال اور وضع
طرز میں ایسی خصوصیتیں رکھتے ہیں کہ افغانوں میں متمیز معلوم ہوتے ہیں۔
اس ملک کے شمالی حصہ میں بہ نسبت اور شمال مشرقی قوموں کے یوسف زئی زیادہ رہتے ہیں
اور اپنے باقی قوموں کا نمونہ ہیں۔ یوسف زئی کے ملک میں پشاور کا شمالی میدانی حصہ ہے جو اٹک
کے دریاؤں سے) ہندوکش کی برفانی بلندیوں تک پھیلتا ہے اور اس کے اندر تیس تیس چالیس چالیس

میل لمبے اور اس کے موافق چوڑی وادیاں ہیں جن میں سے ہر ایک کے دونوں طرف مزید شعبے وادیوں کی طرف جاتے ہیں۔ یہ وادی آب و ہوا اور حسن و لطافت اور دیگر خوبیوں میں کشمیر کی نظیر ہیں اور وہ تنگ ناؤں پر ختم ہوتی ہیں۔ جن کے گرد اونچے اونچے کراسے ہوتے ہیں۔ یا وہ جنگلوں اور درختستانوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسا ملک اپنے حملہ آوروں کے لئے بہت سے الجھیڑے اور عوائق اور موانع پیش کرتا ہے مگر وہاں کے باشندوں کے لیے کچھ مشکل نہیں وہ بے تکلف ایک وادی سے دوسری وادی میں آمد و رفت رکھتے ہیں۔ ان سے پہلے اصل باشندے یہاں کے ہند و معلوم ہوتے ہیں جو غالباً پار دیاکی سا کے ڈیا کی آل و اولاد میں سے ہوں گے۔ یہ نسبتاً زمانہ حال کا واقعہ ہے کہ بعض خاص افغانوں کی قوموں نے (غوریوں کے زمانہ میں) اس ملک کو فتح کیا اور اُن افغانوں کو بھی اب سے سو برس کا عرصہ گزرا ہوگا کہ یوسف زئیوں نے جو قندھار کے قریب بستے تھے اپنے وطن سے جلا وطن ہو کر ان کو نکالا ہو اور ان کے ملک پر قبضہ کیا ہو۔ یوسف زئی قوم آزاد تھی اور وہ دشوار گزار ملک پر قبضہ رکھتے تھے اور ان کے تابعین بہت سے تھے۔ اس لئے اس کو اپنی دولت کا بھی غرور تھا اور آزادی کی مستی پر دولت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ خود ہی عظمت اس سبب سے بھی رکھتی تھی کہ ان کی حکومت میں جمہوری نظام تھا۔ ہر خیل جدا جدا سرخیل موروثی رکھتا تھا۔ امن کے زمانہ میں سرخیل کو کوئی اختیار سوائے اس کے نہ تھا کہ وہ اپنے خیل کے آدمیوں سے مشورہ لے اور ان کی خواہش اور آرزوئیں دریافت کرے اور دوسرے سرخیلوں کو اطلاع دے۔ ہر گاؤں کے باشندے اپنے اندرونی قضیوں کو خود چکاتے تھے۔ مقدمات کا فیصلہ پنچایت میں ہو جاتا تھا۔ گاؤں میں چوپالیں یعنی حجرے ہوتے تھے اور ان میں کسی نہ کسی مطلب کے لئے مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ حجروں ہی میں آپس میں بیٹھ کر گاؤں والے جی بہلایا کرتے تھے اور مسافروں اور اپنے مہمانوں کو یہاں اتارا کرتے تھے۔ ان کی زمین آپس میں برابر بٹی ہوئی تھی اس طرح کہ بری بھلی زمینیں ہر ایک کے حصہ میں باری باری

آتی رہیں بمقتضائے عدل نئی تقسیمیں ہوتی رہیں۔ ہندی[1] رعیت کی مدارات اچھی طرح کی جاتی تھیں مگر معاملات و انتظامات ملکی میں اس کو مداخلت نہ تھی۔ یوسف زئی ان ہندیوں سے رنگ روپ میں ایسی فوقیت نہیں رکھتے تھے جیسی کہ اوضاع و اطوار و چال چلن میں جنوب میں افغان قومیں جو میدان کے قریب پہاڑوں میں رہتی تھیں۔ وہ مدت سے وہاں آباد تھیں اور ہندوستان کے حکمرانوں کے ساتھ بہت آمد و رفت و میل جول رکھتی تھیں۔ بعض قومیں اپنے ملک میں زیادہ نشیب و فراز رکھتی تھیں اور یوسف زئی قوم سے شائستگی اور تہذیب میں بھی کم درجہ رکھتی تھیں۔

شہنشاہ بابر نے (کابل کے) شمال و مشرقی قوموں کے مطیع بنانے میں سخت کوشش کی جن میں سے بعض قوموں کے تابع بنانے میں کامیاب ہوا مگر وہ یوسف زئی کو مغلوب کرنے میں بالکل ناکام رہا۔ نہ وہ صلح و آمیزش کی تدبیروں سے یوسف زئی کو اپنے بس میں لا سکا اور نہ ان کے ملک کے اس حصہ پر جس تک ان کی رسائی تھی سخت غارت گر حملہ آوری سے فتحیاب ہوا۔[2]

ابوالفضل لکھتا ہے کہ اولس یوسف زئی پیشتر قندھار اور قراباغ میں رہتی تھیں۔ وہاں

---

[1] یعنی ہند کے یا ایسے لوگ جو افغانی نسل سے نہ تھے اور افغانوں کے مددگار، ہمسایہ اور کسب گر تھے اور ان کے ساتھ رہنے سے وہ بھی افغانی زبان بولتے تھے یعنی یہ لوگ ان کے ہمزبان اور ہم مذہب اور ان کے ہر نیک و بد اور برادری میں شامل تو تھے لیکن نسلاً افغان نہ تھے۔

[2] مصنف تاریخ ہندوستان صفحہ ۶۴ میں لکھتا ہے کہ ابوالفضل کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ بادشاہی فوج کی بدنامی بہت کم شہرت پائے اور کوئی بات ایسی نہ لکھی جائے جس سے بیربل کی کم فہمی اور نارسائی سمجھ جائے تو اس نے اس واقعہ کو ایسا پراگندہ قلم بند کیا کہ ایک قول اسکا دوسرے قول کے مخالف ہے۔ اس نے بادشاہی فوج کی تباہی اگرچہ بڑی شرح و بسط سے بیان کی مگر اس کے اخیر میں یہ لکھ دیا کہ بادشاہی فوج کے کل پانچ سو آدمی کام آئے، مگر خافی خان نے ایسی صاف گوئی کی کہ چالیس پچاس ہزار آدمیوں میں سے کوئی زندہ نہ رہا۔"

سے کابل میں آکر چیرہ دست ہوئی۔ مرزا الغ بیگ کابلی نے دستان سرائی سے اس کو مارا دھاڑا۔ پس ماندے لمغانات میں آسائش سے بیٹھنے لگے پھر اشنغر میں آگئے۔ سو برس کا عرصہ گزرتا ہے کہ سواد و بجور میں راہزنی و سرتابی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس سرزمین میں ایک گروہ رہتا تھا جس کا خطاب سلطانی تھا۔ ان کے عمدہ عمدہ مقامات اپنے قبضہ میں کر لئے۔ یوسف زئی کا بنگاہ کوہستان سواد و بجور میں ہے اور اکثر وہ دشت (میدان) میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس دشت کے دو طرف دریائے سندھ ہے اور باقی دو جانبوں میں دریائے کابل و کوہستان شمالی ہے۔ دلکشا سبزہ زار نگاہ فریب زمینیں ہیں جن کے دیکھنے سے خوشی ہوتی ہے۔

دریائے سندھ کے مغربی کنارہ پر جنگ باڑہ میں شیخ عمر کے قتل کے بعد جب اکبر بادشاہ نے یہاں (ملک یوسف زئی پر) یورش کی تھی تو یوسف زئیوں میں سے جو کلاں تر تھا وہ لابہ گری کر کے جب فرساہوا تھا اور پہلے اپنی بدکاری سے شرمسار ہو کر پیمان پرستاری استوار کیا تھا ان میں سے کالو پر بادشاہ نے عنایت کر کے سب سے زیادہ سرفراز کیا مگر تھوڑے سے دنوں بعد بغاوت کر کے یہ قوم پھر اپنے آئین سابق پر مائل ہوئی۔ راہزنی اور خلق آزاری پر کمر باندھی اور دارالخلافہ سے کالو بھاگ گیا۔ خواجہ شمس الدین خوافی نے نواحی اٹک سے دستگیر کر کے بادشاہ کے پاس بھیجا۔ بادشاہ نے بجائے پاداش کے اس پر نوازش فرمائی۔ پھر وہ بھاگ گیا اور اپنی پہلی بنگاہ میں پناہ لی اور یوسف زئی زمینداروں کی سرکشی کا بھی سبب ہوا۔ کالو خان پر باوجودیکہ بادشاہ نے بہت نوازش کی تھی مگر وہ بھاگ کر شورش منشوں سے جا ملا اور دو مغار منش افغانوں نے اس کو اپنا سردار بنایا اور کوہ مورا کو روانہ ہوئے۔

بادشاہ نے بہت سے سپاہ اور افسروں کا زین خاں کو کلتاش کو سپہ سالار بنا کر اور غریب خاں جہانی کو بخشی بنا کر روانہ کیا تاکہ یوسف زئی کو سزا دیں۔ ۲۵ دی ۹۹۴ھ کو قرابیگ و ضیاء الملک اور سپاہ کو بسر کردگی شیخ فرید بخش روانہ کیا۔ وہ ایک عمدہ تاخت

کر کے الٹا چلا آیا اور بادشاہ سے عرض کیا کہ دشت کا کام بہت سخت ہے۔ مناسب ہے کہ اگر فوج اور نامزد ہو تا کہ شائستہ طور پر قوم یوسف زئی کی بیخ کنی کی جائے۔ اس لئے بادشاہ نے مزید لشکریوں اور افسروں کو جانے کا حکم دیا چنانچہ ۴ بہمن کو بہ سرکردگی سعید خاں اور ملک الشعراء فیضی اور دستر خواجہ و شیخ ابوالبرکات اور دیگر افسروں سمیت یوسف زئی کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے اور بادشاہ نے ان کو ہدایت کی کہ اگر کوئی بڑی لڑائی خود نہ کر سکیں تو ہم کو مطلع کریں۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی کہ اگر اسی لشکر پر چھوڑ دیا جائے گا تو اس بدکار قوم کی فرزدنی اور کوہستان و تنگ ناؤں کی دشوار گزاری سے کام دیر میں انجام پائے گا۔ اس لئے بادشاہ نے ۱۲ بہمن کو ایک اور تازہ لشکر بیربل کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ بنیر کے فتح کے ارادہ سے اس طرف چلا۔ جب تھوڑی تنگ ناؤں کو لشکر طے کر کے منزل درک میں آیا تو افغانوں نے لڑنا شروع کیا۔ بڑی لڑائی ہوئی۔ بہت مخالف اسیر و قتل ہوئے لیکن ناوقت ہو گیا تھا اور آگے کا حال معلوم نہ تھا۔ اس لئے لشکر خیمہ گاہ کو واپس آیا اور معلوم ہوا کہ اس طرف جانے سے مقصد حاصل نہیں ہوگا تو دشت (میدان) میں لشکر واپس آیا تا کہ دوسری راہ سے جائے۔

زین خاں کوکلتاش کی طرف سے بادشاہ کے پاس عرضداشت آئی کہ بجور و سواد کا بڑا حصہ قبضہ میں آگیا ہے مگر لشکر تھک گیا ہے اور گریوہ کراکر میں جو سواد اور بنیر کے درمیان ہے۔ افغان جمع ہوئے ہیں۔ اگر مزید لشکر جوانمردوں کا بھیجا جائے تو شائستہ طور پر سارا ملک قبضہ میں آجائے گا اور سرکشوں کو سزا مل جائے گی۔ بادشاہ نے ۱۹ بہمن ۹۹۴ھ کو بہ سرکردگی حکیم ابوالفتح شمشیر بازوں کو بھیجا۔ تھوڑے عرصہ میں دونوں لشکر مل گئے۔ زین خاں نے اوّل بجور کی فتح کا ارادہ کیا۔ وہاں تیس ہزار خانہ دار یوسف زئی رہتے تھے اور ان کے پاس دشوار کشا گریوہ (درّے) تھے۔ بادشاہی سپاہ چابک دستی کر کے دانش کول کے راستہ سے آئی۔ ان پر تاخت کی اور بہت سے سرکشوں کی مالش کی۔ جب وہ نہایت تنگ ہوئے تو یوسف زئی کے سرداروں غازی خاں، مرزا علی اور طاؤس خاں نے پناہ مانگی اور وہ ملنے آئے۔ دفعتاً شورش

دور ہوئی۔ یہاں سے ولایت سواد کا قصد ہوا۔ وہاں کے کوہستان میں چالیس ہزار خانہ دار یوسفزئی رہتے تھے۔ جب لشکر شاہی دریائے (پنجکوڑہ) کے کنارے پر پہنچا تو اس زمین کے (افغان) بہادروں نے جنگ میں قدم جمایا۔ لشکر کے ہراول دستہ نے دریا سے گزرنے میں باگ کھینچی لیکن التمش نامی ایک خاص دستہ کے دلاوروں نے تیزدستی کی اس کی دیکھا دیکھی دیگر لشکر بھی اس راہ پر آ ئے، بڑی لڑائی ہوئی، غنیم ناکام بھاگ گیا۔

زین خاں کوکہ نے چکدرہ میں جو کہ وسط ولایت یوسف زئی میں ہے قلعہ کی بنیاد رکھی اور سرکشوں کی مالش کا قصد کیا۔ یہاں اس نے تیئیس ۲۳ دفعہ فتح پائی، سات لشکروں کو شکستہ کیا۔ ولایت بنیر کا سارا ملک سوائے گریوہ کراکر کے قبضہ میں آگیا۔ لیکن کارزار کی فرزونی اور پہاڑی جنگوں سے لشکر تھک گیا تھا۔ لہذا زین خان کوکہ نے کمک مانگی۔ بادشاہ نے دوسرے دلاوروں سے جہاں پر راجہ بیربل اور حکیم ابوالفتح نامزد تھے تبدیل کر کے ان کو زین خاں کے ہاں نامزد کیا۔ چکدرہ میں یہ سب آپس میں ملے۔ چکدرہ سے کراکر کی طرف سپاہ چلی اور پانچ کوس چل کر موضع کانداک میں اتری۔ دوسرے روز یہ تدبیر ٹھہری کہ آج ہراول کچھ تاخت کر کے پھر آئے۔ صبح کو جب اس پر مخالف آئے تو لڑائی شروع ہو لیکن اقدام اور رواداری بے رونق ہوئی۔ افغانوں نے پیچھے خوب لوٹ مچائی۔ حسن خاں پٹنی زخمی ہو کر کنارہ کش ہوا۔ چلنے والوں پر کام بہت تنگ ہوگیا۔ زین خاں کوکہ کارزار میں آیا۔ اس دن اور تمام رات اور پھر دوسرے روز بھی ہنگامۂ جنگ خوب گرم رہا۔ مخالفوں کے چار سرگروہوں کو کوکہ نے خود اپنی بندوق سے مارا۔ افغان کچھ پریشان ہوئے۔ آخر دن کچھ فتح کی صورت معلوم ہوئی۔ مگر اونٹوں اور بیلوں کی باربرداری سب لٹ گئی۔ جو اسباب ہاتھی اور خچر پر تھا وہ سلامت منزل پر پہنچا۔ دوسرے روز کچھ کوس چل کر افغانپور میں آئے۔ کوکہ نے چند آدمیوں کی افسری خود کی۔ تمام راہ جنگ کرتا ہوا منزل پر پہنچا۔ راجہ کے دائرہ پر پہنچ کر مجلس مشورہ منعقد کی۔ نیچے دشت (میدان) کو راہ تھوڑی باقی تھی۔ لیکن نشیب و فراز اس راہ کو نظر نہیں آتا تھا۔ سب نے یہ صلاح دی کہ مناسب یہ ہے کہ گریوہ

درّہ سے گزر کر چند روز قیام کریں اور مخالف کا از سرِ نو علاج کریں۔

کوکہ نے گزارش کی کہ آگے تنگ نائے ایسی دشوار گزار ہیں کہ اس راہ پر چلنا اپنے تئیں بے آبرو کرنا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ اسی منزل میں کہ کچھ فراخ ہے اور کوئی سرکوب نہیں ہے اور پانی گھاس بہت ہے۔ ایک دیوار بنا کر قیام کریں اور مخالفوں کو جو کہ سارے پہاڑ کو گھیرے ہوئے ہیں سزا دیں۔ اگر یہ بات تم کو دلنشین نہ ہو تو توقف کریں کہ بادشاہ کو اطلاع کریں اور ایک فوج اس طرف سے آکر گریوہ کے سرے کو نگاہ رکھے تب چلے جائیں مگر راجہ اور حکیم اپنے منصوبے پر جمے رہے اور وہ ملندری کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے روز سے بھی زیادہ سخت لڑائی ہوئی۔ لشکر کچھ تھوڑی دور چلا تھا کہ دن ختم ہوا۔ اس نے درہ کے سرے کو بزرگ گریوہ کی ابتدا جانا۔ وہ اتر پڑا۔ کوکہ کے آنے سے معلوم ہوا کہ ابھی ایک اور تنگی سے گزرنا باقی ہے۔ چونکہ پیچھے سے افغان چلے آئے تھے۔ شاہی لشکر کی کوچ نا ہنگام اور ہراول کے آگے دوڑنے سے چلنے کا آئین بگڑ گیا۔ افغانوں نے ہر طرف سے تیر و پتھر ایسے پھینکے کہ وہ غالب ہو گئے۔ سراسیمگی کے سبب سے پہاڑوں کی بلندی پر سے پستی کی طرف لشکر اترا۔ اس رواروی میں گھوڑے اور آدمی اور ہاتھی سب گڈ مڈ ہو گئے اور بہت سے مارے گئے۔ بڑے بڑے افسر مارے گئے۔ کچھ راہ کو پہچان کر چلے۔ اور آخر کو اس گریوہ دشوار سے گزر کر نیچے آئے۔ کوکہ کا ارادہ ہوا کہ اس لڑائی میں اپنی جان دیدیں مگر جانسن بہادر اس کے آگے آیا اور کام د ناکام اٹھا گیا۔ کچھ چل کر وہ بے راہ ہوا، بصد دشواری منزل پر پہنچا لیکن لوگوں نے یہ خبر اڑائی کہ افغان پیچھے سے چلے آتے۔ اس لئے نہایت بیتابی کے ساتھ کوچ بے ہنگام ہوا۔ آدمی تاریکی کے سبب راہوں سے بھٹک کر دروں میں چلے گئے۔ اگرچہ افغان مال شاہی کے حصے کر کے بانٹنے میں مصروف تھے۔ دوسرے روز بہت سے آدمی جو راستہ بھول گئے تھے جان سے گئے۔ کچھ ان میں سے قید ہوئے۔

خافی خان (اکبر کا مغل افسر) لکھتا ہے کہ :-

چالیس پچاس ہزار آدمی مارے گئے اور لشکر میں ایک بھی زندہ نہیں بچا۔ یہ شکست سواد کے پہاڑوں میں ہوئی اور جن درّوں میں واقع ہوئی ان کا نام کراکر اور ملندری لکھا ہے بادشاہ کے روشناس بہت تلف ہوئے خصوصاً راجہ بیربل کے مرنے سے طرح طرح کے رنج بادشاہ کو ہوئے۔ ایک رات دن کھانا نہیں کھایا۔ بادشاہ کو اس کے برابر کسی امیر کے مرنے کا غم نہ ہوا۔ وہ افسوس کرتا تھا کہ اس کا جسم نہ ہاتھ لگا کہ آگ میں جلایا جاتا مگر اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتا تھا کہ وہ سب قیود سے آزاد اور مجرّد تھا۔ اس کے لئے نیر اعظم (سورج) کی تابش پاک کرنے والی کافی ہے۔

بادشاہ قلعہ اٹک میں مقیم تھا۔ جب بادشاہ نے لشکر اور اپنے اخلاص نہادوں کے مرنے اور شکست پانے کا حال سنا تو خود بادشاہ کا ارادہ اس ملک میں جانے کا ہوا لیکن اخلاص گزینوں کے کہنے سے اس یورش سے باز رہا۔

مرزا الغ بیگ کابلی کے زمانے سے اولس یوسف زئی کہ ایک لاکھ سے زیادہ تھے۔ کوہستان دشوار گزار کی آڑ میں ہمیشہ راہ زنی کرتے اور شاہی مسافروں کو طرح طرح کی گزند پہنچاتے۔ کابل کے مرزبانوں میں یہ قدرت نہ تھی کہ ان کی مالش کرتے۔ ہندوستان کے حکمرانوں کو بھی اپنے کاموں کی کثرت اور تنگ حوصلوں کی ہمزبانی نے اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ ان دنوں بادشاہ کا ارادہ ہوا کہ یہ قوم مردم آزاری اور تباہ کاری سے باز آئے اور فرمان پذیری اور خدمت گزاری اختیار کرے اور ملک سواد و بجور وغیرہ ان بدکاروں سے پاک ہو جائے لیکن اولس یوسف زئی اپنے مضبوط دفاعی مقامات اور بادشاہی لشکر کی شکست کے سبب سے زیادہ سرکش ہو گئی۔ ہر چند کہ اس کو سزا دی جاتی تھی مگر وہ اپنی راہ زنی اور بدکاری سے باز نہیں آتی تھی۔ یوسف زئی کی مالش میں سپاہ شاہی پیہم کوشش کرتی تھی مگر بوم استواری سے غالب نہیں ہوئی تھی۔

۹۹۶ھ میں جلالہ روشنائی مغل سپاہ سے جب تنگ ہوا تو وہ تیراہ سے یوسف زئی

کی بنگاہ میں چلا گیا اور انہوں نے اس کو اپنے اں جگہ دیدی۔ روشنائی افغان اور یوسف زئی مل کر آمادہ پیکار ہوئے۔ اولس لگیانی اور محمد زئی بھی (روشنائی افغانوں) اور یوسف زئی کی ہمداستاں ہوئیں اور بگرام کے نزدیک۔ محمد قلی نریمان کے پیچھے پڑیں تاکہ اس تمام ملک پر ان کو غلبہ ہو جائے۔ کچھ عرصہ کے بعد جلالہ پھر تیراہ چلا گیا اور یہاں اپنا اہم مقام اپنے خویش وحدت علی کو چھوڑا۔ وحدت علی جلالہ کے خویش نے یوسف زئی کی مدد سے ۱۰۰۱ھ میں قلعہ کنشان اور کچھ حصہ کافروں کی ولایت کا بھی فتح کر لیا تھا۔ شاہی فرمان صادر ہوا کہ اب وحدت علی کو پامال کرنا چاہیے۔ بادشاہی لشکر اپانک کافر بوم میں شاہزادی راہ سے آئے اور موضع کندی کبار میں دریائے بجور (کنڑ) کا پل باندھ کر اترے۔ یہ دریا ستر گز چوڑا اور بہت گہرا اور تند تھا۔ خواجہ شمس الدین خافی کو اس پل کی پاسبانی اور راہ کی ابھی سپرد کر کے لشکر آگے جا کر غنیم سے آٹھ کوس پر پہنچے۔ دس جگہ دشمنوں نے سنگ چین بنائے تھے اور وہاں سے لڑتے تھے۔ کوکہ چند آدمیوں کے ساتھ جا کر منزل گاہ کی تلاش میں لگا اور تختہ بیگ، سعید خان اور حیدر علی عرب ہراول بنا کے آگے بھیجے کہ خفیہ طور پر کسی عمدہ جگہ بیٹھیں اور لڑائی نہ لڑیں یعنی اپنے آپ کو ظاہر نہ ہونے دیں لیکن ان کو دیکھ کر افغانوں نے ان کے سر پر ہجوم کیا، ناچار لڑنا پڑا۔ انہوں نے غنیم کو چار دفعہ پیچھے ہٹا دیا۔

کوکہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جا ملا جن سے ہراول کو تقویت ہوئی۔ سخت لڑائی اور نقصان عظیم کے بعد وحدت علی چند آدمیوں کے ساتھ بڑے نشیب میں گیا۔ دشمن شکست کھا کر پراگندہ ہوا اور قلعہ کنشان اور دیگر بہت آباد جگہیں بادشاہی لشکر کے ہاتھ آئیں۔ کچھ افغان چغان سرا کی طرف، بدخشاں رویہ چلے گئے تاکہ دریائے بجور (کنڑ) سے گزر کر کافروں کی زمین میں جا کر پناہ لیں۔ بادشاہی لشکر نے تیز دستی کر کے اس طرف

کا پل توڑ دیا۔ ناگزیر یوسف زئی کے سرداروں حاتم، بابا علی[1]، ہندال اور حسین نے قاسم خاں (مغل افسر) سے پناہ مانگی۔ غنیم کے چار سو آدمی مارے گئے۔ بادشاہ کی طرف سے تیس آدمی مارے گئے۔ اور ڈیڑھ سو زخمی ہوئے لیکن قاسم خاں کے مرنے کے فوراً بعد پھر ان افغانوں نے سرتابی کی اور اٹک خیبر شاہراہ کو ناامین کیا۔" (اقبال نامہ اکبری جلد ۵)

مختصر یہ کہ اکبر کی تمام کوششیں افغانوں کو مطیع کرنے کے سلسلہ میں ناکام رہیں اور یہ سلسلہ تقریباً بیس سال تک جاری رہا۔ عہد اکبر کے متعلق میجر راورٹی نے یوں اظہار خیال کیا ہے کہ:۔

"قتل و خونریزی اور ملک کی تباہی و بربادی کے باوجود ان افغان قبائلی علاقہ میں مغل کسی وقت بھی مستقلاً اپنے پاؤں جما نہ سکے اور نہ ہی کسی وقت ان حقائق کو ضبط تحریر میں لانے کے قابل ہوئے اس وجہ سے "آئین اکبری" کی کوئی ایک جلد بھی مکمل نہیں کہلا سکتی۔"

اسی طرح عہد اکبر سے قبل مغلوں کے متعلق مسٹر کیرو لکھتا ہے کہ:۔

"پٹھانوں کے میدانی یا پہاڑی علاقوں پر بابر، کامران یا ہمایوں کے زمانہ میں کوئی مغل حکومت قائم نہ تھی۔ یہ حکمران زیادہ سے زیادہ مشکل ترین راستوں کی حفاظت کا انتظام کرتے رہے یا (افغان) قبائل کی حمایت اس وجہ سے حاصل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ان کے خاندانی جھگڑوں میں کام آسکیں۔"

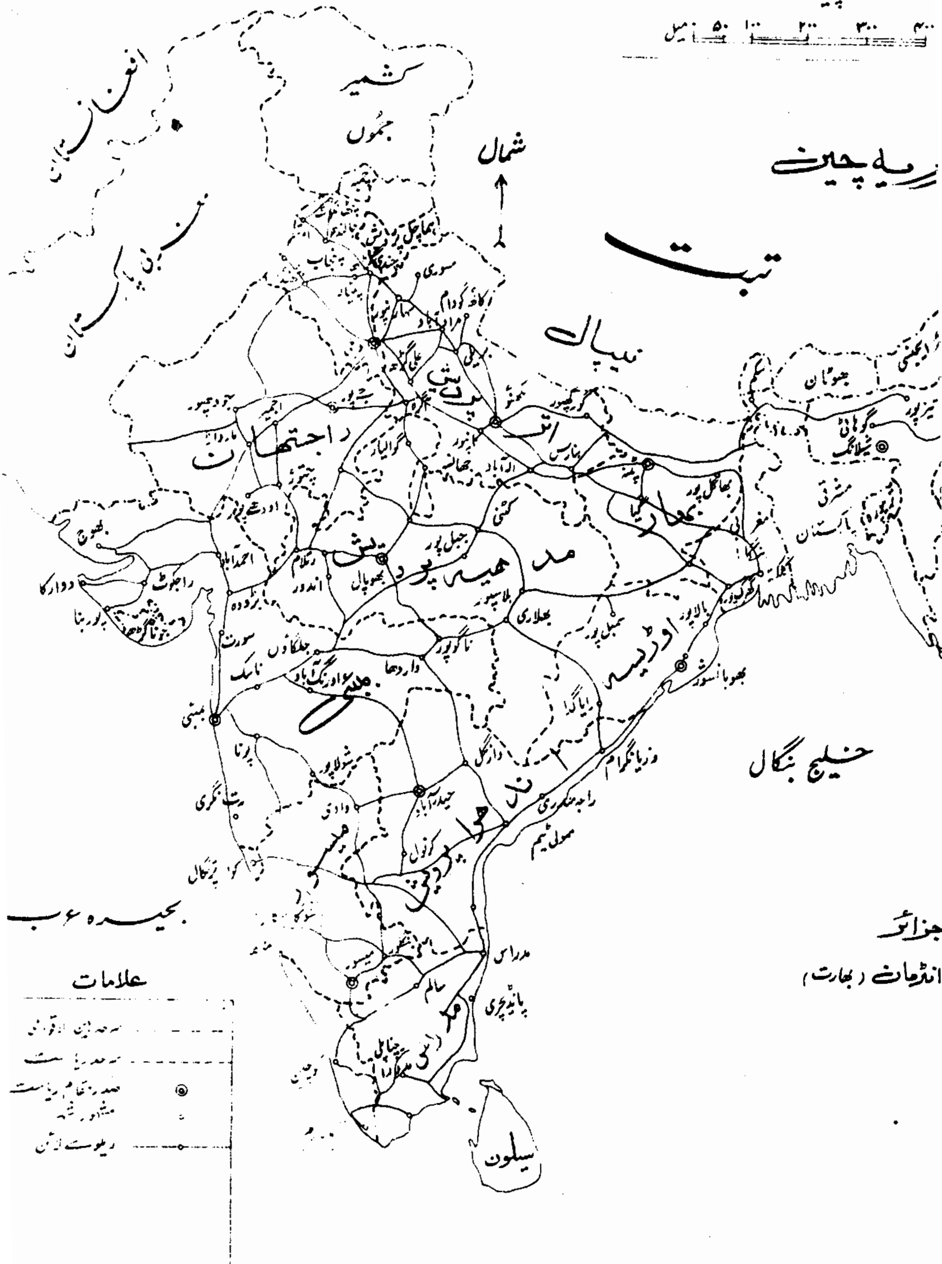
یہ تو تھا شمال مغربی علاقہ کے افغانوں کے حالات۔

اب ہم ہندوستان کے افغانوں اور ان کی قائم کردہ ریاستوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

---

[1] بابا علی بن سرگن ماموزئی راقم الحروف روشن خان بن محمد زمان خان کا بارھویں پشت میں جداعلیٰ ہے غفر اللہ لہٗ

بابا علی کا مزار موضع چار باغ سوات میں پردیسی بابا کے نام سے مشہور ہے۔



بھارت
نظامی تقسیم (ریاستیں)
پیمانہ
میل
شمال
کشمیر
جموں
ہماچل پردیش
پنجاب
مسوری
افغانستان
مغربی پاکستان
تبت
نیپال
بھوٹان
شیلانگ
مشرقی پاکستان
راجستھان
اجمیر
جودھپور
چتوڑ
اودے پور
اتر پردیش
آگرہ
گوالیار
کانپور
لکھنؤ
گورکھپور
الہ آباد
بنارس
پٹنہ
بہار
بھاگل پور
کلکتہ
مدھیہ پردیش
کٹنی
جبل پور
بھوپال
اندور
بلاسپور
احمد آباد
بھوج
راجکوٹ
دوارکا
پوربندر
بڑودہ
سورت
جلگاؤں
ناسک
اورنگ آباد
واردھا
ناگپور
بمبئی
پونا
شولاپور
اڑیسہ
سمبل پور
بھوبانسور
وزیاناگرام
راجہ مندری
وارنگل
حیدرآباد
کرنول
میسور
مدراس
سالم
پانڈیچری
سیلون
خلیج بنگال
بحیرہ عرب
علامات

ہندوستان میں افغان ریاستیں اور شہنشاہ اکبر

سلطنت مالوہ

واضح ہو کہ مالوہ ایک وسیع صوبہ ہے۔ سرسبز، آبادو شاداب، ہمیشہ ذی شان راجاؤں کے زیر حکومت رہا ہے۔ دہلی کے سلاطین میں سب سے پہلے غیاث الدین بلبن نے اس پر قبضہ کیا۔ جب محمد شاہ بن فیروز شاہ تخت نشین ہوا تو جن امرا نے اس کا ساتھ دیا تھا ان میں سے دلاور خان غوری کو مالوہ عطا کیا اور وہ اس صوبہ میں سلطنت کا بانی ہوا۔ ۷۹۶ھ کے آغاز سے دلاور خان افغان مالوے کی حکومت پر فائز ہوا۔ جب محمد شاہ کے مرنے پر ہندوستان میں بدنظمی پھیلی تو خود مختار بن بیٹھا اور قبائے سلطنت پہن لی۔ پچیس سال کامیاب حکومت کر کے فوت ہوا۔ پھر اس کا بیٹا ہوشنگ شاہ بادشاہ ہوا۔ وہ تیس سال حکومت کر کے فوت ہوا اور سلطان محمود خلجی جو ہوشنگ شاہ کا امیر الامراء تھا۔ ہوشنگ شاہ کی بہن اس سے بیاہی تھی، کو بادشاہ بنایا گیا۔ اس نے سلطنت کو وسعت دی۔ بوندی کا علاقہ اور مارواڑ بزورِ شمشیر فتح کیے۔ تیس سال نہایت ہی کامیاب حکومت کر کے فوت ہوا اور اس کا بیٹا سلطان غیاث الدین بادشاہ ہوا۔ اس نے ۳۴ سال حکومت کی۔ پھر اس کا بیٹا سلطان ناصر الدین بادشاہ ہوا۔ اس نے چودہ سال چار ماہ حکومت کی اور فوت ہونے پر اس کا بیٹا سلطان محمود بادشاہ بنا اور بیس سال حکومت کر کے فوت ہوا۔ پھر سلطان بہادر شاہ مالوے پر حکمران ہوا اور چھ سال حکومت کر کے فوت ہوا۔ پھر ملو قادر شاہ جو سلاطین مالوہ کا جابر امیر تھا، کو بادشاہ بنایا گیا اور چھ سال پانچ ماہ حکومت کی۔ اس کے بعد شجاعت خان عرف سیاول خان افغان نے بارہ سال حکومت کی اور اس کی وفات پر پھر اس کا بیٹا باز بہادر خان افغان عرف بایزید خان بن شجاعت خان بادشاہ بنا اور دس سال تین ماہ حکومت کی کہ شہنشاہ اکبر کی فوج حملہ آور ہوئی اور

سخت جوابی کارروائی کے باوجود، مغل فوج کامیاب ہوکر مالوہ پر قابض ہوئی گویا ۹۶۱ھ کے آغاز سے ۹۶۷ھ تک، کہ ۱۷ سال کی مدت ہے، مالوہ پر افغانوں کی حکومت قائم رہنے کے بعد اکبر کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

سلطنت جونپور

فصیح الدین بلخی اپنی تصنیف تاریخ مگدھ میں سلطنت جونپور کے متعلق لکھتا ہے کہ :۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کے بعد ممالک شرقی پر سلاطین دہلی کا تسلط برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ ۷۹۴ھ میں ناصر الدین محمود بن محمد شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے ماہ رجب ۷۹۶ھ میں ملک سرور (افغان) المقلب بہ خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دیکر قنوج سے بہار تک تمام صوبوں کی حکومت تفویض کر کے بیس زنجیر فیل اور لشکر گراں کے ساتھ جونپور روانہ کیا۔ ملک الشرق نے تھوڑی ہی مدت میں ان علاقوں کے تمام زمینداروں کو مطیع کر لیا۔ بعض قلعے جو خراب ہو رہے تھے ان کو از سر نو مرمت کر کے درست کر لیا اور ایسی صولت و حشمت حاصل کی کہ اڑیسہ کا راجہ اور سلطان بنگالہ جو سابق دور میں سلطان فیروز کے پاس دہلی پیش کش اور نذریں بھیجا کرتے تھے، اب ملک الشرق کے پاس جونپور بھیجنے لگے۔ ملک الشرق نے چھ برس حکومت کر کے ۸۰۲ھ میں انتقال کیا۔ اس کے مرنے پر اس کا بیٹا مبارک شاہ تخت نشین ہوا۔ مبارک شاہ کے مرنے پر اس کا بھائی ابراہیم شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے سلطنت کو وسعت دی اور کالپی پر بھی قبضہ کر لیا۔ ابراہیم شاہ شرقی نے چالیس سال حکومت کی۔ اس کے زمانے میں دہلی کی شان و شوکت جاتی رہی تھی اور جونپور کی ایسی عظمت تھی کہ علماء و فضلاء نے جونپور ہی کو مرجع قرار دیا تھا۔ ابراہیم شرقی کے مرنے پر شہزادہ بھیکن کو محمد شاہ کا لقب دے کر تخت

نشین کیا گیا اور اس کے مرنے پر اس کا بھائی حسین شاہ تخت نشین ہوا لیکن اس سے اور اس کے بھائی سے ارکین مملکت اور عوام ناخوش تھے لہذا سلطان بہلول لودی کے تعاون سے جونپور کی سلطنت مبارک خان لوحانی (افغان) کو سپرد ہوئی۔"

صوبہ بہار میں پٹھانوں کی حکومت

فصیح الدین بلخی اپنی تصنیف تاریخ مگدھ میں صوبہ بہار میں پٹھانوں کی حکومت کے عنوان سے لکھتا ہے کہ :۔

"مبارک خان لوحانی کے مرنے پر اس کی خدمات کے صلے میں سکندر لودی نے دریا خان پسر مبارک خان لوحانی (افغان) کو صوبہ بہار کی حکومت تفویض کی ۔ ۹۲۲ھ میں سکندر لودی کے مرنے پر دہلی میں ابراہیم لودی تخت نشین ہوا۔ اس وقت امراء ذی اقتدار کی صلاح سے یہ امر طے پایا کہ سلطان ابراہیم سرحد جونپور تک فرمان روا رہے۔ اس طرف ممالک شرقی میں جلال خان (برادر ابراہیم لودی) حکمرانی کرے لیکن خان جہان لوحانی نے رزراء کو سخت ملامت کی کہ حکومت کو مشترک ٹھہرانا سخت غلطی ہے لہذا ارکانِ دولت نے تلافی مافات کے لئے جلال خان کو حیلے سے دہلی بلوانا چاہا لیکن وہ نہ آیا۔ تب انہوں نے تمام امراء اور حکام کو جن میں دریا خان حاکم ولایت بہار سب سے زیادہ ذی اقتدار تھا اور تیس چالیس ہزار ملازم رکھتا تھا، جلال خان کی اطاعت سے باز رکھا۔ جلال خان نے اول جونپور کو چھوڑ کر کالپی میں اپنے نام سے خطبہ و سکہ جاری کیا لیکن بالآخر محض جاگیر دار ہو کر کالپی میں رہنے کو غنیمت سمجھا۔ سلطان ابراہیم کے وقت میں تمام امراء باغی اور خودسر ہو گئے تھے زمانے کی ہوا کو دیکھ کر بہار میں دریا خان کو بھی جوش آگیا اور خود مختار ہو کر حکومت کرنے لگا۔ دولت خان نے سلطان ابراہیم سے متوہم ہو کر بابر بادشاہ کو ہندوستان فتح کرنے کی دعوت دی لیکن بابر کے آنے سے پہلے ہی دولت خان مر گیا اور اسی زمانے میں دریا خان

نے بھی انتقال کیا۔ دریا خان کے مرنے پر اس کا بیٹا بہادر خان حاکم ہوا۔

اس زمانے میں اکثر افغان امراء مثلاً جہان خان لودی، حسن خان فرملی حاکم قصبہ سارن اور نصیر خان لوحانی حاکم غازی پور باغی ہوکر بہادر خان حکمران بہار سے مل گئے۔ جس سے تقریباً ایک لاکھ کی جمعیت فراہم ہوگئی۔ بہادر خان نے علی الاعلان خودسری اختیار کی اور اپنا لقب محمد شاہ رکھ خطبہ وسکہ جاری کیا۔ بہادر خاں (محمد شاہ) کے زمانے میں ہی ۹۳۵ھ میں بابر نے صوبہ بہار پر فوج کشی کی لیکن منیر تک جاکر پھرا اور آگرہ واپس ہوا۔ بہادر خاں (محمد شاہ) نے ۹۳۷ھ میں انتقال کیا اور اس کے مرنے پر اس کا بیٹا جلال خان اس کا جانشین ہوا۔

اس کی کمسنی کے سبب اس کی ماں ملکہ لاڈو فرید خان (شیر شاہ) کی مشورت سے حکومت کا انتظام کرتی تھی۔ فرید خان محمد شاہ کے وقت سے شہزادہ جلال خان کا اتالیق تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ملکہ لاڈو بھی مرگئی اور فرید خان (شیر شاہ) خود حکومت کرنے لگا۔ جلال خان کی حکومت حقیقتاً شیر شاہ کی بادشاہت تھی۔ اس ذی لیاقت پٹھان کی بدولت صوبہ بہار کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں کا ایک باشندہ معمولی جاگیردار کی حیثیت سے ترقی کرکے سارے ہندوستان کا بادشاہ بنا۔

شیر شاہ نے ۹۴۷ھ میں خضر خان شروانی کو بنگالے کا حاکم مقرر کیا اور سلیمان کرلانی کو صوبہ بہار کا حاکم بنایا۔ شیر شاہ نے پندرہ برس حکومت کی اور اس مدت میں پانچ برس سے کچھ زیادہ سارے ہندوستان کی بادشاہت کی اور ۹۵۲ھ مطابق ۱۵۴۷ء میں قلعہ کالنجر کی تسخیر میں ایک سرنگ کے پھٹنے سے بارود سے جل کر انتقال کیا اور اس کی لاش قلعہ سہسرام لاکر آبائی قبرستان میں دفن کی گئی۔ اس کا یہ مقبرہ سلیم شاہ نے ۹۵۶ھ میں تعمیر کرایا۔

سلیمان خان کرلانی امرائے شیر شاہ میں تھا اور شیر شاہ کے وقت سے صوبہ بہار کی

حکومت پر مامور تھا۔ شیر شاہ کے بعد سلیم شاہ کے عہد میں بھی یہ اپنے عہدہ و منصب پر قائم رہا۔ جب سوری خاندان کی سلطنت کو زوال آیا۔ اور بنگالے میں محمد خان سور کے خاندان کا خاتمہ ہوا تو اس وقت سلیمان خان نے اپنے بھائی تاج خان کو بنگالہ بھیج کر یہاں بھی دخل جمایا۔ تاج خان کے مرنے پر ۹۷۰ھ میں سلیمان خان بلا شرکت بہار کے علاوہ بنگالے کا بھی بادشاہ ہوگیا۔ سلیمان شاہ کرانی نے ۹۸۰ھ میں انتقال کیا۔ یہ اپنے زمانہ میں نہایت بیدار مغز اور رحمدل عزیز حکمران تھا۔ اس نے صوبہ بہار و بنگالہ و اڑیسہ میں خود مختارانہ حکومت کی۔ علماء اور مشائخ کا بھی قدر دان تھا۔ اس کی مجلسوں میں سو ڈیڑھ سو مشاہیر علما و مشائخ موجود رہتے تھے اور یہ اکثر ان کی صحبتوں میں ساری رات ذکر و عبادت میں گزار دیتا تھا"

مصنف تاریخ اڑیسہ و بہار فوقی بلگرامی لکھتا ہے:۔

"۱۱۹۷ء سے صوبہ بہار، فتوحات اسلامی کی حدود میں داخل ہوگیا اور تاریخوں کے ثبوت سے صوبہ بہار کی فتح کا سہرا بختیار خلجی (یا غلجی) کے سر باندھا گیا جو قطب الدین کی طرف سے ان ممالک کی فتح کرنے پر تعینات تھا۔ ۱۲۰۳ء میں اس نے بنگال پر چڑھائی کی اور لچھمی سین بھاگ گیا۔ بہار کی طرح بنگال بھی بلا مزاحمت اس کے قبضہ میں آگیا۔ بہرحال بختیار خلجی اول اسلامی حکمران ہے۔ جس نے صوبہ جات متحدہ و بہار پر حکومت کی ہے۔ اس نے گور کے قدیم پایہ تخت کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور یہیں سے دونوں صوبوں کا انتظام کرنے لگا۔ بنگال و بہار کو فتح کر کے اس نے کوچ بہار کے علاقہ کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا اور علی میخ نامی ایک (افغان) افسر کو وہاں اپنا نائب مقرر کیا اور اس کے تین نائبین بھی مقرر کئے یعنی اعزالدین شیروانی کو عامل باریسال اور علی مردان خان خلجی (یا غلجی) کو حاکم دیوکوٹ اور حسام الدین عوض غوری کو حاکم بہار مقرر کیا۔ اس کے آگے اس نے بوٹان، تبت اور چین وغیرہ پر چڑھائی کی مگر اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۲۰۶ء میں وہاں

سے واپس آکر بختیار خلجی گور میں مر گیا اور بہار میں اس کی لاش کو لاکر مدفون کیا۔ اس کے مرنے پر قطب الدین ایبک نے علی مردان خلجی کو ۱۲۰۸ء میں بنگال و بہار کا حاکم بناکر دہلی سے روانہ کیا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر حسام الدین عوض غوری اور دیگر امرائے خلجی اپنے تازہ حکمران کو دریائے کوسی تک استقبال کر کے لے آئے۔ چند روز دیوکوٹ میں رہ کر علی مردان خان دارالامارت گور میں داخل ہوا۔ ۱۲۱۲ء میں قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد یہ خودمختار بن بیٹھا اور اپنے ماتحتی صوبہ جات بنگال و بہار کو دہلی کی اطاعت سے نکال لیا۔ علی مردان خان کے مرنے پر ۱۲۱۶ء میں امرائے حکومت نے بہ اتفاق حسام الدین عوض غوری کو امیر بنایا۔ اس نے اپنا لقب غیاث الدین اختیار کیا اور بنگال و بہار کے علاقہ جات پر آزادانہ حکومت کرتا رہا اور لکھنوتی (ناگور ضلع بیر بھوم) کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ وہ شجاعت، دلیری اور علمی جامعیت میں کامل تھا۔ اس نے لکھنوتی میں ایک عالی شان جامع مسجد بنائی اور بہت بڑا کالج (مدرسہ) قوم کی تعلیم کے لئے کھولا۔ علماء و فضلاء اور عموماً تمام صاحب کمال لوگوں کا بڑا قدر دان تھا۔ وہ نظام ملکی میں بڑا بیدار مغز تھا۔ بڑا عادل تھا اور رعایا میں مقبول۔ تمام راستے بنائے۔ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں کوشاں رہا۔ اس کے ایام میں ہندو اور مسلمانوں کے امور میں ہمیشہ مساوات کے اصول قائم رکھے جاتے تھے۔ اس نے بنگالہ کے حدود شرقی کو علاقہ کامروپ تک بڑھایا اور صوبہ بہار کے رقبہ کو علاقہ ترہت پر قبضہ کر کے ہمالیہ کے دامن تک پہنچایا۔ ان اطراف پر قبضہ کر کے اس نے صوبہ اڑلیسہ میں بھی فوج بھیجی اور اس کے فوجی جرنل نے جگرناتھ جی کے مندر تک وہ تمام علاقہ فتح کر لیا۔ وہاں کے راجہ نے بشرط ادائے خراج اطاعت قبول کر لی۔ صوبہ اڑلیسہ میں مسلمانوں کی یہ پہلی کامیابی ہے جس کا سہرا غیاث الدین کے سر باندھا جائے گا۔ کامل دس برس تک اس نے بڑی نمود داری کے ساتھ حکومت کی۔ اس کے زمانہ میں بنگال و بہار کے تمام امور میں بڑی ترقی ہوتی رہی۔"

روہیل کھنڈ اور فرخ آباد کے مشرق میں افغانوں نے بہار، اڑلیسہ اور بنگال میں جو ریاستیں

قائم کی تھیں۔ اس کے متعلق منشی رحمان علی تواریخ ڈھاکہ میں لکھتا ہے :۔

"محمد خان افغان کرلانی بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد محمد خان کا بھائی بادشاہ ہوا اور اس کے مرنے کے بعد ۱۵۶۴ء میں سلیمان شاہ کرلانی افغان بادشاہ ہوا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا داؤد خان تخت نشین ہوا۔ بعد میں افواج اذاغنہ نے اکبر بادشاہ سے شکست کھائی داؤد خان گرفتار ہوا، اس کا سر تن سے جدا کیا گیا اور افغانوں کی حکومت بنگال سے ختم ہوئی۔"

اگرچہ داؤد خان کے قتل سے بنگال و بہار کی آزادی جاتی رہی تاہم وہ ملک ایسا مغلوب بھی نہیں ہوا کہ اکبر کی سلطنت اس میں بے کھٹکے قائم ہو جاتی جیسا کہ تاریخ ہندوستان اقبال نامہ اکبری جلد پنجم صفحہ ۲۱۴ میں درج ہے کہ :۔

"بنگال اور بہار دونوں کی حالت ایسی تھی کہ وہاں امن امان کا مستقل طور پر قائم رہنا دشوار تھا۔ اول، وہاں اسباب بغاوت کی کمی نہ تھی، دوم جنوب کا بھاری جنگلی خطہ اور شمال کے پہاڑ، جنگل اور سمندر کے آس پاس کی دلدل اور جنگل، باغی مفسدوں کے لیے ٹھکانے تھے کہ وہاں سے ان کو رفع دفع کرنا مشکل تھا۔ سوم، جب مغلوں نے ہندوستان بالا کو فتح کیا اور پٹھانوں سے سلطنت کو چھینا تو ان میں سے جن افغانوں نے مغلوں کی اطاعت اور ملازمت نہیں پسند کی۔ وہ سب کے سب ان ملکوں میں چلے آئے۔ ان کی کثرت سے یہ ملک ہندوستان کا افغانستان بن گیا۔ وہ اکبر کی سپاہ سے کئی برس تک لڑتے جھگڑتے رہے۔ وہ خاکستر کے نیچے کی چنگاریاں تھیں کہ جب ان کو ہوا لگتی تو چمکنے لگتیں مگر راجہ مان سنگھ (مغل افسر) نے ان چنگاریوں کو ایسا ٹھنڈا کیا کہ پھر وہ نہ چمکیں۔ سترہ برس میں بیسیوں لڑائیوں کے بعد صوبہ جات

بنگالہ اور اڑیسہ و بہار بالکل قبضہ شاہی میں آ گئے۔"

اور آگے صفحہ ۱۸۱ پر سلیمان شاہ افغان کے متعلق یوں درج ہے کہ :۔

"شہنشاہ اکبر نے سلیمان کرانی جس کا ذکر بہت کچھ ہو چکا ہے کہ وہ ۹۷۱ھ سے ۹۸۱ھ تک حاکم بنگالہ تھا، کا سنا تھا کہ وہ سحر کو ڈیڑھ سو مشائخ و علماء نامدار کے ساتھ تہجد کی نماز جماعت سے پڑھتا ہے اور صبح تک ان کے ساتھ بیٹھ کر تفسیر و تذکیر سنتا ہے۔ صبح کی آغاز کے بعد مہمات ملکی اور سپاہی و رعیت کی دادرسی میں مشغول ہوتا ہے اور تقسیم اوقات کر کے تضیع اوقات نہیں کرتا۔"

سلطنت اڑیسہ

یہ ملک قتلو خان افغان کے تصرف میں تھا۔ اکبر نے راجہ مان سنگھ کو اس علاقے کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ افغانوں نے مدتوں تک کئی مرتبہ اس سے جنگیں کیں، قتلو خان کرلانی کا انتقال ہوا تو پٹھانوں نے بالاتفاق اس کے بیٹے عیسیٰ خان کو بادشاہ مقرر کیا اور اس کے مطیع ہو گئے۔ مدتوں جنگیں لڑی گئیں مگر وہ بنگال میں افغانوں کی شکست اور خصوصاً داؤد خان کی قتل سے ناامید ہو گئے اور بالآخر عاجز ہو کر اکبر کے نام کا خطبہ و سکہ تسلیم کیا چنانچہ ۱۰۰۲ھ میں اڑیسہ کا پورا علاقہ ساحل سمندر تک اکبر کے بادشاہت میں شامل ہو گیا۔

تاریخ صوبہ اڑیسہ و بہار میں درج ہے کہ :۔

اڑیسہ میں قتلو خان کرلانی کی حکمرانی تھی۔ ایک دفعہ اس کو اس کی خبر لگی کہ راجہ مان سنگھ اپنی فوج کو بردوان کے راستہ سے کلکتہ کے قریب لایا اور فوج نے پڑاؤ ڈال دیئے اور چاروں طرف خندق کھدوائی ہے تو اس نے پٹھانوں کی ایک دستہ فوج کو راجہ کے کیمپ پر حملہ کرنے کی نیت سے بھیج دیا۔ راجہ نے اپنے بیٹے جگت سنگھ کو ان کی مدافعت کے لئے بھیج دیا۔ پٹھانوں نے دغا کر کے جگت سنگھ کو قید کر لیا اور اس کے تمام لشکر کو مار ڈالا۔ خیریت

ہوگئی کہ اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد قتلو خان خود اپنی موت مرگیا۔ وہ نہ مرتا تو خدا جانے کیا کیا کرتا۔ قتلو خان کے لڑکے کمسن تھے۔ اس کا وزیر خواجہ عیسیٰ بڑا عاقل اور دوراندیش تھا۔ اس نے کمال عاقبت بینی اور مصلحت اندیشی کو مدنظر رکھ کر راجہ کے مقید بیٹے جگت سنگھ کے ہمراہ قتلو خان کے بیٹوں کو بسنت پور میں راجہ مان سنگھ کے پاس حاضر کردیا۔ راجہ نے بیٹے کی مخلصی کو غنیمت سمجھا۔ اس نے قتلو خان کے بیٹوں کو پوری تعظیم اور اخلاص سے مہمان کیا۔ اور ان کے اس مطالبہ کو کہ اڑلیسہ کی امارت ان کے نام بدستور قائم اور تسلیم ہو، منظور کیا۔

دو برس کے بعد خواجہ عیسیٰ مرگیا تو پٹھانوں نے بدعہدی کر کے مان سنگھ کے خالصہ پر قبضہ مخالفانہ کر لیا۔ مان سنگھ کو اس کی خبر لگی تو اس نے اڑلیسہ کا صلح نامہ توڑ دیا۔ اور بہار کی تمام فوج جمع کر کے جہار کھنڈ کے راستہ پر روانہ کیا۔ دریائے سبرنیکا پر جانبین سے مقابلہ ہوا۔ پٹھانوں کو شکست ہوئی۔ پٹھانوں نے کٹک کے راجہ رام چندر نامی کے پاس پناہ لی۔ یہ راجہ ابتدا سے لے کر اس وقت تک برابر خودسر تھا۔ مان سنگھ نے اس کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کے کاموں میں کوئی ایسی کامیابی نہیں دیکھی لیکن آخر کار پٹھانوں نے خود بھی اور راجہ کو بھی اکبر بادشاہ کا مطیع بنایا۔ راجہ مان سنگھ بہار میں واپس آیا۔ راجہ کٹک نے پٹھانوں کے شرارت سے پھر شورش اٹھائی۔ مان سنگھ کو چار و ناچار پھر جانا ہوا۔ جب مان سنگھ فوج لے کر پہنچ گیا تو پٹھانوں نے حاضر ہو کر اپنی اپنی جاگیروں پر واپس چلے جانے کی اجازت مانگی۔ مان سنگھ نے منظور کرلی۔ کٹک کے راجہ رام چند نے بھی معافی مانگی۔ غرض یہ کہ اڑلیسہ کے معاملات بگڑنے کو تھے مگر راجہ مان سنگھ کی بیداری اور ہوشیاری سے بہت جلد سنبھل گئے۔ اس سال اکبر کا بیٹا شہزادہ خسرو پیدا ہوا جو مان سنگھ کا بھانجا تھا، اس تقریب کی مبارکباد کے لئے آستانہ سلطانی پر حاضر ہوا۔ بادشاہ نے غایت محبت سے اڑلیسہ کی نام نہاد حکومت بطور اعزاز شہزادے کو تفویض فرمائی اور مان سنگھ کو جو شہزادے کا ماموں تھا، شہزادے کا نائب مقرر کر کے اعزاز واکرام کے ساتھ بہار کی طرف رخصت کیا۔ ۱۵۹۹ء میں پھر پٹھانوں نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ مان سنگھ

پٹھانوں کے سر پر پہنچ گیا۔ عثمان خان پسر قتلو خان سے مقابلہ ہوا۔ پٹھانوں کو پھر شکست ہوئی لیکن مان سنگھ بھی بجائے آگے بڑھنے کے واپس بہار چلا آیا۔ ۱۶۰۴ء کے آخر میں مان سنگھ مستعفی ہو کر آگرہ چلے گئے۔ بادشاہ کی خوفناک علالت جو یقیناً اس کا مرض الموت تھا مان سنگھ شہزادہ سلیم جہانگیر کے خلاف اپنے بھانجے شہزادہ خسرو کی تخت نشینی کی کوششوں کے لئے چلا گیا تھا مگر اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اکبر نے ۱۶۰۷ء میں انتقال کیا۔"

گجرات

مولوی ذکاءاللہ تاریخ ہندوستان جلد ۵ اقبال نامہ اکبری میں افغان ریاستہائے سورت جوناگڑھ، پالن پور کاٹھیاواڑ کے متعلق اکبر کے حملوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"شہنشاہ اکبر نے گجرات فتح کیا تو ایک لشکر بسرکردگی مرزا خاں کے امیر خان غوری پر حملہ آوری کے لئے بھیجا کہ ملک سورت کو اس سے چھین لے مگر اس کی بے تدبیری اور بزدلی سے کوئی کام نہ ہوا۔ آسان بات دشوار ہو گئی اور وہ ناکام پھرا۔ جب سپاہ آرا میں کارشناسائی اور مردانگی سکالش نہیں ہوتی اس کے ماتحت جوان مردوں سے بھی کام نہیں ہوتا۔ اس شکست کے سبب ۹۹۱ھ میں گجرات میں شورش اور بغاوت برپا ہوئی۔ اس عرصہ میں سب مخالف جمع ہو کر آمادہ پیکار ہوئے اور صف آرائی کا انتظام کیا۔ مصطفیٰ شروانی اور دیگر بہت سے افغان امراء اپنی اپنی سپاہ کو ہمراہ لے کر شاہی لشکر سے الگ ہو کر مخالف سے جا ملے۔ قریب پانچسو آدمیوں کے ساتھ وہ چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ لڑائی ہو' عثمان پور کے پیچھے سے غنیم آ کر لشکر شاہی پر چڑھ آئے۔ اس لشکر میں سے نو بہت سے غنیم سے جا ملے۔ پیادوں کے علاوہ سات ہزار سواروں سے کچھ زیادہ شاہی لشکر تھا۔ اب اس میں سوائے چند آدمیوں کے

کوئی نہ رہی۔ دشمن مال واسباب سے لدے تھے اس لئے انہوں نے تعاقب نہیں کیا۔ جام (جس کا دارلسلطنت جام نگر تھا) ان سرکشوں کا سرگروہ تھا۔ اس نے سرکشوں کے جمع کرنے میں خوب اہتمام کیا اور مدتوں کے جمع کئے ہوئے خزانے باہر نکالے اور سلطان مظفر کو سپاہ آراستہ بنایا۔ دوست خاں پسر امین خان غوری مرزبان (حکمران) سورت وجونا گڑھ کو اور افغانان پالن پور و کٹپرد پنج کو اور کھنکار کچھ کو مدد کے لئے بلا لیا۔ سلطان مظفر نے افغانوں کی امداد اور اعانت سے جن کی قیادت جام کر رہے تھے، سولہ سال تک کامیاب حکومت کی اور لڑائیاں بھی ہوتی رہیں آخر وہ مغل فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو کر خودکشی کر گیا اور گجرات پر شاہی قبضہ ہو گیا"۔ آگے لکھتا ہے ار

سیوی، شال (کوئٹہ) اور بلوچ

عہد اکبری میں بھی سندھ کے مغربی اور بلوچستان کے شمالی حصوں پر افغان حکومتیں قائم تھیں اور سیوی (سبی) اور شال ان کا مرکزی مقام رہا تھا جیسا کہ اقبال نامہ اکبری میں ص ۴۷۰ پر درج ہے :۔

ا۔ پنی خاندان :۔ قندھار کے قریب ایک استوار قلعہ سیوی ہے ۔ پہلے زمانے میں وہ مرزبان بھکر (بادشاہ دہلی) کے پاس تھا۔ بہت دنوں سے پنی افغان اس پر غالب تھے۔ بادشاہ کی طرف سے سید بہاؤالدین بخاری تیول دار اچھ۔ بختیار بیگ، میر ابوالقاسم، میر معصوم اور سپاہ ملتان کو قلعہ سیوی جو پنی افغانوں کا دارالسلطنت تھا فتح کرنے کی ہدایت ہوئی کہ پنی افغانوں

کی مالش کریں[1]۔ چنانچہ ۱۰۰۲ھ میں شاہی لشکر اس ارادہ سے یہاں آیا۔ کنجابہ کے زمینداروں اور اس طرف کے اور سرداروں نے جیسے کہ داؤد خان و دریا خان تھے اطاعت کی۔ جب لشکر قلعہ سیوی کے نزدیک پہنچا تو پانچ ہزار آدمی لڑنے کو آئے۔ کچھ لڑ کر حصاری ہوتے جب محاصرہ حصار ہوا تو انہوں نے قلعہ کی کنجیاں حوالہ کیں۔ اس فتح سے ملتان اور بہت سے پرگنے بے خطرہ ہو گئے۔"

۱ - **کاکڑ خاندان** :- یہاں سے مغرب میں اولس کاکڑ جس کا سربراہ الوس کاکڑ تھا۔ مدتوں سے زیردستوں کو ستاتے تھے اور قندھار کی راہ پر لوٹ مار مچاتے اپنی بدگوہری اور اپنے مقامات کی استواری کے سبب سے قزاقی کرتے تھے۔ شاہ بیگ ۱۰۰۴ھ میں ان کو سزا دینے آیا اس سے خوب لڑائیاں ہوئیں۔ بہت دشواری سے شاہی لشکر کو فتح ہوئی۔ ان کے بڑے بڑے سنگر توڑے سرکشوں کے سر کاٹے، بہت سے ان میں سے مارے گئے۔ کچھ آوارہ اور کچھ فرمان پذیر ہوئے۔ اس فتح سے قندھار، کیچ اور مکران قلمرو میں آ گئے۔" آگے لکھتا ہے۔

۳ - **قوم بلوچ** :- ۱۰۰۴ھ میں بلوچستان کی تنبیہہ کی بھی ہدایت لشکر کو ہوئی تھی۔ بلوچوں کا یہ حال تھا کہ وہ افغانوں کے معاون تھے اور بادشاہ کی نیکو خدمتی سے باز رہ کر نافرمانی اس لئے کرتے تھے کہ وہ بادشاہ کو اپنے سے دور جانتے تھے اور اپنے مقامات کو نہایت مستحکم سمجھتے تھے۔ اس لئے بادشاہ نے امرا کے پاس فرمان بھیجا تھا کہ بلوچوں کے مقامات میں جائیں اور ان کو سخت سزا دیں۔

---

[1] اس وقت سیوی کا حکمران اسحاق پنی تھا اس کا صرف ایک بیٹا بارو خان تھا اور اس کے چار بیٹے جنید خان، صادق خان، خلیل خان اور محبت خان تھے جن سے بارو زئی قبیلہ بنا جو زمانہ قدیم سے افغانوں کا بڑا گھرانہ ہے۔ سانگھان میں باروزئی کی سرداری ہے۔ لانگا (یا لانگو) اور بارو زئی امی افغان گھرانے ہیں جنکی سلطنت ملتان، سیوی، سندھ اور مکران تک رہی ہے۔

جب بلوچوں نے بادشاہی لشکر کی تیاری کا آوازہ سنا جو مغرور بیٹھے تھے وہ بندگی اختیار کرنے کو تیار ہو گئے اور انہوں نے ایک وفد کو بادشاہ کی خدمت میں بھیج کر زینہار کے خواستگار ہوئے۔ بادشاہ نے ان کی خواست گاری قبول کی اور فرمان بھیج دیا کہ لشکر واپس چلا آئے۔"

۴۔ کشمیر:۔ اکبر نے ۹۹۴ھ میں فوج کشمیر بھیج کر وہاں کے حکمران یوسف خان سے صلح کر لی۔ یوسف خان دربار شاہی میں ملاقات کی غرض سے آیا۔ اکبر نے اسے قید کر لیا۔ یوسف خان کا لڑکا یعقوب کسی طرح بھاگ کر کشمیر چلا گیا اور حکمرانی ہاتھ میں لے لی۔ مغلوں سے سخت جنگیں لڑنے کے بعد گرفتاری کے ڈر سے ہتھیار ڈال دیئے اور مغل افسر کے ہمراہ خدمت شاہی میں آیا۔ بادشاہ نے اسے بہار میں جہاں اس کا باپ قید تھا بھیج دیا۔ قید ہی میں دونوں کا انتقال ہو گیا" اور شاہ میر بن شاہ دین سواتی افغان کی ۷۴۴ھ میں بنا کردہ بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔"

شہنشاہ اکبر کے مذہبی خیالات

خلاصہ از تاریخ ہندوستان جلد ۵ اقبال نامہ اکبری ص ۸۰۷ میں شہنشاہ اکبر کے مذہبی خیالات کے متعلق مولوی ذکاءاللہ ملا عبدالقادر بدایونی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ :۔

اکبر نے ایک نیا دین بنایا جس کا نام دین الٰہی رکھا گیا اور قرار پایا کہ اعلانیہ لوگ اس کلمہ کو پڑھیں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اکبرُ خَلِیفَۃُ اللّٰہِ۔ مگر اس نے دیکھا کہ اس میں بڑا خلل پیدا ہو گا تو اس نے اپنی حرم میں چند آدمیوں کے پڑھنے سے اکتفا کیا۔ پہلے دربار میں جو پانچ وقت اذان اور جماعت کے ساتھ نماز ہوتی تھی موقوف ہوئی۔ نام احمد و محمد جو باہر کے ہندوؤں اور گھر کے اندر ہندو بیویوں کی خاطر سے بادشاہ کو گراں معلوم ہوئے تو اپنے مقربوں میں سے جو اس قسم کے ناموں سے موسوم تھے موقوف کر دیئے۔ بادشاہ آفتاب کے ایک ہزار ایک نام کی

تسبیح پڑھ کر پردہ سے باہر آتا۔ اور پھر یہ ساری جماعت اس کو سجدہ کرتی۔ وہ کہتے تھے کہ آفتاب نیّر اعظم ہے اور تمام عالم کا عطیہ بخش اور بادشاہوں کا مربی ہے اور وہی بادشاہوں کی قدرت کا اصل ہے۔ بادشاہ شباب سے ہی یوں کیا کرتا تھا۔ یوں بھی ایک قسم آتش پرستی ہے یہ کام اس سبب سے ہوتا تھا کہ اس کو ہندو بیویوں سے محبت بہت تھی۔ پچیسویں سال جلوس کے نوروز میں بادشاہ نے آفتاب اور آگ کو سجدہ اعلانیہ کیا۔ سورج کی پوجا کے بعد بادشاہ قشقہ لگا کے دولت خانہ میں آتا۔ اسلام کے تمام احکام کو نامعقول اور حادث جانتا اور فقہائے عرب کو بہت مفسد اور قطاع الطریق سمجھتا۔ یہ امر قرار پایا کہ گائے، بھینس اور اونٹ کا گوشت حرام سمجھا جائے۔ قرار پایا کہ بارہ برس سے پہلے کسی لڑکے کا ختنہ نہ ہو۔ اس کے بعد لڑکے کو اختیار دیا جائے چاہے وہ کرے یا نہ کرے۔ بادشاہ مجلس میں ہندوؤں کی بدعتوں اور رسموں کو اپنے طور پر کرتا تھا اور ہندو جن چیزوں سے طبعی نفرت رکھتے تھے، بادشاہ اُن سے پرہیز کرتا تھا (وغیرہ وغیرہ)

اس کا سبب یہ ہوا کہ ماہ رجب ۹۸۷ھ میں ایک محضر نظر آیا جس پر دستخط ان عالموں کے ہوئے تھے۔ مخدوم الملک شیخ عبدالنبی کہ صدر الصدور تھا۔ قاضی جلال الدین ملتانی کہ قاضی القضات تھا۔ صدر جہاں مفتی کل۔ شیخ مبارک کہ علماء زمان میں اعلم تھا۔ غازی خاں بدخشی کہ علم معقول میں بے نظیر تھا۔ اس محضر میں بادشاہ عادل کو مطلقاً مجتہد پر تفضیل دی گئی تھی اور اس کی ترجیح کی تجویز کو مسئلہ مختلف فیہ ضعیف روایتوں سے درست کیا تھا تاکہ کسی کو مجال نہ رہے کہ بادشاہ کے احکام سے انکار کرے خواہ شرعی ہو یا ملکی اور وہ خود اپنے تئیں فیصلہ صادر کرے جب بادشاہ کو یہ فتویٰ ہاتھ لگا تو اجتہاد کی راہ اس کے لئے کھل گئی کوئی اس کا معارض نہیں رہا اور حلال و حرام ہونا موقوف ہوا اور حکم شرع پر بادشاہ کی عقل کو ترجیح ہوگئی۔ اسلام صرف تقلید کا نام ہوگیا۔ لیکن بعض علماء نے بادشاہ سے خروج کرنے اور اس سے بغاوت کرنے کا فتویٰ دیا اور فساد شروع ہوا۔ بادشاہ نے اکثر کو قتل کیا اور بعض کو قید کیا اور علماء لاہوری کو

جلا وطن کیا۔ اس کے بعد ۹۸۸ھ میں بادشاہ کے پاس علماؑ و مشائخ و صوفی بہت سے ایسے خوشامدی اور لالچی بھی آئے کہ ان کی حرکات و اقوال دیکھ کر بادشاہ ان بزرگوں سے جنہوں نے پہلے فتویٰ دیا تھا بدگمان ہو گیا۔ اسی سال ان خوشامدی اور لالچی علماء نے دلائلِ باطن کو اتنا بلند کیا کہ بادشاہ کو نبوت کا خیال پیدا ہوا اور پھر اس سے آگے بڑھ کر خدا ہونے تک نوبت پہنچی۔ اکبر نے ۱۰۱۴ھ میں وفات پائی اور اکبر کے مرتے ہی دینِ الٰہی بھی مر گیا"۔ (اقبال نامہ اکبری جلد ۵)

شہنشاہ اکبر کا ایک اور کلمہ یہ بھی تھا :۔

سرِ شاہان عالم شاہ اکبر   تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر

بقول شاعر :۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را



کله به سود کله به زیان دی
که جانان دواړه قبلوي ورسره ځمه
ګوره چه وار مو خطا نهٔ شي
خلق نیستي له اړمونه ورکوي:

پٹھانوں کے عروج و زوال پر ایک نظر

پٹھانوں کی تاریخ میں قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے لے کر پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی کی شکست یا مغلوں کی حکومت کے قیام تک کے دور کو بہت اہمیت حاصل ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں پٹھانوں کے دور حکومت پر آخری سرسری نظر ڈال لی جائے۔

شہاب الدین محمد غوری کے بعد قطب الدین سے لے کر ابراہیم لودی تک افغانوں کے چوبیس ۲۴ بادشاہ یکے بعد دیگرے دہلی کے تخت پر بیٹھے جن کی مدت حکومت قریب ۳۵۰ سال ہے۔ ان بادشاہان میں آخری بادشاہ ابراہیم لودی ہے۔ گھریلو سازشوں اور افغانوں کے بے اتفاقی اور خود غرضیوں کے باعث اور خود انہی لوگوں کی سازش اور بلاوے سے بابر ہندوستان آکر حملہ آور ہوا۔ پانی پت میں سخت معرکہ پیش آیا۔ بابر کے لشکر میں افغان بھی شامل تھے۔ آپس کے اس اختلاف کا نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ سخت مقابلہ کے بعد ابراہیم لودی نے ۷ رجب ۹۳۲ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء کو جمعہ کے روز صبح کے وقت پانی پت کے میدان میں جام شہادت نوش کیا اور افغانوں کی حکومت کا آفتاب غروب ہوگیا۔ اگرچہ اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد

افغانوں کو ہوش آگیا اور اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوئے اور اس کے تدارک کی یہ صورت نکالی کہ آپس میں اتفاق کر کے شیر شاہ کو بادشاہ منتخب کیا۔ جس نے ایک مرتبہ تو بابر کے بیٹے ہمایوں سے حکومت چھین لی اور پٹھانوں کی بادشاہت کو دوبارہ قائم کر دیا۔ لیکن پٹھانوں کے اقتدار کو جو اخلاقی گھن لگ چکا تھا۔ اس نے حکومت کے تناور درخت کی جڑیں اندر سے کھوکھلی کر دی تھیں اس لئے اب نہ تو وہ سرسبز و شاداب ہی رہ سکتا تھا۔ نہ زیادہ دیر تک کھڑا ہی رہ سکتا تھا۔ چنانچہ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ شیر شاہ اور اس کے بیٹے سلیم شاہ کے انتقال کے بعد اس کے جانشین کے عہد حکومت میں آپس کے اختلافات اور دشمنیوں نے پھر وہی صورتحال پیدا کر دی، جو ابراہیم لودی کی شکست کا باعث ہوئی تھی اور اس طرح افغان حکومت کا ہندوستان کی سرزمین پر ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

پٹھان حکومت کے زوال کے اسباب

کتاب "تاریخ آریا ورت ہندوستان" میں اس کا مولف "پٹھان حکومت کے زوال کے اسباب" کے عنوان سے لکھتا ہے:۔

"۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے "پٹھان حکومت" کی بنیاد شمالی ہندوستان میں ڈالی اور ۱۵۲۶ء میں بابر نے پانی پت کے مقام پر ابراہیم لودی کو شکست دے کر اس سلطنت کا خاتمہ کیا۔ اس طرح تقریباً تین سو بیس سال تک شمالی ہندوستان سلاطین دہلی کے ماتحت رہا۔

آگے لکھتا ہے

یہ افغان بادشاہ سبھی مطلق العنان تھے اور اُن کی فوج بڑی

منہ زور تھی اس لئے جب طاقتور بادشاہ اس فوج کی مدد سے
فتوحات حاصل کرتے تو سلطنت کی حدود دُور دُور تک پھیل جاتیں
لیکن کمزور بادشاہوں کے زمانہ میں جگہ بہ جگہ فوجی سردار اُٹھ کھڑے
ہوتے اور سلطنت رفتہ رفتہ دہلی کی چار دیواری تک محدود ہو کر
رہ جاتی۔" آگے لکھتا ہے۔

طرزِ حکومت اور ملک کی معاشی حالت:۔

شاہانِ دہلی مطلق العنان بادشاہ تھے۔ اُن کی سلطنت کے قیام کا دارومدار زیادہ تر فوجی طاقت پر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی سلطنت کو ہر چار جانب سے زبردست ہندو راجپوت ریاستیں محصور کئے ہوئے تھیں جو اسلامی حکومت کا تختہ اُلٹنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ ماتحت علاقوں میں مسلمان فوجی سردار گورنر مقرر کئے جاتے تھے۔ ان کے اختیارات بڑے وسیع ہوتے تھے۔ جنگ کے موقع پر بادشاہ کی فوج اور اور روپیہ سے مدد کرنا ان کا فرض ہوتا تھا لیکن یہ صوبے دار ہمیشہ موقع کی تاک میں رہتے تھے اور دہلی کی سلطنت کمزور ہوتے ہی اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیتے تھے۔ بادشاہ امور سلطنت میں عموماً علماء سے صلاح ومشورہ کرتے تھے مگر علاؤ الدین اور محمد تغلق نے ان کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

مقدمات فیصل کرنے کے لئے قاضی اور مفتی مقرر تھے۔ فیصلے اسلامی شرع کے مطابق کئے جاتے تھے۔ فوجداری قوانین بڑے سخت تھے۔ معمولی جرائم کے لئے بھی سنگین اور وحشیانہ سزائیں مقرر تھیں۔ مگر فیروز تغلق کے عہد میں یہ تمام وحشیانہ سزائیں موقوف کر دی گئیں۔ غیر مسلم اقوام سے فوجی خدمات کے عوض جزیہ (ٹیکس) وصول کیا جاتا تھا۔ قصبوں اور گاؤں میں پرانا نظام

حکومت جوں کا توں قائم تھا۔ لوگوں کے باہمی جھگڑے فیصل کرنے کے لئے پنچائتیں مقرر تھیں۔ حکومت کی آمدنی کا دارومدار زیادہ تر لگان پر ہوتا تھا۔ زمینداروں سے پیداوار کا چوتھا یا چھٹا حصہ لگان کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔ محمد تغلق کے عہد میں مصنوعی آبپاشی کو بھی بہت ترقی ہوئی فیروز شاہ نے رفاہِ عام کے کاموں میں بڑی دلچسپی لی۔ مسلمانوں کو شاہان دہلی کے عہد حکومت میں خاص عزت و توقیر حاصل تھی۔ ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ ہندوؤں کو مذہب اسلام قبول کرنے کے لئے ہر طرح کی ترغیب دی جاتی تھی۔ جب کوئی ہندو مذہب اسلام قبول و اختیار کرنے پر رضامندی ظاہر کرتا تو اُسے مقامی حاکم یا بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا جو اُسے خلعتِ فاخرہ اور سونے کے کڑے عطا کرتا تھا۔ ستی کی رسم اگرچہ رائج تھی لیکن ہر ایسی عورت کو شاہی اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ عورتوں کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا۔ شاہان دہلی کے زمانے میں اشیائے خوردنی سستی تھیں۔ لوگ عام طور پر خوشحال اور فارغ البال تھے۔ زراعت اور تجارت کو بھی بڑا فروغ حاصل تھا۔" (ص ۲۶۱ تا ص ۲۷۸)

واضح رہے کہ تین سو بیس سال سے مصنف کا اشارہ پٹھان حکومت کے صرف ایک خاص دور کی طرف ہے۔ پٹھان حکومت کا دورِ حکومت اس سے بہت زیادہ ہے ۵۷۵ھ میں محمد غوری نے پشاور اور اس کے علاقہ پر قبضہ کیا تھا۔ ۵۷۹ھ میں علاقہ دیبل سے لے کر پنجاب میں ملتان اور جہلم تک کا علاقہ اس کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد ۵۸۲ھ میں سیالکوٹ سے سرہند تک راجہ جے پال کے باقی علاقے پر بھی اس نے قبضہ کیا۔ ۵۸۸ھ میں دہلی بھی اس کے تصرف میں آگئی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ برصغیر میں پٹھان حکومت کی بنیاد ۵۷۵ھ میں پڑ چکی تھی اور

سنہ ۱۰۰۰ھ تک تو دہلی کے علاوہ برصغیر کے متعدد علاقوں میں پٹھان حکومتیں موجود تھیں ۔ حتیٰ کہ سنہ ۱۰۱۴ھ میں اکبر کا انتقال ہوا تو بہار و اڑیسہ میں وہ کوشش کے بعد بھی پٹھان حکومتوں کو ختم نہ کر سکا تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں پٹھانوں کی حکومت ۹۳۴ برس رہی ۔ جیسا کہ اس کتاب میں " عہد اکبری پر ایک نظر " کے زیر عنوان کسی قدر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عہد حکومت میں دہلی کے علاوہ برصغیر کے طول و عرض میں متعدد پٹھان حکومتیں موجود تھیں ۔ اور اگر دہلی پر محمد غوری کے قبضے سے عہد حکومت کا شمار کیا جائے جو کہ پٹھان حکومت کے قیام کا روزِ اوّل تھا تو ۳۲ سال (قطب الدین ایبک سے قبل) کی مدت کا اضافہ اور ہو جاتا ہے اور مدت ۳۲۰ سال کے بجائے ۳۵۲ سال ہو جاتی ہے ۔

اسباب زوال اور ایک عبرت انگیز مثال :۔

بنو امیہ کے ایک بزرگ نے زوال کے اسباب کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے ۔ مسعودی نے ان بزرگ کا یہ واقعہ لکھا ہے :۔

" جب حکومت بنو امیہ سے نکل کر بنی عباس کے پاس آ گئی اُس وقت بنی اُمیّہ کے ایک سن رسیدہ بزرگ سے جو اپنے خاندان کی سیاست اور وجوہِ زوال سے بخوبی واقف تھے کسی نے بنی اُمیہ کے زوال کے اسباب پوچھے ' انہوں نے کہا :

" ہم عیش و عشرت میں ایسے منہمک ہو گئے کہ اپنے فرائض حکومت کو بالکل بھول بیٹھے ، ہم نے اپنی رعایا پر ظلم شروع کیا جب وہ ہمارے انصاف سے مایوس ہوئے تو انہوں نے ہم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا ۔ کاشتکاروں پر ہم نے لگان بہت زیادہ کر دیا جس

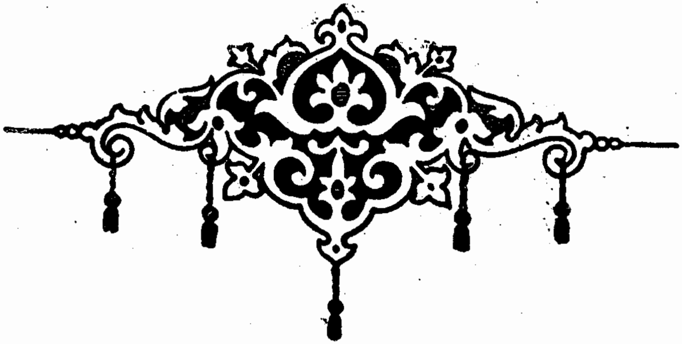
کی وجہ سے وہ زمینوں کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے اور اس طرح ہماری زمینیں ویران ہو گئیں اور خزانے خالی رہ گئے۔ ہم نے اپنے وزراء پر بھروسہ کیا، انہوں نے اپنے فوائد کو ہمارے منافع پر مقدم رکھا اور ہمارے حکم کے حاصل کئے بغیر جو چاہا حکم جاری کر دیا اور ہمیں اس سے بے خبر رکھا۔ انہوں نے فوجوں کی تنخواہیں دیر میں دینا شروع کیں اور اس وجہ سے وہ ہمارے وفادار نہ رہے، اور جب ہمارے دشمنوں نے انہیں اپنے ساتھ ہونے کی دعوت دی انہوں نے خوشی سے اُسے قبول کیا اور ہمارے مقابلہ میں اُن کی مدد کی ہم اپنے دشمنوں کے مقابلہ پر بڑھے مگر اپنے انصار کی کمی کی وجہ سے اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ ہمارے زوال کی سب سے بڑی وجہ مُلک و رعایا کے حالات سے ہماری بے خبری ہوئی ..... اور اُس وصیّت کو بھی نظر انداز کر دیا گیا جو حارث بن کعب نے اپنے بیٹوں کو کی تھی وہ یہ کہ:- اے میرے بیٹو! متحد رہنا متفرق نہ ہونا، کیونکہ تفریق وہ بلا ہے جو ہلاکت سے پہلے ہلاک کر دیتی ہے، قوت و عزّت کی حالت میں مرنا ذلت و کمزوری کی زندگی سے بہتر ہے۔" (تاریخ مروج الذہب)

پٹھانوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے اور ان کے عروج و اقتدار کے بعد اُن کے زوال کے اسباب کی جستجو کرنے کے بعد ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ تمام خرابیاں اور بُرائیاں اُن میں پیدا ہو گئی تھیں اور یہی چیزیں ان کی تباہی کا سبب بنیں۔ یہ ایک عالمگیر سچائی ہے یہ اللہ کا ٹھیرایا ہوا قانونِ قدرت ہے۔ جس طرح ماضی میں یہ قانون نافذ رہا ہے مستقبل میں بھی یہی قانون چلے گا۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیلًا۔

اہل نظر اور اصحاب بصیرت کے لئے اس میں عبرت اور موعظت کا بڑا سامان ہے ۔ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَعِبرۃ لِاُولِی الْاَبْصَار ۔ افغان قوم کو چاہئے کہ وہ اس نصیحت سے سبق حاصل کرے اور اپنے اندر سے وہ تمام انفرادی اور اجتماعی برائیوں کو نکال دے اور اخلاقی کمزوریوں سے اپنے آپ کو پاک کرے ۔ اگر اس نے اپنے اندر یہ بنیادی تبدیلی پیدا کر لی تو وہ اس دنیا کو بھی اپنے لئے بالکل بدلا ہوا پائے گی اور قومی عروج و اقتدار کے وہ اسی مقام پر پھر پہنچ جائے گی ۔ جس پر کبھی اس کے اسلاف فائز تھے ۔

روشن خان

یکم جنوری ۱۹۸۰ء



وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ط (سورہ فرقان)

چند خصائص قومی اور عصبیّت

حقیقت یہ ہے کہ عصبیت کا مقصدِ اصلی مدافعت و تغلب نسب ہی سے تکمیل پاتا ہے۔

رہائش اور بسنے میں خاندانی و قبائلی عصبیّت (نصب داری) وحمایت جس قدر ضروری ہے، اسی قدر دوسرے امور میں بھی اس کی ضرورت واہمیت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً کسی سلطنت کی بنیاد ڈالنی اور اس کا وقار قائم کرنا، یا کسی دعوتِ حق کی تبلیغ کرنا اور اس کے احکام چلانا اور شائع کرنا۔ ان سب امور کا بروئے عمل آنا بغیر جنگ و قتال کے ممکن نہیں۔ جب طبیعت انسانی میں خودسری وخودرائی ابتدائے فطرت سے موجود ہے تو انسان کو بغیر طاقت وزور کے کس طرح کوئی بات حق منوائی جاسکتی ہے جنگ وقتال زور وطاقت کے استعمال میں عصبیت وحمیت ہی کی کارفرمائی ہے۔ بغیر عصبیت وحمیت کے جذبہ کے کوئی کیوں اپنا خون بہائے اور آمادۂ جنگ وپیکار ہو۔ اور عصبیت، نسبی اتحاد اور دیگر قریبی تعلقات اور دینی ومذہبی یگانگت سے پیدا ہوتی ہے اور عصبیت والی قوم پر غیر قوم کا آدمی حکمرانی نہیں کرسکتا۔ اور ان سے سلطنت نہیں نکلتی اگر ایک خاندان سے نکل جاتی ہے تو دوسرے میں پہنچ جاتی ہے۔

یہ بات ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ریاست غلبہ سے حاصل ہوتی ہے اور غلبہ عصبیت سے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوم پر اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ماتحت عصبیتوں سے فرمانروا کی عصبیت زیادہ اور قوی ہو۔ کیونکہ جب امیر کی عصبیت سب کو طاقتور نظر آئے گی تو سب کی گردنیں لازمی طور سے اس کے سامنے جھکیں گی اور ان کو

اطاعت اس کے سامنے خم ہو گا۔

عصبیت کا اصل تقاضا، مدافعت و تغلب یعنی اپنوں کو غیروں سے بچانا اور دوسروں پر غلبہ واقتدار حاصل کرنا، نسب ہی سے تکمیل پاتا ہے۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ:۔

"چوتھی علامت نبوت کی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام حسب و نسب میں اپنی قوم میں ممتاز ہوں۔ چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نبی کو اسی قوم میں پیدا کرتا ہے جو اس کی حمایت و اعانت کر سکے۔ چنانچہ ہرقل اپنے سوالات میں ابوسفیان سے یہ بھی پوچھتا ہے کہ تمہارا نبی نسب کے لحاظ سے کیسا ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ وہ ہم میں اچھے نسب سے ہے اس پر ہرقل نے کہا کہ بے شک انبیاء علیہم السلام اپنی قوم میں اچھے نسب سے ہوتے ہیں۔ اس میں جناب باری تعالیٰ کی یہ حکمت و مصلحت ہے کہ قومی شوکت و عصبیت انبیاء علیہم السلام کی مددگار ہو۔ اور ایذائے کفار سے ان کو بچا سکے تاکہ رسالت کی ذمہ داری بھی ادا ہو اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا مقصد بھی پورا ہو کہ دین و ملت دنیا میں پھلے پھولے۔"

کتاب الأغانی کے مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

"ایک مرتبہ کسریٰ (شاہ ایران) نے نعمان (صحابی) سے دریافت کیا کہ عرب کے قبیلوں میں ایک کو دوسرے پر شرف و فضیلت حاصل ہے یا نہیں۔

نعمان نے کہا، ہاں۔ کسریٰ نے کہا کس چیز سے، نعمان نے جواب دیا
کہ جس کی تین پشتوں میں ریاست (امارت) برابر رہی ہو اور پھر
چوتھی پشت میں بھی ریاست باقی ہو تو ایسا گھرانہ قبیلہ کی ناک ہوتا ہے۔

آنحضرتؐ کا فرمان ہے :۔

"تَعَلَّمُوا مِنْ اَنْسَابِکُمْ مَا تَصِلُوْنَ بِہٖ اَرْحَامَکُمْ"

یعنی نسب کا فائدہ یہی رشتہ داری کا بندھن تو ہے جو انسان کو صلہ رحمی پر مجبور کرتا ہے
اور جانبین سے جانثاری اور قربانی ظہور ہونے لگتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے : تَعَلَّمُوا النَّسَبَ وَلَا تَکُوْنُوْا کَنَبَطِ السَّوَادِ اِذَا سُئِلَ اَحَدُھُمْ عَنْ اَصْلِہٖ
قَالَ مِنْ قَرْیَۃِ کَذَا (تاریخ ابن خلدون وارض القرآن جلد دوم صفحہ ۱۵) ترجمہ: نسب نامہ سیکھو، عراق
کے نبطیوں کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب اُن میں سے کسی سے پوچھا جائے کہ تم کس خاندان سے ہو تو جواب دیتے
ہیں کہ فلاں شہر کے ہیں"

یعنی سرسبز مقامات میں رہنے والے عربوں کو کیا ہوا کہ شہریوں سے مل جل کر ان کے
نسب گڑبڑ ہو گئے اور نسبی تمیز اُٹھ گئی۔

معلوم ہے کہ غلبہ و اقتدار، مدافعت و مقاومت (یعنی اپنوں کو غیروں سے بچانا
اور دوسروں پر غلبہ و اقتدار حاصل کرنا) عصبیت ہی کے راستہ سے معرض وجود میں
آتے ہیں کیونکہ عصبیت ہی کے یہ کارسازی ہے کہ وہ قوم میں غیرت و حمیّت کی
رگ حرکت میں لاتی ہے۔ ایک دوسرے پر مٹنا سکھاتی ہے۔ اور غلبہ کا پورا دار و مدار
عصبیت پر ہے۔ عصبیت کی یہ کرشمہ سازی عام مخلوق کی نظر سے اوجھل ہے۔ انہوں

نے وہ تمام حالات یکسر بھلا دیئے، جن کے تحت سلطنت و حکومت کی بنیاد پڑی تھی۔

بعض لوگوں کا خیال اس بارے میں بالکل ہی جدا ہے اور وہ اس کو بُرا کہتے ہیں لیکن اس کے اچھے اور بُرے دو رُخ ہیں۔

بُرے رُخ کی شریعت نے مذمّت کی ہے اور اچھے رخ کی مدح سرائی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً شریعت نے شہوت و غضب کی مذمت کی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہوت اور غضب کا مادہ بالکل ہونا نہیں چاہیے کیونکہ بہرحال ان قویٰ کی بھی بہت جگہ ضرورت ہے مقصد اس کی مذمت سے یہ ہے کہ نامناسب راستوں میں اور شریعت کے خلاف ان قوائے شہوانی و غضبانی سے کام نہ لیا جائے۔ معلوم ہے کہ کسی قوم کے خصائص سے مراد وہ چند محسوسات اور قابلیتیں ہیں جو اس قوم کے اشخاص میں پائی جاتی ہیں اور ان کی قوتوں کو ایک ہی طرف مصروف کر دیتی ہیں۔ یہ عام مجموعہ خیالات اور محسوسات کا سال ہائے دراز میں وراثتاً پیدا ہوتا ہے اور اس کا نام خصائص قومی ہے یہ وہ وراثت ہے جو ہمیں اپنے آباؤ و اجداد سے ملی ہے اور جسے ہم خود اپنے اخلاف (پسماندگان) کے لئے چھوڑ جانے والے ہیں۔

دینی دعوت عصبیت کی قوت کو دوبالا کر دیتی ہے۔ دین کا جذبہ بغض و حسد کے مادہ کی بیخ کنی کر کے انسانوں کا پورا رُخ حق و صداقت کی طرف کر دیتا ہے۔

اب جب حاملین دین و پیشوایان قوم اپنی کسی غرض پر سوچ بچار کرتے ہیں تو ایک ہی نقطۂ نظر سے کیونکہ سب کی طلب ایک ہی رخ میں ہوتی ہے اور سب کا مطلب و مقصد واحد، اور اس پر وہ مضبوطی سے جمے رہتے ہیں۔

عام قوم کو جب کسی نقطۂ خیال و مقصد واحد پر جمع کیا جائے اور اُس کے لئے اُبھارا جائے تو اس کے لئے عصبیت لابدی ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے۔

مَا بَعَثَ اللّٰہُ نَبِیًّا اِلَّا فِیْ مَنْعَۃٍ مِّنْ قَوْمِہٖ۔ (ابن خلدون)

جب انبیاء علیہم السلام کو ہی عصبیت کے بغیر چارہ نہیں جو لوگوں کی عادات بدلنے پر سب سے زیادہ قدرت رکھتے ہیں تو اوروں کا کیا پوچھنا وہ تو ضرور ہی تبدیلی عاداتِ انسانی کے لئے عصبیت کے محتاج ہوں گے کیونکہ عصبی حمایت کے بغیر ان کی دعوتِ حق چل نہ سکے گی۔

بہت ہی کم ایسے آدمی ہوں گے جن کی طبیعت میں صلہ رحمی کا مادہ نہ ہو۔ اسی مادہ کا اثر ہے کہ انسان جب دیکھتا ہے کہ اس کے عزیز و اقارب کسی کے ظلم کا شکار ہو گئے ہیں یا ہلاکت و مصیبت کا لقمہ بن گئے ہیں تو اس کا خون جوش کھانے لگتا ہے اور پھر اپنے آپے میں نہیں رہتا۔ وہ اس کی تاب نہیں لا سکتا کہ اس کا قریبی عزیز مصیبت میں پڑا دم توڑ رہا ہے یا دشمن کے پنجۂ ظلم میں پھنسا ہوا ہو اور وہ اسے خاموشی سے دیکھے بلکہ چاہتا ہے کہ عزیز سے پہلے اپنی جان کو ہلاکت کے منہ میں دیدے یہ انسان کی فطرت ہے جس پر وہ پیدا ہوا ہے۔ پھر اگر رشتہ داری بہت ہی قریب کی ہے اور خونی اتصال بہت گہرا ہے تو خیر اندیشی اور قربانی کا جذبہ بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوگا اور اگر قرابت دور کی ہے اور تعلقات تقریباً بھول کی نذر ہو گئے، صرف شہرت باقی ہے، تب بھی اقرباء کی مدد کے لئے رگ حمیت حرکت میں ضرور آتی ہے گو وہ جوش و برہمی پیدا نہ ہو جو ایک زیادہ قریبی عزیز کے مبتلائے مصیبت ہونے پر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس ضمن میں افغان

مشائخ و امراء کے خیالات و جذبات اور نوجوان طبقہ کی جانبازی اور خصوصاً احمد شاہ ابدالی کی تڑپ اور اپنی جان کو ہلاکت کے منہ میں دینا اور سب کے خون میں گرمی پیدا ہونا خصوصاً اسی وقت زیادہ تیز ہو کر آپے سے باہر ہونا۔ جب ان کو ہندوستان سے افغانوں کی فریاد اور تباہی کی خبریں اور غیروں سے نجات دلانے کے لئے خطوط پہنچتے ہیں۔ اس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے لہٰذا بہت اختصار کے ساتھ ہندوستان کے سفر میں ان کو جو پیش آیا ذیل میں درج ہے۔

احمد شاہ ابدالی، میاں عمر صاحب اور ان کے رفیق امراء و مشائخ، انہیں مذکورہ اسباب اور وجوہات کے بناء اس پر متفق ہو گئے کہ ہندوستان میں کافر مرہٹوں کے ظلم و ستم اور قتل و غارت سے مسلمانانِ ہند کو جن میں افغان برادری کے لوگ بھی بکثرت آباد تھے، نجات دلائی جائے۔ یہ مہم بظاہر بہت ہی مشکل تھی مگر انہوں نے خدا کا نام لے کر دین اسلام کی دعوت سے افغانوں کی عصبیت کی قوت کو تازہ اور دوبالا کر کے جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے احمد شاہ ابدالی، افغان فوج کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوئے۔

احمد شاہ ابدالی ایشیاء کے اولین حکمران تھے جو مختلف افغان قبائل کے مشترکہ جرگوں کے ذریعہ بالاتفاق بمقام قندھار منتخب کیا گیا اور وہ صرف بادشاہ نہیں بلکہ تمام افغان قبائل کا قائد اور پیشوا تھا۔ ان کی جمہوریت نوازی اور قوم کی صحیح رہنمائی اور خدمت کرنے کے سبب اس وقت بھی پختون قوم اس کو اپنا مورثِ اعلیٰ تصور کرتے ہیں اور بہت عزت کے ساتھ احمد شاہ بابا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اور ان سے جو وراثت قوم افغان کو ملی ہے وہ بہت ہی وزن دار ہے جس کو

پوری قوم پختون دائمی احسان اور نشانِ راہ ہی سمجھتے ہیں اور اللہ پاک سے دست بدعا ہیں کہ اس قوم میں پھر احمد شاہ بابا اور ان کے اراکینِ مشورت جیسے پیدا ہوں۔ آمین، ثم آمین یارب العالمین۔

احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کے مقابلے کے لئے ۱۱۷۴ھ میں دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب کی طرف بڑھا اور معمولی لڑائی کے بعد مغل آدینہ بیگ مرہٹہ گورنر سے پنجاب چھین لیا۔ جب وہ سہارنپور کے راستے سے دوآبہ میں آیا تو اسے ہر جگہ مرہٹہ لشکر پھیلا ہوا نظر آیا۔ احمد شاہ ابدالی اپنے لشکر کے ساتھ گنگا جمنا کے دوآبہ میں مقیم تھا کہ نواب نجیب الدولہ چھ ہزار سوار اور آٹھ ہزار پیدل افغانی فوج کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی جگہ نواب دوندے خان اور حافظ رحمت خان اٹھارہ ہزار پیدل اور چار ہزار سواروں کے ساتھ آ گئے۔ نواب احمد خان بنگش فرخ آباد سے دو ہزار سوار اور کچھ پیدل فوج کے ساتھ آیا۔ ابدالی کی فوج کی مجموعی تعداد چھبیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ شاہ ولی خان ابدالی کا وزیر اعظم تھا۔ روہیلوں کی اس امداد سے احمد شاہ ابدالی کی طاقت دوگنا ہو گئی۔ روہیلوں کی فوج خالص افغانوں پر مشتمل تھی۔ جو سخت قابل اعتبار تھے۔ اس فوج کے علاوہ ہر سردار کے ساتھ کچھ فالتو سپاہی بھی ہوتے تھے۔ فالتو سپاہیوں کی یہ فوج یتیموں کی جماعت سے مشہور تھی۔ یہ لوگ لڑنے کے لئے نہیں ہوتے۔ یتیموں کی فوج باقاعدہ لشکر کے عقب میں رہتی تھی۔ اس کا کام وقتاً فوقتاً دشمن پر چھاپا مارنا اور لوٹ مار تھی۔ لوٹ میں جو کچھ ان کے ہاتھ آتا وہ انہیں کو دے دیا جاتا کیونکہ سرکار سے انہیں نہ کوئی وظیفہ ملتا، نہ تنخواہ ملتی تھی۔

ہندوستان کے باشندے مرہٹوں کے مظالم سے اس قدر تنگ آچکے تھے کہ انہوں نے ابدالی کے دوآبہ پہنچ جانے کی کسی نے مرہٹوں کو اطلاع نہ دی۔ وہاں قریب میں دتا جی سندھیا کا لشکر پڑا ہوا تھا۔ ابدالی نے اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں دتا سندھیا مارا گیا اور تین چوتھائی کے قریب اس کا لشکر تباہ ہو گیا۔ ابدالی کی فوج نے نارنول تک بھگوڑ مرہٹوں کا تعاقب کیا یہاں اسے یہ خبر ملی کہ ایک اور مرہٹہ جرنیل ملہار رائو ہلکر اپنے لشکر کے ساتھ سکندرہ میں مقیم ہے۔ ابدالی نے اس وقت ایک بہت خوفناک چال چلائی۔ اس نے کچھ نقد و جنس کشتیوں میں لدوا کر دریائے گنگا کے پار اتروا دیا۔ ادھر ملہار رآؤ ہلکر کو جب خبر ہوئی تو وہ اپنی فوج کے ساتھ سکندرہ سے نکلا۔ اور مٹھی بھر افغانوں کو جو اس سامان کے ساتھ تھے مار بھگایا اور سارا سامان لوٹ لیا۔ ابدالی نے ہلکر کی تاک میں اپنے سرداروں شاہ پسند خان اور قلندر خان کو بہت سی فوجوں کے ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ ملہار ہلکر فتح کے نشہ میں سکندرہ واپس جا رہا تھا کہ افغان برق و باد کی طرح اس پر آپڑے۔ ہلکر بڑی مشکل سے تین سو سواروں کے ساتھ جان بچا کر بھاگ گیا اس کی بہت سی فوج قتل ہو گئی۔ اور بہت قید کر لی گئی۔ ہلکر کا خزانہ اور دیگر سامان ابدالی کی فوج کے ہاتھ لگا۔ اسی طرح چند روز ہی میں سندھیا اور ہلکر کا لشکر تباہ ہو گیا۔

احمد شاہ ابدالی ہر روز گھوڑے پر سوار ہو کر صبح سے دوپہر تک اپنی چھاؤنی کا چکر لگایا کرتا تھا اور فوج کو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھتا۔ اس اثنا میں دہلی سے حیدر خان اور گل بانو آئے اور اس کے سامنے پیش کئے گئے۔ ابدالی نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ تعارف کرایا گیا اور حیدر خان افغان دہلی کے واقعات بالتفصیل بتائے۔ مرہٹوں کا قبضہ

اور وزیر غازی الدین مغل کے بادشاہ کو قتل کرنے کی داستان اور مرہٹوں کے طرف داروں اور ان کے لائقے واقعات اور ظلم کی داستانیں سنائیں اور غازی الدین وزیر کی غداری اور مرہٹوں کے ساتھ پروگرام وغیرہ سے اطلاع دی۔ حیدر خان افغان دہلی کے بادشاہ مرحوم کا خاص آدمی تھا۔ احمد شاہ کے نام ان کا زبانی پیغام اور ہدایات بھی سنائیں۔ ابدالی بہت ہی خفا ہوا۔ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی۔ ابدالی ذرا تیوری چڑھا کر بولا۔ لیکن تم اتنی دیر سے کیوں آئے۔ حیدر خان نے اپنی اور گل بانو کی گرفتاری کا ماجرا سنایا۔ غازی الدین وزیر نے ان کو لال قلعہ میں قید کیا تھا اور دہلی میں شاہ ولی اللہ (دہلوی) جو شاہ جی کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ انہوں نے ان کی رہائی اور یہاں ابدالی کے پاس بھیجنے کا انتظام کیا تھا۔ حیدر خان سے مرہٹوں کے دہلی میں داخل ہونے اور ان کے مظالم کی خبریں سنتے ہی ابدالی کے چہرے پر جلال آگیا۔ آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔ پوچھا وہ محسن کش غازی الدین کہاں ہے۔ حیدر خان نے جواب میں کہا۔ عالی جاہ غازی الدین ہی تو مرہٹوں کا استقبال کر کے انہیں دہلی لایا تھا اور وہیں ہے۔ احمد شاہ نے کہا۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہندی مسلمانوں میں اتفاق نہیں (یہ اشارہ مغلوں کو تھا) وزیر غازی الدین نے ہند میں افغانوں کی جو ریاستیں ہیں انہیں مرہٹوں کے ہاتھوں تباہ کرایا۔ لیکن اس نمک حرام سے کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کئے دانت ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر اور اس کے حبیبؐ نے ہمیں اتفاق اخوت اور ہمدردی کی تعلیم دی ہے لیکن یہاں مجھے اپنے بھائیوں میں اس کا جذبہ کہیں نظر نہیں آتا (اس وقت شجاع الدولہ کے بلانے کے لئے نجیب الدولہ کو بھیجا تھا جو ابھی تک نہیں آیا تھا شجاع الدولہ کے نہ پہنچنے پر بھی افسوس کیا)۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ ابدالی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

”مولا! میں تیرا ایک ناچیز بندہ محض تیرے نام کی برکت اور سہارے پر اپنے ہندی

بھائیوں کی خدمت میں آیا ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ تیرے مجاہدوں کے مقابلے میں تیرے پاک نام تیرے پاک دین اور تیرے حبیبؐ کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میں تجھ سے مدد مانگتا ہوں تو ہمیں ہمت اور استقلال عطا کر اور دین اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی توفیق عطا فرما۔"

سب حاضرین نے صدق دل سے آمین کہی، اور بادشاہ حیدر خان اور گل بانو کو اپنے وزیر کے سپرد کر کے خاصہ تناول فرمانے اپنے خیمہ میں چلا گیا۔

مرہٹوں کے سپہ سالار بھاؤ کو جو دلی میں تھا۔ احمد شاہ کے دوآبہ گنگا جمنا میں پہنچنے کی خبر مل چکی تھی لیکن برسات کی وجہ سے جمنا میں خوفناک طغیانی آئی ہوئی تھی ایسے میں ابدالی کے لشکر کا بڑھنا ناممکن تھا۔ کرنال کے قرب و جوار میں افغانوں کی ایک ریاست کنج پورہ کے نام سے مشہور تھی۔ بھاؤ کو کنج پورہ کے افغانوں کی طرف سے کھٹکا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ جب ابدالی کا لشکر آگے بڑھے گا تو کنج پورہ کے افغان ضرور مرہٹوں کا راستہ روکیں گے اس لئے بھاؤ کنج پورہ کی طرف متوجہ ہوا یہاں افغانوں کا ایک لشکر بیس ہزار کے لگ بھگ تھا۔ کنج پورہ سے کچھ فاصلے پر دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا۔ کہاں بیس ہزار اور کہاں لاکھوں کا لشکر تاہم افغانوں نے حق مردانگی ادا کر دیا۔ مرہٹوں کو ایسا جان توڑ کر مقابلہ کرنا پڑا کہ ایک بار تو بھاؤ کے بھی حواس گم ہو گئے۔ آخر چاروں طرف سے گھر کر سب قتل ہو گئے اور مرہٹے بھی زیادہ تعداد میں قتل ہوئے۔ مرہٹوں نے کنج پورہ میں داخل ہو کر بربریت اور مظالم کا ایسا خوفناک مظاہرہ کیا جس کی مثال اور کہیں مشکل ہی سے ملے گی۔

ابدالی کو جب ان واقعات کا علم ہوا تو اس نے اپنے سرداروں کو حکم دیا کہ جیسے بھی ہو جمنا عبور کرنے کی کوئی ترکیب کریں۔ آخر کچھ روز بعد ایک ایسا مقام مل گیا جہاں سے ابدالی کی فوجیں جمنا سے پار اترنے میں کامیاب ہو گئیں اسی اثنا میں دسہرہ کا تہوار آ گیا۔ ایک کنج پورہ کی لڑائی کی فتح دوسرے تہوار کی خوشی۔

مرہٹوں نے بڑی دھوم دھام سے مغلوں کی راج دھانی دلی میں دُسہرہ کا تہوار منایا۔ دلی کے ہندوؤں نے بھی مسلمانوں سے الگ ہو کر اس میں حصہ لیا۔

مغل حکمرانوں اور ان کے امراء کی خودغرضیوں اور رقابتوں کی وجہ سے مرہٹوں نے ملک میں جو ادھم مچا رکھا تھا اور جس طرح مسلمانوں کو لوٹتے اور مارتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ وہ لڑائی تھی جو پانی پت کی تیسری لڑائی کہلاتی ہے۔ لیکن احمد شاہ اور ان کے ساتھی خدائی عشق میں ڈوبے تھے اور نگاہیں صرف مسلمانوں کے بچانے پر لگی تھیں۔

ہے التفاتِ عام سے بالا مقام عشق
دل کی نگاہ ملتفتِ سیم و زر نہیں

احمد شاہ ابدالی کا لشکر باغپت کے گھاٹ سے جمنا عبور کر رہا تھا کہ مرہٹہ سپہ سالار راؤ بھاؤ کو بھی خبر ملی اور اس نے اسی وقت فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ اسی وقت مرہٹہ لشکر میں ملہار ہلکر، جھنکوجی، سندھیا، دتّاجی گائیکواڑ، جسونت راؤ پنوار، سلاجے راؤ، راجہ ستر دیو، بشن سنگھ وغیرہ مشہور مرہٹہ جرنیل تھے۔ لشکر کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ تھی۔ اور ابدالی کے جھنڈے تلے چھیاسٹھ ہزار مجاہد تھے ان میں چھبیس ہزار تو ابدالی کے سپاہی تھے اور چالیس ہزار دوسرے روہیلے سردار اور نوابوں کے آدمی تھے جو ہندوستان سے اس کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ مغلئ اندرون خانہ مرہٹوں سے ملا ہوا تھا لیکن ماں اور بیگم کے سمجھانے سے وہ ابدالی کے پاس پانی پت پہنچ گیا اور اپنے ساتھ صرف دو ہزار فوج اور چند توپیں لایا شجاع الدولہ کی خواہش و مرضی یہ تھی کہ وہ اس لڑائی میں غیر جانبدار رہے لیکن مصلحتِ وقت دیکھ کر ابدالی کے ساتھ پانی پت میں شامل ہو گیا۔

بھاؤ جب لشکر لے کر ابدالی کے مقابلے میں نکلا تو اسے سب سے زیادہ فکر سامان خورد و نوش کا تھا۔ تین لاکھ فوج اور ان کے مویشیوں کے لئے رسد وغیرہ کا انتظام

کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔

مصیبت یہ تھی کہ مرہٹوں کے جو چھوٹے چھوٹے دستے اِدھر اُدھر سامان حاصل کرنے جاتے لوگ ان کی خبر ابدالی کے لشکریوں کو بھی کر دیتے اور افغان اچانک قضاءِ مبرم کی طرح اُن پر آپڑتے۔ دلی کے آس پاس راجہ سورج مل جاٹ کا علاقہ تھا لیکن وہ بھاؤ کی نظروں میں مشتبہ تھا۔

ادھر احمد شاہ ابدالی جمنا سے ابھی ایک منزل ہی آگے آیا تھا کہ اسے بھاؤ کا لشکر سامنے نظر آیا۔ مرہٹوں نے مسلمانوں کو اپنی جمعیت مرتب کرنے کا بھی موقع نہ دیا اور آتے ہی "جے جے بھوانی" اور "ہر ہر مہادیو" کے نعرے لگاتے ہوئے حملہ کر دیا۔ ابدالی نے یہ رنگ دیکھ کر بڑی پھرتی سے سو سو مجاہدوں کے دس دستے بنا دیئے اور انہیں حکم دیا کہ یکے بعد دیگرے تکبیر کے نعرے بلند کرتے ہوئے دشمن پر حملہ کریں۔ باقی لشکر آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ مرہٹوں کی ہراول فوج وسواس راؤ، ملہار راؤ، دتاجی اور جھنکوجی کے ماتحت میدان میں آ گئی تھی۔ مسلمان مجاہدوں کی پیہم تکبیروں کی آواز سے یہ لوگ گھبرا گھبرا جاتے اور ایک دوسرے سے پوچھتے کہ مسلمانوں کا یہ لشکر کہاں سے آنکلا۔ جب سیناپتی بھاؤ کو یہ خبر ملی تو اس نے فوج کو حکم بھیجا کہ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹیں تاکہ مسلمان ان کے تعاقب میں اپنے لشکر کے قلب سے آگے بڑھ آئیں۔ چنانچہ مرہٹہ ہراول فوج پیچھے ہٹنے لگی۔ احمد شاہ ابدالی گھوڑے پر سوار ہو کر یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ مرہٹوں کی چال فوراً سمجھ گیا۔ اس نے اسی وقت اپنے سرداروں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی فوج کے پیچھے پیچھے آگے بڑھیں۔ مرہٹہ فوج تقریباً دو کوس پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اس اثنار میں شام کی آمد آمد کی وجہ سے دونوں فوجیں اپنے اپنے مقام پر رک گئیں۔ اور حفاظت کے لئے چوکی پہرے بٹھا دیئے۔ جب دن چڑھا تو بھاؤ نے پھر جنگی کونسل طلب کی اور آج کی لڑائی کے متعلق بہت سی تجویزیں پیش کیں لیکن چند تجربہ کار مرہٹہ افسروں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ چونکہ ہمارا لشکر بہت زیادہ ہے اس لئے ہمیں آج بھی

پیچھے ہٹ کر کھلے میدان میں پہنچ جانا چاہیے اور جب سارا لشکر کھلے میدان میں پہنچ گیا تو پھر ابدالی کو چاروں طرف سے گھیر کر مار لینا آسان ہو گا۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق مرہٹے پھر پیچھے ہٹنے لگے۔

دن میں کئی بار آپس میں جھڑپیں بھی ہوتی رہتیں۔ ایک طرف سے پیچھے ہٹنے اور دوسری طرف سے آگے بڑھنے کا سلسلہ متواتر پانچ روز تک جاری رہا اور آخر تقدیر دونوں لشکروں کو پانی پت کے میدان میں لے آئی۔ پانی پت کے اصلی میدان میں احمد شاہ ابدالی نے قیام کیا اور بھاؤ یہاں سے چار کوس پیچھے خیمہ زن ہوا۔ اس وقت پانی پت کا شہر ابدالی کے قبضہ میں تھا جس کی اس نے پوری طرح مورچہ بندی کر لی۔ اور مرہٹوں کے شب خون کے پیش نظر فوج کو لشکر کے چاروں طرف بیس بیس گز چوڑی خندق کھودنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں میں جہاد کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ سب مسلمان سردار حتیٰ کہ خود احمد شاہ ابدالی اپنے سپاہیوں کے ساتھ خندق کھودنے میں مشغول ہو گئے۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے تھے تسبیح اور درود شریف کی آواز چاروں طرف سے بلند ہو رہی تھی اور خندق تیار ہو رہی تھی۔ مرہٹوں کو جب یہ اطلاع ملی تو انہوں نے بھی اپنی چھاؤنی کے چاروں طرف خندق تیار کرالی۔ دونوں خندقوں میں صرف چھ کوس کا فاصلہ تھا۔ جب تک یہ خندقیں تیار ہوتی رہیں دونوں طرف سے لڑائی بھی بند رہی۔ لیکن تیاری کے بعد پھر ہراول دستوں میں جنگ ہونے لگی۔ ایک طرف سے "ہر ہر مہادیو" اور دوسری طرف سے "اللہ اکبر" کے نعرے فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیتے۔

اُدھر یہ جھڑپیں ہو رہی تھیں اِدھر مرہٹہ جرنیل بھاؤ نے گوبند پنڈت کو جو ایک تجربہ کار افسر تھا دس ہزار سوار دے کر حکم دیا کہ وہ آس پاس کے اسلامی علاقوں کو لوٹ لے کیونکہ مسلمانوں کو انہی علاقوں سے رسد کا سامان پہنچ رہا تھا۔ گوبند پنڈت نے مسلمانوں کی بستیوں کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ اس کی اس ترکیب سے مسلمانوں کو رسد ملنی بند ہو

گئی۔ ابدالی کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے سردار عطائی خان کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ ۲۰ ہزار سوار لے کر فوراً جائے اور گوبند پنڈت کا سرکاٹ کر لائے۔ چنانچہ بادشاہ کا حکم پاتے ہی عطائی خان دو ہزار سواروں کے ساتھ لشکر سے نکلا۔ عطائی خان نے صرف ایک رات میں چالیس میل سفر کر کے گوبند پنڈت کو جالیا۔ گوبند پنڈت بھی فوراً مقابلے کے لئے تیار ہو گیا لیکن مرہٹے مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا سکے اور میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ گوبند پنڈت کچھ سواروں کے ساتھ مسلمانوں سے لڑ رہا تھا۔ اس نے بھی بھاگنے کی ٹھانی لیکن بدقسمتی سے اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر نیچے گرا۔ ایک مجاہد نے دوڑ کر اس کا سرکاٹ لیا اور عطائی خان کے پاس لے آیا۔ عطائی خان نے واپسی کی راہ لی اور دوسرے ہی روز ابدالی کے قدموں پر وہ سرڈالا۔ بھاؤ کو جب گوبند پنڈت کے قتل اور اس کے دس ہزار سواروں کے قتل اور شکست ہونے کی خبر پہنچی تو اسے بہت افسوس اور گھبراہٹ ہوئی۔ بھاؤ کو سب سے زیادہ لشکر کے لئے رسد پہنچانے کا فکر تھا لیکن مسلمانوں کے حملوں کی وجہ سے کسی اور جانب سے سامان آنا بالکل بند ہو چکا تھا۔

بھاؤ نے اپنے نائب افسروں کے مشورہ سے بیس ہزار سپاہی جمنا اور گنگا کے درمیانی علاقوں میں راتوں رات اِدھر اُدھر سے رسد جمع کرنے کو بھیجے۔ نصف شب کے قریب یہ فوج ایک جنگل میں آرام کرنے کے لئے رک گئی لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ موت یہاں بھی ان کی تاک میں ہے۔ گوبند پنڈت کے واقعہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ایک سردار شاہ پسند خان کو پانچ ہزار سوار دے کر مرہٹوں کی ٹوہ میں لگا رکھا تھا تاکہ وہ کہیں سے رسد نہ لے جاسکیں۔

شاہ پسند خان کو جب خبر ملی تو اس نے جنگل کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور زور زور سے اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ مرہٹے گھبراہٹ کے عالم میں ہتھیار سنبھال کر مرنے مارنے پر تیار ہو گئے لیکن ان سے کچھ نہ ہو سکا۔ صبح تک افغانوں نے سب کو قتل کر کے ختم کر دیا۔ شاہ پسند خان نے مقتولوں کے سر اوپر نیچے رکھ کر ایک مینار بنایا۔ ابدالی نے

شاہ پسند کی درخواست پر یکلہ مینار خود جا کر دیکھا اور شاہ پسند خان کو خلعت عطا کیا۔ یہ ہنگامے اور معرکہ آرائیاں جو مرہٹوں اور افغانوں میں ہو رہی تھیں، اب ان کو پانچ مہینے کا عرصہ گزر گیا۔ بہت سے مرہٹے افغانی تلواروں سے مرے۔ مرہٹہ لشکر میں کھانے پینے کے سامان کی خوفناک قلت محسوس ہو رہی تھی اور فوج میں بھی بے دلی کے آثار پائے جاتے تھے۔ بھاؤ کو اگر کسی پر بھروسہ تھا تو وزیر نواب اودھ شجاع الدولہ تھا۔ آخر بھاؤ نے شجاع الدولہ کو ایک خط لکھا اور تمام حالات بیان پر وہ الفاظ لکھے جو اوراق تاریخ کے دامن میں آج تک محفوظ چلے آتے ہیں وہ الفاظ یہ تھے۔

"اب کاسہ لبریز ہو چکا ہے اور ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں۔"

یہ خط لکھ کر اس نے اپنے ایک معتبر آدمی کے ہاتھ شجاع الدولہ کو بھیج دیا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ شجاع الدولہ کو جس وقت یہ خط ملا وہ اسی وقت سوار ہو کر احمد شاہ ابدالی کے خیمے پر آیا۔ احمد شاہ مصلّے پر بیٹھا اپنے خالق کو یاد کر رہا تھا۔ شجاع الدولہ کے آنے کی اطلاع پاتے ہی باہر نکل آیا، خیریت پوچھی۔ شجاع الدولہ نے بھاؤ کا خط پیش کیا۔ ابدالی بھاؤ کا خط سن کر بولا "واقعی قطرے کی بھی گنجائش نہیں۔"

ساتھ ہی اس نے اپنے سرداروں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ شجاع الدولہ اس وقت بھی اس امید پر تھا کہ جنگ نہ ہو اور صلح ہو جائے مگر احمد شاہ ابدالی نے روہیلے سردار نجیب الدولہ عنایت خان بن حافظ رحمت خان، دوندے خان کی رائے کو فوقیت دی اور صلح سے انکار کر گئے۔ روہیلے سردار صلح کے مخالف تھے وہ سمجھتے تھے اگر صلح ہو گئی اور ابدالی ہندوستان سے چلا گیا تو مرہٹے ان کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔ شجاع الدولہ ابھی مایوس نہیں ہوا تھا جو اسے بھاؤ کا یہ آخری خط ملا اور اس کی کوشش تھی کہ بغیر جنگ کئے بادشاہ ہندوستان سے واپس ہو جائے مگر ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۴ر جنوری ۱۷۶۱ء کو صبح نکلتے ہی مرہٹوں کی چھاؤنی کی طرف سے شور و غل کی آواز آنے لگی۔ احمد شاہ ابدالی نے

اسی وقت اپنی فوج کو ترتیب دیا اور ایک دستے کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔ مرہٹوں کے لشکر کے آگے آگے توپ خانہ تھا۔ اس توپ خانے نے نزدیک آکر توپوں کے دہانے کھول دیئے اور توپیں آگ اگلنے لگیں۔ مسلمانوں کے مورچہ پر خوفناک گولہ باری ہونے لگی اور تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں کو اپنے بہت سے مورچے خالی کرنے پڑے۔ مسلمانوں کے دائیں بائیں عنایت خان بن حافظ رحمت خان، دوندے خان، نواب احمد خان اور نجیب الدولہ کی فوجیں تھیں اور قلب میں وزیراعظم شاہ ولی خان اپنی فوج کے ساتھ کھڑا تھا۔ توپ خانے کا دباؤ انہی روہیلے سرداروں کی صفوں پر تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں قریب چھ ہزار سے زیادہ افغان روہیلے شہید ہوئے۔ یہ حالت دیکھ کر بھاؤ اور بسواس راؤ اپنے دستوں کے ساتھ آگے بڑھے اور ایسا شدت کا حملہ کیا کہ روہیلوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ نواب شجاع الدولہ مغل اپنی فوج کے ساتھ ایک طرف تماشائی بن کر خاموش کھڑا تھا۔ روہیلوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے مرہٹے اس جگہ آنکلے جہاں وزیراعظم شاہ ولی خان کھڑا تھا۔ مرہٹوں نے آتے ہی اس کی فوج پر حملہ کر دیا۔ فضا پھر ایک بار ”ہر ہر مہادیو“ اور ”اللہ اکبر“ کے نعروں سے گونجنے لگی۔ لیکن پاسہ مرہٹوں کا ہی بھاری معلوم ہوتا تھا۔ اچانک شاہ پسند خان وزیراعظم کی مدد کو آ گیا اور تھوڑی دیر بعد احمد شاہ ابدالی بھی اپنے رسالے کے ساتھ آ پہنچا۔ ان دونوں کے آجانے سے مرہٹوں کا بڑھتا ہوا سیلاب رک گیا۔ نجیب الدولہ جو ابھی ابھی اپنا مورچہ چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا اپنے سپاہیوں کو اِدھر اُدھر سے فوراً اکٹھا کر کے پھر آگے بڑھا۔ دوسرے سردار بھی سنبھل کر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ نجیب الدولہ کی فوج بڑی ہوشیاری اور بہادری سے بھاؤ اور بسواس راؤ کی فوج کے عقب میں آ گئی۔ اب سامنے سے ابدالی کی فوجیں تھیں، عقب میں روہیلے سردار تھے اور بھاؤ اور بسواس راؤ بیچ میں گھیرے ہوئے تھے۔ تلواروں کی جھنکار، نیزوں اور بھالوں کی چمک، گرزوں کی کھٹک اور توپوں، بندوقوں کی

کڑک۔ ابدالی کے لشکر میں غلیل باز بھی تھے اور دونوں طرف تیر انداز بھی۔ غلیلے اس طرح برس رہے تھے جیسے آسمان سے ژالہ باری ہو رہی ہو۔ تیروں کی بارش میں کبھی بادلوں کے سامنے بھی ایک پردہ سا کھنچ جاتا۔ زخمیوں کی چیخ و پکار اور بہادروں کے نعروں سے میدان کارزار قیامت صغریٰ کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ آج مرہٹے بھی مرنے مارنے پر اپنے مقام سے نکلے تھے کٹ رہے تھے مر رہے تھے تڑپ رہے تھے۔ لیکن کیا مجال جو کسی کا پاؤں پیچھے ہٹے۔ آج بھاؤ اور بسواس نے بھی مردانگی اور بہادری کا حق ادا کر دیا۔ ابدالی کے ہاتھ میں ہلال نما تلوار تھی سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس تھا اور میدانِ جنگ میں گھوڑا دوڑاتا پھرتا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا خبردار کوئی ہندو میدان سے بھاگنے نہ پائے۔ ایک جگہ بھاؤ افغانوں کے نرغے میں گھرا ہوا تلوار چلا رہا تھا۔ اس کے آس پاس دس پندرہ مرہٹہ سردار کٹے پڑے تھے۔ بھاؤ بھی اپنے خون میں نہایا ہوا تھا آخر اسی طرح لڑتے لڑتے مارا گیا۔ اور اِدھر اُدھر سے وہی "جے بھوانی" "ہر ہر مہادیو" اور اللہ اکبر کے نعرے سنائی دینے لگے لیکن بھاؤ کے مارے جانے سے مرہٹے ہمت ہار چکے تھے اور میدان جنگ سے بھاگ رہے تھے۔ اچانک کہیں سے آواز آئی۔ راجکمار بھاؤ مارا گیا تو بھاگتے ہوئے مرہٹوں نے بری طرح شکست کھائی۔ ابدالی کے حکم سے شہدار کی لاشوں کو جمع کر کے دو دو سو کو ایک ایک گڑھے میں دفن کر دیا گیا اور قبرستان کا نام گنج شہیداں رکھا گیا جو مرہٹہ فوج میدانِ جنگ سے قتل سے بچ کر بھاگی اور راہِ فرار اختیار کی تو افغانوں نے دور دور تک ان کا تعاقب کیا۔ مرہٹہ مقتولین کی لاشیں پچاس پچاس میل تک بکھری پڑی تھیں۔ تاریخ دانوں کا قول ہے کہ اس لڑائی میں ڈھائی لاکھ سے بھی زیادہ مرہٹہ فوج ماری گئی۔

جب اس شکست کی خبر مہاراشٹر یعنی مرہٹہ کے ملک میں پہنچی تو کوئی مرہٹہ گھر ایسا نہیں تھا جہاں صفِ ماتم نہ بچھی ہو۔ پیشوا اس لڑائی کے بعد بہت تھوڑے دنوں زندہ رہا اور اپنے بیٹے بسواس اور اپنے چچازاد بھائی بھاؤ کے غم میں مر گیا۔ مشہور تاریخ دان

سیکلر لکھتا ہے:۔

"پانی پت کے نقصانات سے مرہٹہ طاقت پھر سر نہ اٹھا سکی اور اسی ایک شکست سے ہندوؤں کی نشاۃ ثانیہ کی تمام امیدیں ختم ہوگئیں"۔

احمد شاہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ دہلی کو اپنی سلطنت میں شامل رکھیں مگر اُس نے نہ مانا اور ناجائز تصور کیا کہ میں مسلمانوں کی امداد کے لئے آیا ہوں۔ فتح کے بعد احمد شاہ ابدالی دلی آیا اور شہید عالمگیر ثانی جو اپنے وزیر نمک حرام غازی الدین کے ہاتھوں قتل ہوا تھا کے بیٹے شاہزادہ علی گوہر کی تخت نشینی کا اعلان کیا۔ شہزادہ علی گوہر چونکہ اس وقت وہاں سے دور کہیں اور جگہ مرہٹہ سے فراری تھا اس لئے اس کے بیٹے جواں بخت کو قائم مقام بادشاہ مقرر کیا اور نجیب الدولہ کو سلطنت کا منتظم اور نگران بنایا اور خلعتیں دے کر سرداران ہند کو رخصت کیا۔ ازاں بعد اپنی فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ چلتے وقت سرہند کی صوبہ داری زین خان مہمند کو عطا کی۔ احمد شاہ ابدالی کے آجانے کے بعد قدرت نے مغلوں کو اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کا جو ایک اور موقع دیا تھا۔ افسوس اپنی نااہلیت کی وجہ سے وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ وہی لال قلعہ جہاں کبھی بڑے بڑے سرکشوں کی تادیب کے فرمان جاری ہوا کرتے تھے۔ نجیب الدولہ کے مرنے کے بعد اب وہاں سے صرف شعراء اور طوائفوں کے نام دعوت نامے بھیجے جاتے تھے۔ بادشاہ مشاعروں کی صدارت کرتا اور طوائفیں تہنیت کے گیت گاتیں۔ مغلوں کی اس کمزوری سے انگریزوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور اس بدنظمی کے دوران میں انگریزوں نے بڑے صبر واستقلال سے سلطنتِ مغلیہ کے کھنڈروں پر اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔



امیر الامراء نواب نجیب الدولہ

نجیب خان ابن اصالت خان ابن ملک عنائیت خان، قبیلہ یوسف زئی کے ذیلی شاخ عمر خیل سے تھا۔ ان کا خاندان روہیلوں میں باعتبار بزرگی و شرافت ممتاز تھا۔ اصالت خان وطن میں اپنے قبیلہ کا سردار تھا اور اس کے بھائی بشارت خان گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ وہ عہد فرخ سیر میں بسلسلہ تجارت ہندوستان آئے۔ یہاں کٹھیر میں اس وقت روہیلوں نے اپنی ریاست قائم کر لی تھی جو بعد میں روہیلکھنڈ مشہور ہوا اس ریاست کا بانی داؤد خان یوسف زئی تھا جس نے ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں یہاں باقاعدہ سلطنت قائم کی تھی۔ قریب کے اس علاقہ میں بشارت خان نے بلاس پور پر قبضہ کر لیا اور اس کا نام اپنے بشارت نگر رکھا۔ نجیب خان ۱۱۱۵ھ میں اپنے وطن صوابی علاقہ پشاور میں پیدا ہوئے تیئس سال کی عمر میں اپنے چچا بشارت خان کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ بشارت خان کی ایک لڑکی نواب علی محمد خان رام پور کو بیاہی تھی۔ دوسری دختر نجیب خان سے منسوب ہوئی۔ ان کے بیٹے نواب ضابطہ خان کو نواب علی محمد خان کی دختر منسوب تھیں جن کے بطن سے نواب غلام قادر خان روہیلہ تھے۔

نجیب خان کو نواب علی محمد خان نے آنولہ بلا کر کچھ سواروں کی سرداری پر فائز کر دیا تھا۔ اس اثنا میں شاہِ دہلی نے نواب علی محمد خان کو سرہند کی صوبہ داری عطا کی اس پر نجیب خان کی جانبازی سے قبضہ ہوا۔ نواب علی محمد خان والیٔ روہیلکھنڈ نے اس معاملے میں ان کا عہدہ بڑھا دیا۔ نواب ضابطہ خان کی والدہ کا ۱۱۶۱ھ میں انتقال ہوا تو دوندے خان رئیس بسولی نے اپنی دختر دربیگم سے نجیب خان کی شادی کر دی اور چودہ محال ضلع بجنور کے نواب علی محمد خان سے دلوائے۔ اور اپنی فوج کا ان کو رسالدار بنا دیا۔ اور دارا نگر کی تحصیل ان کے سپرد کی جس کو تھوڑے عرصہ میں نجیب خان نے ایک آباد قصبہ بنا دیا اور ایک درس گاہ بھی قائم کی اور علماء کو درس و تدریس کے لیے مقرر کیا سید نور الدین نے اپنی قلمی کتاب کے صفحہ ۳۶ پر یوں اظہار کیا ہے۔

"مرد صاحب جوہر بود اگرچہ ناخواندہ مطلق، لاکن عقل بسیار و اقبال داشت"

بادشاہ دہلی احمد شاہ مغل اور اس کے وزیر صفدر جنگ میں جب اختلافات پیدا ہوئے تو وزیر مذکور کو وزارت سے معزول کیا گیا وزیر نے سورج مل جاٹ اور صوبہ باڈنی کے فوجدار اندر گشائیں ہندو کو اپنا معاون بنا کر دلی کو اپنی افواج سے محصور کر لیا اور نوابان روہیلکھنڈ کو بھی اس فوجی مہم میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ دوسری طرف احمد شاہ مغل بادشاہ دہلی نے پریشانی کے عالم میں ان امراء کو امداد کے لئے دعوت دی۔ لہذا اس دونوں دعوتوں پر غور کے لئے مشورہ کر رہا تھا۔ دوندے خان اور حافظ الملک حافظ رحمت خان وزیر کی اعانت کے حق میں تھے نجیب خان نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اس کے نقائص بیان کئے اور اس میں ہندوؤں کی بالادستی کی جو بنیاد رکھی جانی مضمر تھی اسی سبب نجیب خان کی رائے سے انہوں نے بھی اتفاق کیا بلکہ یہ فیصلہ کیا کہ مغل بادشاہ کا ساتھ دیا جائے مشورے کے مطابق نجیب خان ایک ہزار سوار اور پیادہ فوج ہمراہ لے کر دلی روانہ ہوئے راہ میں اور لوگ بھی ان کے ہمراہ ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ دہلی پہنچنے پر ان کے ساتھ تقریباً بیس ہزار افغانوں کا مجمع تھا۔

دلی سے دو میل کھنڈ کے مقام پر صفدر جنگ وزیر نے مورچے لگا رکھے تھے۔ نجیب خان نے اس کی فوج پر حملہ کیا اور شکست فاش دی۔ سورج مل جاٹ شکست کھا کر بھرت پور کی طرف بھاگ گیا اور گسائیں مارا گیا اور سخت شکست کھائی۔ آخر صفدر جنگ نے بادشاہ سے معافی حاصل کر لی اور اودھ کی صوبہ داری پر چلا گیا۔

بادشاہ نے ان کو نجیب الدولہ کا خطاب دیا اور نوبت و نقارہ مع خلعت اور نوابی کا علم (نشان) عطا کیا اور بخشی کے منصب پر فائز کیا۔ سہارنپور کی جاگیر بھی عطا ہوئی نجیب خان وطن لوٹے۔ اجیت سنگھ نے فساد مچا رکھا تھا۔ اس کا استیصال کیا اور مظفر نگر قبضہ میں لائے۔ ۱۷۵۲ء میں تانلس ندی کے کنارے اپنے نام سے نجیب آباد شہر آباد کیا۔

نجیب الدولہ کا عظیم ترین کارنامہ یہ تھا کہ اسی کے کوشش کے نتیجے میں شاہ ابدالی کی سرکردگی

میں مسلم سرداروں نے پانی پت کے میدانوں میں مرہٹوں کو شکست دی۔ نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور میاں عمر چمکنی کا معتقد تھا یہ انہیں کے فیض کا اثر تھا کہ اس نے مرہٹوں کے مقابلے کا بیڑا اٹھایا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اس سلسلہ میں میاں عمر چمکنی کے ذریعہ شاہ ابدالی کو خط لکھ کر آمادہ کیا کہ وہ اس وقت مسلمانوں کی حفاظت اسی طریقہ سے کر سکتے ہیں۔ نجیب الدولہ نے یہ خدمت انجام دی کہ ایک طرف تو شاہ ابدالی کو سرداری قبول کرنے پر راضی کیا اور دوسری طرف ہند میں مسلم حکمرانوں اور سرداروں کو یک جہتی کی ترغیب دی۔ نواب شجاع الدولہ والی اودھ کو تیار کرنے کے لئے وہ خود اس کے دربار میں کئی دفعہ گیا اور بہت کوشش کے بعد اس کو مجبور کیا کہ وہ اپنی فوج لے کر پانی پت آئے۔ جس طرح نجیب الدولہ نے مسلمانوں کو یک جا کر کے مرہٹوں کے مقابلے کے لئے تیار کرنے کی کوشش کی تھی اسی طرح میدان جنگ میں خود اس نے اور دوسرے روہیلہ سرداروں نے بھی بہت زیادہ بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا۔

پانی پت کی لڑائی ہندو پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے مرہٹوں نے ایک زبردست اور مضبوط فوج تیار کی تھی جس کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ تھی اور ان کا مصمم ارادہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا خاتمہ کر کے برصغیر میں ہندو حکومت قائم کریں اور مسلمانوں کی مکمل طور پر بیخ کنی کریں۔ فتح پانی پت کے بعد شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کو امیر الامرائی کے عہدہ پر قائم رکھتے ہوئے حکومت دلی کا انتظام بڑی حد تک اسی کے سپرد کر دیا۔ دس سال تک نجیب الدولہ نے عہد انحطاط میں نہایت بہادری اور دور اندیشی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کیا۔ اس دور میں اس کا قابل ذکر کارنامہ جاٹوں کی قوت کو ختم کرنا تھا گویا کہ مغلیہ سلطنت اور اسلامی معاشرہ کی تین مخالف قوتوں یعنی مرہٹوں۔ جاٹوں اور سکھوں میں سے دو کو اس قدر کمزور کر دیا کہ وہ ایک مدت تک دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔

الغرض نجیب الدولہ نے اپنی ساری زندگی مسلمانوں کو ایک مرکز پر قائم کرنے اور ان کو مضبوط بنانے میں صرف کر دی۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں پر کوئی دوسری

قوم حکمرانی نہ کر سکے۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے خلاف ابدالی جھنڈے کے نیچے مسلمانوں کا جمع ہونا اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کی یہ کوششیں بارآور ہوتیں۔ اور ملک میں دوبارہ ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہوتی یہ امر قابل افسوس ہے کہ نجیب الدولہ کے عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور ۱۷۷۰ء میں وفات پائی اور اس کے مرتے ہی مسلمانوں کی اس جنگ آزادی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ ہمارے مورخین نے نجیب الدولہ کی شخصیت اور کارناموں کی صحیح تصویر پیش نہیں کی ہے، وہ اٹھارویں صدی کے نصف کے آخر کے قابل ترین سیاستدانوں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے (نجیب الدولہ کے شجرے کیلئے ملاحظہ ہو تواریخ حافظ رحمت خانی ۱۹۷۷ء حصہ حواشی)

حافظ رحمت خان

دوندے خان اور حافظ رحمت خان دونوں چچازاد بھائی تھے۔ ان کی پیدائش علاقہ یوسف زئی موضع طورو کے مشرقی محلہ شہامت پور میں ہوئی تھی اور ان کے والدین اور خاندان کا مسکن بھی یہیں تھا۔ ان کی جائداد یوسف زئی منڈھ کی ذیلی شاخ صدوزئی قبیلہ جو اس وقت یہاں سکونت رکھتا تھا کے ساتھ شامل تھی جب قبیلہ صدوزئی کا تبادلہ یہاں سے ہوا تو ان کا خاندان بھی یہاں سے ان کے ساتھ علاقہ صوابی منتقل ہوا اور شہامت پور کے بدلہ میں بطور سیری سالم موضع ڈوڈھیر دیا گیا تھا۔ اور ابتدائی بندوبست ۱۸۷۰ء کے کاغذات مال تحصیل صوابی مردان میں بھی یہ گاؤں یعنی ڈوڈھیر سالم بنام شہاب الدین قوم پختون برلیس جوان کا مورث ہے رجسٹر کاغذات مال ہوا ہے۔ اور اس وقت شہاب الدین کے بعض اولاد جو ہندوستان نہیں گئے یہاں سکونت پذیر اور مالکان دیہہ ہیں ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ ان میں ایک معمر اور معتبر ملک خویداد خان ابھی تک زندہ تھا ان کی اولاد بھی ہے اور ان کا ایک گھرانہ شیخ علی کی اولاد موضع یار حسین میں ٹل بہرام خیل کے ساتھ شامل جائداد رہتے ہیں۔

قصہ یوں کہ احمد شاہ ابدالی نے افغان سرداران ہند اور ان کے ساتھی افغان مجاہدین کو رخصت کرنے سے قبل ان کو ایک تقریر کی۔ تقریر کچھ خاصی لمبی اور نصائح سے بھرپور تھی تقریر

کے آخر میں اس نے ایک تجویز نواب شجاع الدولہ کے متعلق کہی جو بالکل دور اندیشی دانائی اور اخلاص پر مبنی تھی لیکن افسوس کے حافظ الملک نے تجویز مسترد کی جس کا نتیجہ بعد میں اس کے لئے باعث موت و تباہی و بربادی سلطنت روہیلہ واقع ہوا۔

احمد شاہ ابدالی کی تقریر کا آخری حصہ یہ تھا۔

"شجاع الدولہ بہادر جو تمہارے قبیلے میں شامل نہیں یعنی افغان نہیں ہے۔ اسے میں اپنے ہمراہ لئے جاتا ہوں اور ایک وسیع ملک جو اس کے ملک سے بہت زیادہ زرخیز اور معمور ہے اس کے نامزد کرتا ہوں۔"

بادشاہ یہ تقریر کر رہا تھا اور تمام افغان سردار نہایت خاموشی کے ساتھ سر نیچے ڈالے سن رہے تھے شجاع الدولہ بھی سن رہا تھا۔ جب ابدالی اپنی تقریر ختم کر چکا تو حافظ الملک نے کھڑے ہو کر نہایت ادب سے عرض کیا کہ:۔

"جہاں پناہ، ہم میں اور نواب شجاع الدولہ میں کسی طرح غیریت نہیں ہے۔ انہوں نے اکثر خطرناک موقعوں پر ہمیں مدد دی ہے اور بہت سے نازک مقاموں پر ہماری کمک کو پہنچے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ ان کا ہم پر اسی قدر گراں بار احسان ہے جس سے ہمارا سر نہیں اٹھ سکتا اگرچہ قبلہ عالم، نواب صاحب کو اپنے ساتھ لے جا کر سرفراز فرمانا چاہتے ہیں لیکن ہندوستانی لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ آخر قوم افاغنہ نے باہم اتفاق کر لیا اور ایک شخص (مغل) جو ہندوستان میں باقی رہ گیا تھا اسے بھی دیکھ نہ سکے اور وطن سے باہر نکال دیا۔ بہ ہر صورت نواب صاحب کا یہاں سے جانا ہمارے حق میں بہتر نہیں معلوم ہوتا۔"

بادشاہ نے فرمایا کہ

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں شجاع الدولہ سے کسی طرح دشمنی نہیں ہے اور وہ بھی تم سے نہایت خوش ہے لیکن تمہارے حق میں بہتر یہی تھا۔ جو اس وقت بیان کیا گیا۔

خیر اگر تم میری رائے کو رغبت کے کانوں سے نہیں سنتے اور نظر قبول سے نہیں دیکھتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ لیکن یاد رہے کہ ایک دن اس کا برا نتیجہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔،،

حافظ الملک کا عقیدہ سچا اور درست تھا شجاع الدولہ کو وہ مسلمان سمجھتے تھے اور ظن المومنین خیرا پر عمل پیرا تھے لیکن وہ بے ایمان تھا منافق اور دغاباز تھا۔

چنانچہ واقعی وہی برا نتیجہ نجیب الدولہ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد سامنے آیا۔ شجاع الدولہ نے مرہٹوں کو روہیلکھنڈ پر حملے کے لئے اکسایا اور وہ آ بھی گئے۔

لیکن ان سے کچھ نہیں ہو سکا اور نامراد واپس ہوئے جب شجاع الدولہ مرہٹوں سے مایوس ہوا تو پھر انگریزوں سے جو اس وقت کلکتہ میں تھے رابطہ قائم کر کے حملے کے لئے تیار کیا اور شجاع الدولہ اور انگریز کی مشترک فوجوں کے ہاتھوں حافظ رحمت خان شہید ہوئے اور ملک تباہ و برباد ہو گیا اور افغانوں میں سے جو ہاتھ آیا اسے قتل کیا افغان کافی مقدار میں کمایوں کے پہاڑوں اور سی پی برار کے جنگلوں میں فرار ہو گئے اور شجاع الدولہ لوٹ مار کر کے سب سامان لے گیا۔ اور تمام شہروں پر جھاڑو پھیر دی اور انگریزوں کو ہندوستان پر قبضہ جمانے کے لئے متوجہ کر کے سبق سکھا دیا۔ ان واقعات کی تفصیل سے تواریخ کی کتابیں بھری ہیں میں نے مختصراً ان کتابوں سے اخذ کر کے پیش خدمت کیا ہے۔ مثلاً

مصنف اخبار الصنادید لکھتا ہے کہ :۔

شجاع الدولہ نے روہیلوں کو ایسی بے رحمی اور بے حرمتی کے ساتھ پامال کیا کہ انگریزی فوج سے اس کو مدد دینے پر لندن کے ہاؤس آف کامنس اور کورٹ ڈائرکٹرز میں بھی اظہار تاسف و ملال کیا اور بنی نوع انسان کا کوئی بھی ہمدرد قیامت تک تاریخ کے اس مقام پر آئے گا تو وہ ان مظالم پر دو دو آنسو بہا جائے گا۔،،

تاریخ ہند میں ایک انگریز جیمس گرینڈ لکھتا ہے۔

"بہادر حافظ رحمت خان کی موت نے ان کے ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا جو بغیر رحم کے لوٹے جاتے تھے اور اس کے بدقسمت باشندے ہر ایک طرح کے مظالم کے شکار رہتے"

آگے جا کر لکھتا ہے کہ۔

"کرنل چیمپین کہتا ہے۔ ہمارا بریگیڈ فتح کے بعد اس افسوسناک منظر کا ایک شاہد تھا اور ایسا منظر دیکھا جو تذکرے کے قابل نہیں"۔

سلطنت روہیلکھنڈ

اب یہ بھی ضروری ہوا کہ روہیلوں کی یہاں آمد اور بسنے کے وجوہات بیان کئے جائیں اور سلطنت روہیلکھنڈ کے بانی داؤد خان کا تعارف کیا جائے داؤد خان ملک قادر خان کا چھوٹا بھائی تھا اور یوسف زئی میں قبیلہ اکوزئی کی ذیلی شاخ بابوزئی میں اکا معروف کے ملک کٹہ کی اولاد میں سے تھا۔ ملک قادر خان کی اولاد اس وقت سوات منگورہ کے شمال میں متصل، اینگرو ڈھیری میں آباد ہیں اور ان میں ایک شخص نصرے بابا بڑا سمجھدار اور معمر آدمی تھا جو چند سال ہوئے فوت ہوا۔ ان کے لڑکے مقام خان جمشید وغیرہ ابھی بھی موجود ہیں۔

داؤد خان یوسف زئی اپنے ملک سوات سے چند ساتھیوں کے ساتھ ۱۷۰۵ء مطابق ۱۱۱۷ھ کے ابتدا میں ہندوستان گیا اور وہ اس خیال میں تھا کہ کسی طرح کامیابی حاصل کر کے ایک ریاست کی بنیاد ڈالیں چنانچہ اس سلسلے میں سوچنے کے بعد طے کیا کہ وہ ایک روز مع اپنے سترہ افغان ساتھیوں کے میلہ ہردوار و بہ روایتی گڑھ مکتیشر، جہاں جانوروں اور خاص کر گھوڑوں کا میلہ لگتا تھا، میں آئے اور ایک لمبی رسی زمین پر بچھادی دونوں سرے دو کھونٹوں میں مضبوطی کے ساتھ باندھ دیئے۔ سارے میلہ میں جو بہترین قسم کے گھوڑے تھے منہ مانگے دام پر خرید کرتے اور اسی

رسی تک پہنچاتے باندھتے تھے۔ جب اٹھارہ گھوڑے اپنی پسند کے جمع کئے تو اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر کے سب گھوڑوں پر سوار ہو کر میلہ سے دوڑ کر چلے گئے۔ اور شمال میں کمایوں کے پہاڑوں میں گئے۔

جب کہ یہ خیال پورا کرنا تھا کہ ایسے شاداب اور زرخیز ملک میں اپنی حکومت کی بنیاد قائم کرنی چاہیئے تو ملک کھٹیر کو اپنی پرکار ہمت کا مرکز قرار دیا اور یہاں پہنچ کر سب سے پہلے ملک گیری کے سامان جمع کرنے کی طرف توجہ کی جو چند روہیلے رفیق کار تھے۔

ہندوستان میں مغل شاہی حکومت کے ضعیف ہو جانے کے وجہ سے علاقہ کھٹیر میں بھی ہر ایک ہندو زمین دار خودسری کا دم بھرنے لگا تھا۔ اکثر افغانوں کو جو ملک روہ (افغانستان) سے آئے ان کو یہ زمین دار نوکر رکھ کے باہم جنگ و فساد کرتے اور ہر ایک اپنے آپ کو راجہ خیال کرتا تھا آپس کا تو کیا ذکر بادشاہی حاکموں کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے عظمت اللہ مراد آباد میں حاکم تھا اور اس طرح نرپت سنگھ علاقہ پیلی بھیت و رام پور وغیرہ میں اور کیرت سنگھ قصبہ اکبر آباد میں اور کنچن سنگھ راج پور میں اور کھیم کرن رتن گڑھ اور چھپن سنگھ مدکر پرگنہ برسیر میں اور ارجن سنگھ آنولے میں نقارہ حکومت بجاتے تھے داؤد خان نے ان حالات کو دیکھ کر چند روز میں ایک جمعیت کثیر بہم پہنچا کر سارے ملک کھٹیر میں ہل چل ڈال دی۔ جب معرکہ آرائی کا وقت آتا تو گڑھی سے نکل کر جوہر شجاعت و جلادت دکھاتے جب فراغت پاتے تو پھر وہیں آکر پناہ لیتے۔ رفتہ رفتہ ایسا نام چمکا کے گرد و نواح کے بڑے زمین دار اور راجے مدد کے خواہاں ہونے لگے۔ روہیلہ ہم وطنوں سے بھی یہ خبر میں نہ چھپیں اور افغانوں کی کثرت نے ملک کھٹیر کو روہیلکھنڈ بن جانے کی پیش گوئی قائم کردی اور اس وقت ان کی رفاقت میں بہت سے پٹھان رہتے تھے۔ ابتدائی وقت میں داؤد خان کے افغان سپاہی دو سو کے قریب تھے۔ اس اثناء میں داؤد خان نے کنچن سنگھ پر حملہ کر کے اس کو شکست دے کر وہ علاقہ اپنی ریاست میں شامل کر دیا۔

داؤد خان کی روز افزوں ترقی کی خبریں وطن میں پہنچیں تو سینکڑوں افغان ان کے پاس آ گئے۔ چنانچہ پانچ سو جوانمرد افغانوں کی جمعیت ان کے پاس ہو گئی جو سب جنگی تربیت یافتہ تھے اور دوسری طرف مجلس مشاورت میں ۱: ملک خادی خان، ۲: پائندہ خان، ۳: دوندے خان، ۴: ملک کبیر خان، ۵: سردار خان، ۶: فتح خان اور ۷: صدر خان کمال زئی وغیرہ تجربہ کار اور نامور افغان نامزد کئے گئے۔ داؤد خان نے اکثر دیہات شہر بیں اور پرگنہ جات مثل بنیا[1] بیولی، پرگنہ ستاسی ضلع بدایون کے دبا لئے اور بنیا بیولی کو دارالحکومت بنا کر وہاں رہنے لگے۔ داؤد خان نے مرہٹوں کی لڑائی میں بہت سے کارہائے نمایاں کئے جس کے صلے میں مغل بادشاہ دہلی کے ہاں سے بریلی اور بدایون وغیرہ کے علاقے بھی داؤد خان کی ریاست میں شامل کرنے کی اجازت ہوئی اور ان کی ریاست تسلیم کی گئی اور ۱۷۰۷ء مطابق ۱۱۱۹ھ میں اپنی سلطنت عروج پر لے گیا۔

اسی طرح اس کے بعد سارے روہیلکھنڈ جو بعد میں انگریزوں نے اس کے چھ اضلاع بنائے، پر تقریباً بیس سال ایک مثالی حکومت کر کے ۱۱۳۹ھ میں وفات پائی۔ اراکین جرگہ نے ان کے متبنی علی محمد خان کو جانشین منتخب کیا۔ اس کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ نظام حکومت بہ منشائے اراکین مشورت افغانان خوب چلایا اور آخر ماہ شوال ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۴ استمبر ۱۷۴۹ء کو علی محمد خان کا آنولے میں انتقال ہو گیا۔

ان کی بیماری کی حالت میں الاکین سلطنت جمع ہوئے اور سبھوں نے یہ طے کیا کہ اس کے بیٹے سعد اللہ خان کو قائم مقام تسلیم کیا جائے۔ مگر وہ بچہ تھا لہذا رحمت خان اس تمام مملکت کا نگران اور سعد اللہ خان کا مدار المہام بنایا گیا اور دوندے خان کو فوج کا سالار بنایا۔

بنگش ریاست۔ فرخ آباد

جیسا کہ یوسف زیوں نے روہیلکھنڈ میں حکومت قائم کی تو اسی طرح ان کے قریب پڑوس میں بنگش پٹھانوں نے بھی محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں فرخ آباد

---

[1] بنیا بیولی کو بلسی بھی کہتے ہیں

میں اپنی ریاست قائم کی۔ بنگش خاندان کی حکومت کا بانی محمد خان بنگش ہوا اس نے مالوہ اور بندیل کھنڈ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ محمد خان بنگش کی وفات پر اس کا بیٹا قائم خان جانشین ہوا جو اودھ کے نواب صفدر جنگ مغل کی سیاست کا شکار ہو گیا۔ صفدر جنگ نے قائم خان کو حافظ رحمت خان سے لڑوا دیا اور اس کے امداد اور سازش سے قائم خان مارا گیا۔ صفدر جنگ مغل نے بنگشوں کی فرخ آباد کی ریاست پر ہاتھ صاف کرنا چاہا مگر جلد ہی ہوش میں آ کر محمد خان بنگش کا بیٹا احمد خان بنگش میدان میں آ گیا اور حافظ رحمت خان سے تعلقات بنانے کے علاوہ اس نے خوب مقابلہ کر کے فتح پائی اور صفدر جنگ مغل کو ناک چنے چبوا دیئے اس کا صوبیدار "نول رائے" جنگ میں مارا گیا۔ احمد خان بنگش بہت سمجھدار اور بہادر شخص تھا اس نے جنگ پانی پت میں بھی اپنے جوہر دکھائے تھے اس کا ذکر اس کتاب میں ہوا ہے۔

ہندوستان میں انگریز کے آخری عہد حکومت تک افغانوں کی مندرجہ ذیل ریاستیں موجود تھیں۔ ممدوٹ، مالیر کوٹلہ، جوناگڑھ۔ پالن پور، ٹونک بلاس نور، رام پور، بھوپال، گدی، باؤنی، جاؤرہ، کوروانی مناودر اور بنٹوا۔

ہندوستان میں افغانوں کی آبادی

آخر میں یہ درج کر دینا بھی معلومات میں اضافہ کا باعث ہو گا کہ پنجاب میں ضلع کیمبل پور یا اٹک اور ضلع میاں والی، اور صوبہ سرحد، وصوبہ سندھ و بلوچستان کے علاوہ ہندوستان میں انگریزی عملداری کے قیام پر افغانوں کی پہلی مردم شماری جو ۱۹۰۱ء میں ہوئی اور جس کو عبدالسلام خان عمر خیل یوسف زئی مصنف تاریخ نسب افاغنہ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے حسب ذیل ہے:۔

صوبہ جات	تعداد
۱۔ اجمیر، مارواڑ، راجپوتانہ، پنجاب، کشمیر	۴۲۵۹۶۶
۲۔ بمبئی ۔ بڑودہ	۱۸۲۷۸۹
۳۔ مدراس، میسور، ملک متوسط برار	۲۳۱۴۷۹
۴۔ ممالک متحدہ اودھ و بہار	۹۱۹۲۶۴
۵۔ بنگال، اوڑیسہ	۲۴۵۱۶۲
۶۔ کوچ بہار، ٹپرا، سکم اور آسام	۱۱۴۵۴
میزان	۲۱۱۶۱۱۴

ہندوستان میں افغانوں کی کل تعداد اکیس لاکھ سولہ ہزار ایک سو چودہ تھی لیکن واضح رہے کہ یہ تعداد ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہے۔ اس کے بعد گزشتہ ۹۷ سال میں ملک کی آبادی میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے۔ وہ اضافہ افغانوں کی تعداد میں بھی کر لینا چاہیے۔

وائي اغيار چه د دوزخ ژبه ده
زۀ به جنت ته د پښتو سره ځم

(امیر حمزہ شنواری)

پشتو اور سامی زبانیں

پختو یا پشتو اور سامی زبانیں ایک ہیں

پشتو اور سامی زبانیں ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں پختو میں سامی زبانوں کے الفاظ اور نام بکثرت ہیں مگر چند بطور مثال بیان کئے جاتے ہیں۔ مشہور مورخ فلپ کے حتی لکھتا ہے کہ :۔

اشوری، قدیم بابلی، (اکادی) کنعانی، فونیقی، حبشی، آرامی، عبرانی، عربی، اور سریانی زبان جو آرامی ہی کی ایک شاخ تھی یہ سب سامی زبانیں ہیں۔ ان تمام زبانوں کے درمیان گہری مماثلت ہے اور بحیثیت مجموعی یہ دوسری زبانوں کے مجموعوں سے جداگانہ ہیں حضرت ابراہیمؑ اصلاً آرامی تھے اپنے ہم قوموں سے آرامی میں بات چیت کرتے تھے اور وہی عبرانی قوم کے جد امجد ہیں۔،،

حضرت ہاجرہ زوجہ حضرت ابراہیم والدہ حضرت اسمٰعیل پانی کی تلاش میں صفا اور مروا کے درمیان کئی دفعہ دوڑنے کے بعد جب اپنے بچے حضرت اسمٰعیل کے پاس پہنچیں تو وہاں پانی دیکھ کر تعجب ہوا بے حد مسرت وخوشی کے مارے چلانے لگیں کہ ،، زم، زم،، یعنی پانی پانی۔ واضح ہو کہ ان کی زبان میں پانی کو ،زم، کہتے تھے۔ اور ان کے انہی مثالی الفاظ ،، زم، زم،، اور صفا و مروا کے درمیان پانی کی تلاش میں تگ و دو کو اللہ تعالیٰ نے بطور یادگار قائم رکھا مورخ حتی لکھتا ہے کہ :۔

،، ماں بیٹے کی اپنی زبان عبرانی تھی اور آپس میں اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ حضرت اسمٰعیل نے عرب کے جرہم قبیلہ میں نکاح کیا اور ان کی اولاد نے اپنی عبرانی زبان چھوڑ کر جرہم قبیلہ سے عربی زبان سیکھی۔ اسی واسطے حضرت اسمٰعیل کی اولاد کو

عرب متعبر بہ کہتے ہیں۔"

یہی لفظ۔۔۔ زم، بمعنی پانی اسرائیلی جلاوطن یہاں مشرق میں اپنے ساتھ لائے تھے۔
اگرچہ اس کا استعمال بول چال میں کم اور لاشعوری طور پر کیا جاتا ہے مگر پھر بھی بعض اوقات
ماضی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ ویسے عام طور پر پانی کے لئے پختو زبان میں "اوبہ" بولا جاتا ہے
جو فارسی زبان کے لفظ آب سے ماخوذ ہے۔

۱ ؛ الغرض ابتدا میں جب ان لوگوں نے اس وطن میں آکر سکونت اختیار کی تو بعض گاؤں جو پانی،
چشموں، ندیوں، نالوں کے قریب تھے، یا انہوں نے آباد کئے زم، کا نام دیا۔ مثلاً افغانستان
میں دریائے جیحون کے جنوبی کنارے پر زم کے نام سے ایک بڑا قصبہ ہے بلکہ پہلے شہر
آمل کا نام بھی زم تھا، اس کے ساتھ زمانہ وسطیٰ میں برائے تعارف اور قصبہ زم سے میز
کرنے کے لئے آمل کا نام لگایا جاتا تھا۔ کیوں کہ ابتدا میں آمل کا نام زم تھا تو اس شہر کو
آمل زم کہتے تھے، خیبر کے دامن میں زم کے نام سے ایک گاؤں بوجہ چشموں کے موسوم ہے۔
سکھوں نے جب یہاں قلعہ بنایا زم، قلعہ سے مشہور ہوا۔ پھر انگریزوں نے جب پختہ
سڑک پشاور سے خیبر تک بنائی تو سڑک کا نام اسی گاؤں کے نام جم روڈ اور کچھ عرصہ بعد
مخفف ہو کر جمرود ہوا اور اس گاؤں کو بھی جمرود پکارنے لگے۔ مگر مقامی لوگ اب بھی اس
کو حسب سابق، زم، ژم، سے یاد کرتے ہیں۔

۲ ؛ اور اس مذکورہ مقام سے بطرف شمال ورسک کے قریب بھی ایک گاؤں کا نام، خہ زم،
خزیم، تھا جس کا مطلب اچھا پانی ہے۔

۳ ؛ اشنغر ضلع پشاور میں نہر ابازئی کے کنارے بھی زم، کے نام کا ایک گاؤں موجود ہے
جہاں چشمے ہیں۔

۴ ؛ مواضعات نوانکلی واسوٹا، ضلع مردان کے درمیانی حد پر شوہ سڑک کے مشرق جانب ایک
نالہ ہے جس میں ہمیشہ پانی رہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ زمٹی، زیمی، کندہ یعنی پانی والا

نالہ سے موسوم ہے۔

۵ ؛ کرُم سے جانب جنوب گومل، زم، یعنی گومل کا پانی موسوم سے واضح ہو کہ ایک شہر گومل کے نام موصل کے علاقہ میں تھا۔

۶ ؛ تیز بارش جس میں ہوا پانی کو اندر مکان میں پہنچائے اس کو پشتو میں زم اور ژم بولتے ہیں۔ پشتو زبان سے یہ لفظ ہندی میں منتقل کیا گیا ہے جس کو رِم جِم بولتے ہیں۔

۷ ؛ اس وطن میں دو سخت موسم گرما و سرما، ہیں۔ جس کو پشتو میں اور سے (اوڑے) بہ معنی آگ یعنی گرم موسم اور نمے (ژمے) بہ معنی پانی والا یعنی ٹھنڈا موسم کہتے ہیں۔

۸ ؛ جب کوئی زمین میں کنواں کھودتے ہیں تو اوپر سے پوچھتے ہیں کہ زم ہے کہ نہیں۔ کنویں میں پانی ظاہر ہونے کے ساتھ نیچے کنویں سے کھودنے والا آواز دیتا ہے کہ زم زیادہ ہوا یعنی پانی مل گیا۔ اور بڑھ گیا۔ اور اسی طرح سیم والی زمین جس میں پانی کا اثر زیادہ ہوتا ہے اس زمین کو زمنہ، یا زمینہ یعنی پانی والا زمین کہتے ہیں۔

معلوم رہے کہ ہندی زبان میں پانی کو، جل، اور گوشت کو ماس، کہتے ہیں اور اس میں لفظ زم بھی نہیں۔

روایت ہے کہ بی بی ہاجرہ نے پانی کے دیکھنے کی خوشی میں زم، زم کہہ کر دیکھ رہی تھیں پانی بڑھنے اور بہنے لگا تو انہوں نے ہیبت سے آواز دی زاما، جو پشتو لفظ ہے یعنی جا و سمت ہلومت۔ یعنی ٹھہرے رہو۔ اور ساتھ ساتھ پانی کو روکنے کے لئے آگے پیرا تھا اور کچھ مٹی وغیرہ رکھ رہی تھیں۔ اللہ تعالی کے حکم سے ان کی آواز پہ پانی بہنے سے رک گیا اور اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ اگر یہ پانی آگے جانے سے نہ رکتا تو ایک ندی کی صورت میں بہہ جاتا۔

۹ ۔خوارزم کی وجہ تسمیہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اس میں لفظ، زم، کی تشریح بھی ہو چکی ہے کہ پشتو میں پانی کو کہتے ہیں اب صرف خَو یا خُوا اور غَخوا (غبنوا) بہ معنی گوشت ہے۔ خَو یا خُوا پشتو میں اُس گوشت کو کہتے ہیں جو بدن سے علیحدہ نہ ہو مثال کے طور پر خُوا خوگی یعنی خون اور گوشت اور

نسبی درد مندی۔ یعنی آپس میں ایک دوسرے کے غم کی سبب گوشت درد مند ہونا، خوا الہ م راشہ، میرے (بدن کے گوشت کے) قریب آؤ۔ خوا م یخہ شوہ، یعنی میرے بدن کا گوشت خوشی سے ٹھنڈا ہوا۔ خوا، تہہ م شہ نہ کیگی، یعنی دل (بدن کا گوشت) کو چاہت نہیں۔ خوانجے، یعنی ایسی عورت جو بدن کے گوشت کا بہترین ٹکڑا داماد کے حوالہ کرے۔ خور۔ بہن، خوگ۔ میٹھا، خولہ، منہ۔ یہ سب بدن کے گوشت اور خون اور اعضاء سے متعلق ہیں جو گوشت سے مرتب ہیں خوڑ، ندی نالہ جس کے پانی پینے کے علاوہ اناج بدن کے لئے پیدا کرانے کی سبب ہے۔

خوار، یعنی ناقص گوشت والے بے چربی اور صرف ہڈی ہی ہڈی یعنی آر بمعنی ناقص کے۔ نوروا، یعنی پکے ہوئے گوشت سے نکلا ہوا شوربا، خوریہ، رشتہ داری جو ہم نسبوں ہم گوشت و ہم بدن اور ہم نسل کے لئے بولا جاتا ہے۔ پختون خوا، کا مطلب اگر یہ لیا جائے تو زیادہ موزون و مناسب ہوگا کہ جہاں جہاں قوم پختون کے تن بدن خون اور ان کے گوشت پوست کا اثر موجود ہے۔ اور جہاں جہاں پختون کی مٹی، خاورہ، ہے وہی پختون قوم کے ملک اور مُلک ہے اور اسی سے نسبی تعلق کو تقویت ملتی ہے اور یہی چیز آپس میں ایک دوسرے کے لئے سبب خواخوگی اور خویکنی، و ہمدردی بن جاتا ہے۔

۱۰۔ ورشو بہ معنی چراگاہ جس کا اصل عبرانی ہے اور مخفف ہے، خوارشو کا اور شو مخفف ہے شارون کا شارون عبرانی میں عمدہ گھاس والے میدان یعنی چراگاہ کو کہتے ہیں اور خوار، بہ معنی دُبلا اور زندہ گوشت والے جس سے مراد کمزور جانور ہے۔ لہذا خوارشو جانوروں کی چراگاہ۔ اور خوارشو کا مخفف ورشو بنا اور زبان پختو میں عام طور پر استعمال ہونے لگا۔ مطلب یہ ہوا کہ بھوکے دبلے جانور چراگاہ میں گھاس کھا کھا کر گوشت پکڑ کر موٹے ہو جاتے ہیں اور جانوروں کے تن بدن اچھے تگڑے اور گوشت والے بن جاتے ہیں لہذا ورشو، یعنی جانوروں کی چراگاہ والا میدان عبرانی سے ماخوذ ہے بائبل اور تاریخ شام سے واضح ہے کہ شارون نامی فالتو جانوروں کی شام میں ایک چراگاہ تھی۔ غنبوا غخوا یعنی (گوشت) بدن سے علیحدہ گوشت کو عام استعمال غخوہ، کہتے ہیں اور کھانے کھلانے پکانے

ہیں یہی نام استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ لفظ "غ" کا آگے لگانا گوشت کے دونوں قسموں کی تقسیم اور شناخت کے لیے ہے۔ یعنی جو بدن کا حصہ ہو تو غوَ اور بدن سے الگ ہو کر غخوَ (غبنوَ) گوشت بولا جاتا ہے۔ لفظ غ آگے لگانے کی وجہ یہ ہے کہ پشتو زبان میں لفظ غس جدا کرنے یا کاٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً غُسہ غوَ۔ کاٹا ہوا گوشت۔ اس طرح لفظ غُس کے حرفِ س، نکلنے سے مخفف ہو کر، غخوَ، غبنوَا۔ بن گیا۔ اور عرصہ دراز گزرنے پر تلفظ میں میں فرق آکر اس وقت بعض لوگ اپنے استعمال میں غبنہ غوَخہ بھی بولتے ہیں۔

لفظ غوَ فارسی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ حرف ہ لگایا جاتا ہے مثلاً خواہی۔ خواہش۔ خواہست (خواست) جس کے معنی مانگنے اور چاہت کے ہیں مگر اصل میں یہ مانگ اور چاہت تو بدن ہی کرتا ہے۔ لہذا اس میں وہ پشتو زبان والا اشارہ بدنی بھی موجود ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ پختو سے فارسی میں منتقل ہوئے ہیں۔

فارسی میں اس قسم کے الفاظ بکثرت ہیں جن کے ماخذ آرامی یا عبرانی زبانیں معلوم ہوتے ہیں جیساکہ، فردوس (باغیچہ) جلاد (جلعاد عبرانی ہے معنی سخت آدمی) شیر، نہر وغیرہ، وجہ یہ کہ اسرائیلی جلاوطنوں نے ایران میں سینکڑوں برس گزارے ہیں لہذا آپس میں الفاظ کا تبادلہ ضرور ہوا ہوگا۔ پختو زبان میں فارسی اور فارسی زبان میں پختو کے الفاظ بکثرت ہیں۔ چونکہ فارسی بھی ایک مہذب زبان ہے اس نے بھی اپنی جھولی عبرانی کے زرین الفاظ سے بھر لی ہوگی ثبوت کے لئے ایک لبنانی مورخ فلپ کے حتی تاریخ شام کا بیان کافی ہوگا۔

"عبرانی اگرچہ مرگئی تھی لیکن اس نے بہت سی مہذب زبانوں کے لئے الفاظ کی ایک قیمتی میراث چھوڑ دی۔"

اور آگے مزید تشریح کر کے لکھتا ہے۔

"آرامی زبان سامی بولیوں میں سے ایک تھی۔ اور آرامی تاجروں نے اسے ابتدا ہی سے دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ آرامی زبان ابتدا میں شامیوں کی تجارتی زبان تھی ۵۰۰

ق م کے آس پاس یہ پورے ہلال زرخیز میں صرف تجارت، حضارت اور سرکاری کاروبار ہی کی زبان نہ رہی، بلکہ باشندوں کی عام بولی بن گئی اور اس نے اپنی تمام ہمسر زبانوں پر، جن میں عبرانی بھی شامل تھی فتح کامل حاصل کر لی یہاں تک کے حضرت عیسیٰ اور ان کی قوم (یہودیوں) کی زبان یہی تھی اور آرامی زبان کا نفوذ صرف سامی حلقے تک محدود نہ رہا۔ دارائے اعظم (ایران) (۵۲۱ ق م تا ۴۸۶ ق م) کے ماتحت آرامی زبان، حکومت ایران کے صوبوں کے درمیان روابط کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس طرح سکندر کی آمد تک یہ زبان ہندوستان و حبشہ کے درمیانی علاقے کی ایسی بولی بن گئی، جو ہر جگہ بولی جاتی اور سمجھی جاتی تھی۔ شمالی عرب کے باشندوں نے بھی اپنی ابجد آرامی ہی سے لی تھی۔ اسی طرح آرمینیوں، ایرانیوں، اور ہندوستانیوں نے آرامی سرچشمے ہی سے فائدہ اٹھا کر اپنی ابجدیں ایجاد کیں۔ پہلوی (فارسی) اور سنسکرت دونوں زبانوں کے حروف اصلاً آرامی ہیں۔"

آگے لکھتا ہے۔

"جلاوطنوں میں سے جو (یہودی)، لوگ خوشحال تھے، انہوں نے مملکت ایران میں ٹھہرے رہنے کو ترجیح دی اور اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ (ایران میں) اس عہد کی کاروباری دستاویزوں میں بہت سے عبرانی نام ملتے ہیں۔"

تاریخ لبنان میں درج ہے کہ۔

"ایرانی سلطنت کی بنیاد سائرس (۵۰۰ ق م) نے رکھی تھی۔ اس کے بیٹے کیم بی سس (کمبوجیہ، کیقباد) اور برادر زادے دارا نے سلطنت کو اتنا وسیع کر دیا کہ ہندوکش اور دریائے سندھ کے پار سے بحیرہ ایجہ (ستلج) تک اور قفقاز سے بحر ہند تک پھیل گئی۔ تاریخ میں پہلی بار یہ وسیع علاقہ ایک مرکزی سیاسی نظام کے تابع آیا اور یہ نہایت محکم نظام تھا۔ سلطنت کے دور افتادہ حصے سڑکوں کے نئے نظام نے ملا دیئے

اور شاہی قاصدوں کی جا بجا قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ تمام مقامات میں ایک سکہ رائج ہو گیا۔ آرامی زبان اتنی پھیل گئی کہ پوری سلطنت کی عام زبان بن گئی۔

آگے لکھتا ہے۔

"اس عہد کی دو بڑی تہذیبوں سامی، اور ہندی و ایرانی کو امتزاج نہیں تو ایک کو دوسری پر اثر و نشار کا موقع ضرور مل گیا۔"

ہندی اور سنسکرت میں جو نام عام ہیں۔ مثلاً سورما، کانشی، رام، شری، پال وغیرہ وہ اکثر سامی آرامی اور عبرانی الاصل ہیں۔

یہ بہت معتبر اور چیدہ نام ہندوؤں نے ان جلاوطن اسرائیلیوں سے اُس وقت اپنائے تھے جب وہ اُن مشرقی علاقوں میں بسائے گئے، جیساکہ مثلاً تھوڑا عرصہ ہوا کہ سکھوں نے لفظ، سردار، افغانوں سے چھین لیا ہے۔ اِس کی تشریح سے کہ کیوں، کیسے اور کب معذرت چاہتا ہوں۔

سورما یہ نام جنگجو اور بہادروں کے لئے ہے اور سور کا جمع سورما ہے سور نام کا بنی اسرائیل میں ایک قبیلہ بھی تھا کتاب مقدس نحمیا میں بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کے سلسلہ میں بیان ہے کہ۔

"نحمیا بن عزبوق نے جو بیت سور کے آدھے حلقہ کا سردار تھا اس نے داؤد کے قبروں کے سامنے کی جگہ اور اس حوض تک جو بنایا گیا تھا اور سورماؤں کے گھروں تک مرمت کی۔"

باب گنتی میں پھر ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"شمعون کے قبیلہ کے لشکر کا سردار سوری شدی کا بیٹا سلومی ایل تھا۔"

ابن خلدون لکھتا ہے۔

"یوآب حضرت داؤد کا بھانجا تھا اور وہ داؤد اور سلیمان کے وزیر اور کماندار

بھی تھے وہ "سوریا" کے نام سے مشہور تھا۔"

عبرانی میں سور بہ معنی چٹان کے بھی ہے۔ یعنی پہاڑ کی جیسا مضبوط مرد۔ یعنی لقبی نام بھی تھے اور نسبی بھی جیسا کہ کتاب مقدس کے باب تواریخ میں درج ہے کہ "جبعون (اگاؤں) میں جبعون کا باپ یعنی ایل، رہتا تھا جس کی بیوی کا نام معکہ تھا اور اس کا پہلوٹھا بیٹا عبدون اور دوسرے کا نام سور اور قیس اور بعل اور نیر وندب وغیرہ۔"

پختو زبان میں سورے (سایہ) سرپرست کے لئے ہے یعنی فلاں ہمارے آبرو اور سروں کا سایہ ہے اور سور گھوڑ سوار کے لئے بھی ہے۔ یعنی دونوں جگہ طاقت مراد ہے یعنی سور بہ معنی زبردست اور سرپرست اور طاقتور کے بھی ہے۔

✱ مثال کے طور پر ایک انگریز نے جو پشاور کا پہلا لارڈ تھا، مقرب خان بن فتح خان خلادخیل یوسف زئی سے موضع باجا میں طنزاً پوچھا کہ تیرے پاس ایک ہزار سور (گھوڑ سوار) ہوں گے، مقرب خان نے انگریز کو سخت گالی دے کر کہا اگر میرے پاس اتنے سور (گھوڑ سوار) ہوتے تو تم لوگ یہاں قدم کیوں جماتے ✱

کانسی سے ? کانشی، کاشی، کاسی، کوشی، ایک ہی نام ہے۔ اور اسی نام کا بنی اسرائیل میں ایک قبیلہ تھا۔ جیسا کہ اکثر کتابوں میں ذکر ہے کہ حضرت سلیمان کے بعد سلطنت دو ٹکڑے ہو کر ایک حصہ سلطنت اسرائیلیہ اور دوسرا حصہ سلطنت یہودا کہلانے لگی۔

سلطنت اسرائیلیہ کا پہلا بادشاہ یربعام کو نامزد کیا گیا اور اس کے بعد کاسی کوشی، قبیلہ کے سردار مسمی زارح کو بادشاہ بنایا گیا یہ بڑا جابر بادشاہ تھا بقول تواریخ بمبر۲ کتاب مقدس، لاکھوں کی تعداد میں فوج رکھتا تھا یہی قبیلہ کاسی، کوشی، افغانستان اور کوئٹہ بلوچستان میں بکثرت آباد ہے اور اس کے نام سے کاشغر اور کش کسی غیر موسوم ہیں

ابتدا میں یہ لوگ کاشغر اور کشمیر تک پہنچ چکے تھے۔

کاشی، کوشی کے متعلق کتاب مقدس (توریت) میں ان کا کئی دفعہ ذکر ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو یرمیاہ باب ۲۶۔ باب ۳۸۔ باب ۳۹۔ باب ۴۶ اور ناحوم باب ا۔ اور صنفیاہ باب ا۔ اور فتوح البلدان کے مصنف امام بلاذری نے السامرہ کا حال بیان کرتے ہوئے یہودیوں کے ایک قبیلہ کو "کوشان" کہا ہے۔

رام:۔ عبرانی ہے کتاب مقدس کے باب تواریخ میں تحریر ہے۔

"حصرون بن فارس بن عیر بن یہودا بن یعقوب کے بیٹے کا نام رام، تھا اور رام کے آٹھویں پشت میں داؤدؑ ہے جس کا شجرہ نسب یوں ہے۔ داؤدؑ بن یسیٰ بن عبید بن بوعز بن سلمون بن نحسون بن عمیناداب بن رام بن حصرون۔ اور رام، کے دوسرے چھوٹے بھائی کا نام کالب (کلوبی) تھا اور کالب بن حصرون کی زوجہ مسماۃ "افراتہ"، تھی جو بہت عقلمند اور نامور ہستی تھی اور اس کا ایک ہی پہلوٹھا بیٹا جس کا نام حور تھا"

میری تحقیق کے مطابق اپنی والدہ افراتہ کے نام اُس کی اولاد افریتے مشہور ہوئی لکھنے والے افریدے بھی لکھتے ہیں جو افغانوں کا ایک مشہور بہادر قبیلہ ہے۔

رام کے بڑے بھائی کا نام یرحمیل تھا۔ اور اُس یرحمیل بن حصرون کے بیٹے کا نام بھی رام تھا۔ بعد میں سلطنت اسرائیلیہ کے بادشاہ کا نام یہورام تھا اور اسی زمانے میں یہودا کا بادشاہ بھی یہی نام یعنی یہورام رکھتا تھا بنی اسرائیل میں رام نام اور بھی ہیں۔ مورخ تاریخ شام لکھتا ہے۔

"رام"، یہ نام سب سے پہلے "نارام سن تقریباً ۲۳۰۰ ق م جنگجوؤں کے لئے شام میں استعمال ہوا۔ اور نارام سن، قدیم اکادی سامی حکمران خاندان سے تھا"

شار:۔ شاری، شری۔ شار سے ماخوذ ہے۔ شار بہ معنی زبردست محافظ، بے قابو، اونچا تیز، طاقتور، اعلیٰ، امیر، دارالحکومت، جو سامیوں کے ہاں ملک و شام دا لجزیرہ میں استعمال

ہوتا تھا۔ اور یہ لفظ ''شار'' سامی الاصل ہے۔ طالوت کا ایک لقبی نام ''شارول'' (شارول) بھی تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد جب حکومت دو ٹکڑے ہوئی تو دس قبائل نے اپنے سلطنت اسرائیلیہ کی دارالحکومت کا نام شارون (شورون) رکھا تھا جیسا کہ ابن خلدون لکھتا ہے۔

''انہیں لوگوں (اشوریوں) نے اسباط عشرہ کے مشہور شہر شورون جس کو اب سامرہ کہتے ہیں لے لیا تھا اور اسباط عشرہ (اسرائیلیہ کے دس قبائل) کو شورون سے نکال کر اطراف اصفہان اور خراسان کی جانب جلا وطن کر دیا۔''

کتاب مقدس کے باب تواریخ میں ایک اسرائیلی قبیلہ کی سکونت کے بارے میں درج ہے ''شارون کی ساری نواحی میں جہاں تک ان کی حد تھی۔ بسے ہوئے تھے۔''

شارون نام شام میں حضرت داؤد کے وقت ایک ایسے سرسبز میدان کو چراگاہ کے طور پر نامزد ہوا تھا جس میں سرکاری گائے بیل اور گھوڑے چرتے تھے اور اس کا نگران مسمی سطری، شارونی تھا یعنی نگران کو شارونی کہتے تھے جو حضرت داؤد بادشاہ کے گھوڑوں پر چراگاہ میں مقرر تھا۔

نیونیدس (نابونیدس) شاہ بابل بخت نصر کے بیٹے کو شار کہتے تھے وہ عام طور پر صحرائے عرب کے ایک سرسبز مقام تیما میں محل بنا کر رہتا تھا۔ اس کو وہاں کے اسرائیل اور عرب شار التیما کہتے تھے۔ غلام رسول مہر لفظ شار کے متعلق لکھتے ہیں کہ

'' اس کا اصل سامی زبان اکادی ہے قدیم زمانہ میں بادشاہ کو دعا کے لئے بولا جاتا تھا۔ بیل شار یوسو یعنی معبود (خدا) بادشاہ کا محافظ ہو'' (حاشیہ تاریخ شام ص۱۷۷)

قدیم بابلی سامی اکادی الفاظ دوبارہ غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا

کہ یہ صرف پشتو الفاظ ہیں۔ البتہ لفظ بہ اب سے کچھ زمانہ پہلے، ایل سے قبل استعمال ہوتا تھا اب ایل کے بعد اور دوم بر کی جگہ د بولا جاتا ہے۔

بئیل شار لوِ سُو، یعنی خدا بادشاہ کا حافظ ہو۔ ایل بمعنی اللہ اور شار بمعنی بادشاہ لوِ بمعنی لپائی اور سُو، شو بمعنی ہو جائے مطلب یہ ہوا کہ اللہ پاک دِ دَ بادشاہ لوِ (لیٹو) شی یعنی حافظ شی افغانوں کے ہاں مکان کی چھت یا گھاس بھوسا وغیرہ محفوظ کرنا مقصد ہو تو اسے لوِ یعنی لپائی دے کر بارش کے پانی سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح پشتو میں نخاس، بمعنی بدشکل، عبرانی ہے اور بالغ، سریانی ہے بن آدم یا بنیادم عام پشتو لفظ جس کی اصل عبرانی ہے بن بمعنی بیٹا اور آدم کے معنی انسان یا البشر کے ہیں۔ لہذا بنؔ اور آدم دونوں لفظ عبرانی ہیں بن کے لئے تاریخ شام صفحہ ۱۳۱ میں حاشیہ غلام رسول مہر اور آدم کے لئے اعلام القرآن مصنف عبدالماجد دریا بادی صفحہ ۸ پر لکھے ہیں۔ اور لفظ ملک بادشاہ کے لئے سامی لفظ ہے اور قوم کے سردار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے زبانِ پشتو میں یہ سب انہی معنوں میں ہیں۔

مورخ تاریخ شام لکھتا ہے کہ :۔

"شام میں آرامی نبطیوں کے تمام دیوتاؤں میں سب سے بڑا بت دوشارہ تھا یہ دراصل سورج دیوتا تھا جس کی پرستش پتھر کی بلند لاٹ یا ان گھڑ چار گوشہ سیاہ پتھر کی شکل کی جاتی تھی"۔

"شار" کے بارے میں جغرافیہ خلافت مشرق میں لکھا ہے کہ :۔

"بادغیس کے مشرق میں دریائے مرغاب کے سرچشموں کے قریب وہ پہاڑی علاقہ ہے جس کو شروع زمانہ کے عرب جغرافیہ نویسوں نے غرج الشار لکھا ہے ان پہاڑوں کے حکمران کا لقب شار تھا اور غرج کی نسبت مقدسی نے لکھا ہے کہ وہاں کی بولی میں پہاڑ کو کہتے ہیں زمانہ وسطیٰ کے آخری دور میں یہ علاقہ عام طور غرجستان کہلانے لگا۔ اس ملک کا حکمران یعنی شار کا قیام گاہ پہاڑوں

میں ایک بڑا گاؤں بالی کان میں تھا۔،،

لہٰذا قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں افغان قبیلہ کے غر غشت آباد تھے اور انکے ساتھ کچھ دوسرے افغان قبائل بھی رہتے تھے اور ان کی زبان پختو تھی جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ ان کی زبان میں غر پہاڑ کو کہتے ہیں اور یہ لفظ، غر، سامی زبان کا نام ہے' اور اس کی شہادت موجود ہے کہ ملک شام میں ایک ایسے مقام کا ذکر تاریخ شام نے کیا ہے کہ۔

،، شمالی شام میں انطاکیہ شہر کے جنوب میں ایک بڑا پہاڑ (سرسبز) کا نام "الوغر، تھا،، معلوم ہوتا ہے کہ الوایک شخص سردارِ قبیلہ یا شارِ قبیلہ تھا اور غر اُن کی زبان میں پہاڑ کو کہتے تھے لہٰذا الوغر مشہور ہوا۔ الوغر کے متعلق مزید لکھتے ہیں:۔

،، یہاں ایک غار میں مدہم سی روشنی صدیوں سے نظر آتی ہے، جسے مقامی لوگ ایک ولی کی یادگار میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یونانی اپنی زبان میں اس پہاڑ کو سپلیوس کہتے تھے،،

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سڑابنی افغانوں کے دونوں مورثان اعلیٰ شارخبون (شرخبون) اور خارشبون (خورشبون) کے نام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ شہر کو پشتو میں خار، شار، ښار کہتے ہیں وجہ یہ کہ درحقیقت وہ بھی چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبوں کے بادشاہ اور مرکز ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں شارپ بمعنی تیز اور شارک بمعنی ایک خطرناک اور طاقتور مچھلی کے ہیں جو شار سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔

شار کے متعلق پٹہ خزانہ میں تحریر ہے کہ:۔

،، سلطان محمود غزنوی نے جب غور کے امیر محمود سوری پر حملہ کیا اور سخت جنگ کے بعد قلعہ آہنگراں میں اسے محصور کیا تو غیرت کے سبب محمد سوری قید اور گرفتاری کو برداشت نہ کرتے ہوئے فوت ہوئے۔ شیخ اسعد سے جو اس وقت جنگ میں شامل

تھا محمد سوری کے وفات پر پشتو میں ساندے (مرثیہ) یوں بولتا ہے۔

نہ لہ غرچہ بیا راحیٔ کاروان دَ مشکو

نہ را دردمی غورتہ بیا جوپي دَ شار

ترجمہ:۔ پہاڑوں سے پھر مشک و عنبر کے لدے ہوئے قافلے نہیں آئیں گے اور نہ غور میں دور دراز کے امراء اور بادشاہان جوق در جوق آئیں گے۔

شاربیل۔ پشتو زبان میں جمے ہوئے دودھ یعنی دہی سے شار مکھن اور لسی کو الگ الگ کرنے کے عمل کو شاربیل کہتے ہیں۔ آب شار بھی اس سے ماخوذ ہے۔ پشتو میں شاڑہ (شارہ) اس زمین کا نام ہے جو لوگوں کے عمل کاشتکاری سے بےقابو اور سخت ہوں۔ اور اسی طرح شَڑونکی شوی (شارونکی شوی) کا معنی و مطلب پشتو زبان میں ایک ایسے گروہ سے ہے کہ کسی زبردست طاقت (شار) نے اس کو اپنے گھروں اور وطن سے نکالا ہو یعنی جلاوطن کر دیا ہو۔

یوسف زئی جب مالاکنڈ عبور کر کے سوات میں فتح یاب داخل ہوا تو ایک میدان ڈاگہ میں ڈیرہ ڈال کر اس جگہ کا (خار) نام رکھا یعنی مرکزی جگہ، یہ نام تہ لانی زئی میں اب تک موسوم اور موجود ایک گاؤں ہے اور اسی طرح باجوڑ میں بھی ہوا۔ حالانکہ اُس وقت دونوں جگہ آبادی نہ تھی لیکن انہوں نے مرکزی حیثیت بنانے کے لئے انہی ناموں سے موسوم کیا یہ نام خار اب تک بطور یادگار موجود ہیں۔ حالانکہ ابھی تک یہ شہر نہیں ہیں بلکہ چھوٹے گاؤں ہیں لہذا یہاں یہ نام مرکزی مقام کے لئے استعمال ہوا تھا اور انہی مقامات سے انہوں نے سالا ٹنک، سوات اور علاقہ دیر و باجوڑ وغیرہ فتح کئے تھے۔

افغانستان میں شہر شار یا سار یہ۔ تیسری صدی ہجری کے خاندان طاہریہ کی طرف سے جو حاکم آتا تھا۔ وہ اکثر ساریہ (شاریہ) میں رہا کرتا تھا صوبہ طبرستان کا دوسرا اور شہر آمل سے پیشتر کا دارالحکومت شاریہ تھا جو آج کل ساری (شاری) کہلاتا ہے اور شہر آمل کے مشرق میں واقع تھا زمانہ بعد میں ساریہ کا حال بہت کم بیان ہوا ہے۔ مغلوں کی یورش سے وہاں

ہو چکا تھا۔ مختصر یہ کہ مذکورہ شار وغیرہ نام پختو، اکادی، عبرانی اور سامی الاصل ہیں۔ افغان ماں جب بچے کو سلانے کی لوری دیتی ہے تو وہ یہودیوں کی خوشی کا نعرہ جو ''ھَلّلُویَاَ'' ہے جس کے معنی اللہ بڑا کے ہیں وہ ''ھَلِی لَلُو'' کر کے کہتی ہے۔ ھَلِی لَلُو، گویا، ھَلّلُویَا کا مخفف ہے۔ آرام بِستَر یا بومے بِستَر سے ماخوذ ہے لفظ پشتو بوڑہ جو اُس ماں کو کہتے ہیں جس کا بچہ مر جائے۔ اور اِسی طرح تَلِ بِتر سے ترِبوڑ، اُوْر۔ روشن آگ، تُوراَ۔ تلوار کی کاٹی، ترنگ، کڑدا، گورن گریوان یا گریبان، دیشنغ، پتیری روٹی، کول عبرانی لفظ بمعنی نسل۔ پشتو میں اب بھی نوے کول یعنی نئی نسل، اور گھر میں با اختیار بچوں کی بڑی اماں کو کچھ عرصہ قبل پختون خوامیں اکثر ''کُولیٔ'' سے یاد کی جاتی تھی جو نسلی سرچشمہ ہے۔ اور جن سے رشتہ طے ہو جائے اسی گھر والوں کو کولہ یا کالہ کور'' اور رشتہ داروں کے ساتھ ''کلے کلو یغی'' بمعنی رشتہ داری پالنا اور تعلق قائم رکھنا۔ کولدن یا کوزدن بمعنی منگنی جس سے نسلی بندن ہو جاتی ہے۔ بھی لفظِ ''کول'' سے ماخوذ ہے۔ کلے یا کالونی بمعنی گاؤں بھی لفظ کول سے ماخوذ ہے کیونکہ گاؤں میں انسانی نسل کے لوگ آباد رہتے ہیں۔ عبرانی میں ''کور'' بمعنی گھر کی پردہ وال اور پشتو میں بمعنی گھر چونکہ گھر نسلِ انسانی کی رہائش اور پناہ گاہ ہوتا ہے۔ بھی لفظِ ''کول یا کور'' سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح یہوہ بمعنی ایک اور اللہ اب آگے پختو کے چند الفاظ جس کا ماخذ عبرانی ہے لے۔ مشت نمونہ خروار۔

اردو	پشتو	عبرانی	اردو	پشتو	عبرانی
غرارے	غرغرے	گرگر	نہانا	لامبل	لیمبتیا
محفوظ	سنبال	سبال	زکام	نزلہ	نزلت
ابالنا	یشول	مبوشل	چاول	اوریژہ	آورز
کس وقت	کما زمان	کما زمان	کاجر	گازرہ	گازر
محور	گرزنے	گرزن	کتاب	سفارہ	سفر
معلوم کرنا	درک	درک	تھانہ	تھان	تھانت
کیا تو (؟)	آتہ	آتہ	کو	لہ	لے
چٹائی/بچھونا	میزرے	مزران	جلدی آؤ	تیز درازئی	تیز درزئی

* Hebrew For Travellers, Published by Berlitz SA, Lausanne, Switzerland. (Editions 1973)

شمال

نقشہ بمطابق کتابِ مقدس۔ باب یوشع نبی

فلسطین اور شام
عہد قضاۃ میں
بنی اسرائیل

صیدا
لبنان
صفین
حماۃ
رصافہ
تدمر
دان
صور
بطین
نفتالی
منسی بن یوسف
بحیرۂ روم
عکہ
حیفہ
زبولون
اشکار
بشان
بثانیا
قراقرم
ام الجمال
دور
مجدو
منسی بن یوسف
جد
قیساریہ
تل ابیب
یافا
لد
افرائیم بن یوسف
عمون
اریحا
شرق اردن
اردن
دان
بنیامین
اشدود
یروشلم
بیت شمس
بیت لحم
عسقلان
ربون
یہوداہ
جرون
غزہ
العریش
علاقہ موآب
بیرسبع
فرما
شمعون
کرک
قاہرہ
مصر
سویز
ادوم
یعنی
اولادِ عیسو بن اسحاقؑ
وادی موسیٰ
عقبہ
جزیرہ نمائے سینا
تبوک
مقنا

یہ نقشہ پیمانے کے مطابق نہیں۔ صرف مقامات کی نشاندہی اور سمتوں کا اشارہ مقصود ہے۔

سامی الاصل قبائلی و علاقائی نام

گدعون و گدون یا جدون ایک ہی نام ہے جو مخفف ہے گدعون اور جدعون سے، جو ایک افغان قبیلہ کے مورث اعلیٰ کا عبرانی نام ہے۔ جو بنیامین اسرائیلی قبیلہ سے تھا۔ مورخ تاریخ شام ملک طالوت سے قبل زمانہ کے متعلق لکھتا ہے۔

"اس مدت کو عام طور دور قضاۃ کہا جاتا ہے یہ قاضی (جج) دراصل قومی ہیرو اور حکمران تھے، جو ضرورت کے وقت خود بخود بروئے کار آگئے۔ اور انہوں نے ہمسایہ دشمنوں یا بیرونی جابروں کے مقابلے میں قومی گروہوں کی قیادت کا فرض انجام دیا۔ قاضیوں میں ایک اسرائیلی خاتون بھی شامل تھی جس کا نام دلورہ تھا اس نے برق (برک) کی معیت میں چھ قبیلوں کی قیادت کی۔ اور شمالی سمت میں کنعانیوں کا مقابلہ کر کے آخری فتح حاصل کی۔ اس طرح جدعون نے ۳۰۰ رفیقوں کے ساتھ مدیانیوں کو سخت شکست دی۔ ان قضاۃ میں سب سے زیادہ شہرت سمسون کو حاصل ہوئی۔ سمسون نے فلسطینیوں کو شکست دی۔ عبرانیوں کو جن حریفوں سے سابقہ پڑا ان میں سے فلسطینی، سب سے زیادہ خوفناک تھے۔"

کتاب مقدس کے باب گنتی میں ذکر ہے۔

"جدعونی کے بیٹے ابدان بنیامین قبیلہ کا سردار تھا۔"

برکی:۔ برکی افغانوں کا ایک قبیلہ ہے جس کا مورث اعلیٰ برق یا برک تھا۔ ذکر ہو چکا ہے اولاد برک نے ایک گاؤں بھی بسایا تھا جس کا نام برکی تھا۔ جس کا بعد میں ذکر آئے گا۔

بٹنی:۔ بٹنی یا بطانی ایک ہی نام ہے۔ یہ بھی افغانوں کا ایک بڑا قبیلہ ہے۔ انکی نسبت بتھانیہ، بطانیہ شہر سے ہے۔ جو دریائے اردن کے شمال میں مشرق کی طرف

اس چھوٹے دریا کے کنارے کے اوپر سرے پر واقع تھا جو مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے اور دریائے اردن میں گرتا ہے یہ حوران کے جنوب میں تھا اور بتھانیہ یا بطانیہ کا شہر علاقہ بشان (بسن) کا مرکزی مقام تھا اور ابتدا میں عوج کافر جس کا مقابلہ حضرت موسیٰ سے ہوا تھا۔ اور شکست کھائی تھی اس علاقہ کا بادشاہ تھا۔ اور تقسیم کے وقت یہ علاقہ منسی بن یوسف کی اولاد کے حصہ میں آیا تھا۔ اور ان کے جنوب میں روبن بن یعقوبؑ کی اولاد اور شمال میں دان بن یعقوبؑ کی اولاد حصہ دار و مالکان اور رہائش پذیر تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی لوگ جلاوطنی کے بعد اس وادی اور شہر کی نسبت سے بطانی، بتنی، بٹنی، مشہور ہوئے۔ اور بعد میں افغانوں کا دوسرا بنیادی گروہ بھی تصور ہوا۔ مذکورہ شہر کی املا تاریخ شام نے بتھانیہ اور تاریخ لبنان نے بطانیہ سے کیا ہے۔

لودی :۔ لودی قبیلہ کے مورث اعلیٰ لُود تھا جس کا ذکر کتاب مقدس کے باب عزرا میں بابل سے واپس شدہ قیدیوں کے ضمن میں آیا ہے کہ وہ "لُود، حادید، اور اونو، کی اولاد (جو بابل سے واپس ہوئی) سات سو پچیس نفر تھے"۔ اور یہ بھی تذکرہ موجود ہے کہ لود کی نسل یعنی لودیوں نے دریائے اردن کے مغربی کنارے لُود یا لُدشہر بھی آباد کیا تھا جو اب بھی اسی نام سے موجود ہے۔ لودی لُد شہر یعنی مسکن اور لُود مورث اعلیٰ دونوں کی نسبت سے ہے کتاب مقدس (توریت) یرمیاہ باب ۲۶ لم میں درج ہے کہ۔

"گھوڑے برانگیختہ ہوں۔ رتھ ہوا ہو جائیں اور کوش و فوط کے بہادر جو سپر بردار ہیں اور لودی جو کمان کشی اور تیر اندازی میں ماہر ہیں (جنگ کے لئے) نکل جائیں۔

شلمانی اور بسود :۔ دونوں افغان قبیلوں کی نسبت شمالی شام کے ایک علاقے کی طرف ہے۔ شلمان، لبنان کے قریب ایک پہاڑ اور کچھ علاقہ تھا۔ اس بارے میں تاریخ شام کا بیان ہے۔

"بنو بحتر آس پاس کے کچھ علاقے پر جاگیرداروں کے حیثیت میں قابض رہے اور ان کی جاگیریں، شلمان، عیناب اور بسود، جیسے مقامات تھے جن کا ذکر تاریخ میں

کبھی نہیں آیا اور اب تک موجود ہیں۔"

خراسان میں یہی جلاوطن شلمان اور بیسود نام ساتھ لائے تھے جو اب بھی موجود ہیں۔ اور انہی ناموں یعنی بیسود اور شلمانی سے یاد کئے جاتے ہیں۔

صافی:۔ صافی افغان قبیلہ کی نسبت الجزیرہ شام کے موضع صافیہ کی طرف ہے۔

جغرافیہ خلافت مشرقی میں ہے کہ:۔

"دجلہ کے کنارے الصافیہ کا قصبہ تھا جس کی نسبت یعقوبی لکھتا ہے کہ وہ قصبہ اس کے زمانے میں بالکل برباد ہو چکا تھا۔"

جلاوطنی کے بعد ان لوگوں نے مشرق کی طرف تبریز کے جنوب میں مراغہ کے ایک دریا کے کنارے سکونت اختیار کی جو بعد میں دریائے صافی کے نام سے مشہور ہوا وہاں کافی عرصہ گزارنے کے بعد دوبارہ ہجرت کر کے خراسان کو آنا معلوم ہوتا ہے۔

فرملی:۔ ان کی نسبت فرما نامی قصبہ سے تھی جو فلسطین میں غزہ والعریش کے علاقہ میں بحیرہ روم کے کنارے واقع تھا اور جب وہاں کے کچھ باشندے جلاوطن ہو کر خراسان آئے اور ایک دریا کے کنارے آباد ہوئے تو وہ دریا انہیں کے نام سے دریائے فرمل موسوم ہوا۔ فرما گاؤں کا نام اور ایل عبرانی میں بمعنی خدا ہے۔ ایل لفظ ساتھ لگانا ایک طریقہ تھا۔ جس سے فرما ایل اور بعد میں مخفف ہو کر فرمل اور اب افغانستان میں دریائے فرمل کے علاقہ میں آباد لوگوں کو فرملی کہتے ہیں جو افغانوں کا ایک قبیلہ ہے

متنی:۔ افغان قبیلہ ہے ان کی نسبت شام کے علاقہ حوران میں المتن (متن) کے نام سے ایک وادی اور قصبہ تھا جس سے انکی نسبت ہے۔

ترین:۔ شام کے بعد ایران میں۔ اور ان کے قدیم نشانات

ترین:۔ یہ افغانوں کا ایک بڑا مشہور قبیلہ ہے۔ قرائن سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ پہلے شام کے شمالی علاقہ (تیرا) میں آباد تھے۔ وہاں سے جلاوطنی کے بعد ایران میں بسلئے

گئے تھے اور ایران میں ساسانیوں کے انقلاب سے مشرق کی طرف پہاڑوں میں آباد ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ کے حوالہ سے جغرافیہ خلافت مشرقی کا بیان ہے کہ۔

"(شمالی شام) منیتشا کے شمال میں امیرایدین کا علاقہ تھا۔ اس علاقہ کا پایۂ تخت تیرہ، تیرا، تھا، ابن بطوطہ جو امیرایدین سے ملا تھا، کہتا ہے کہ تیرہ (تیرا) ایک عمدہ شہر ہے جس میں متعدد باغ اور بہت سی نہریں ہیں۔ شہر برکی میں سے بھی اس کا گذر ہوا تھا جو تیرہ (تیرا) سے شمال میں ایک منزل پر ہے یہاں کے عظیم الشان درختوں کی اس نے بہت تعریف کی ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلہ پر بطرف مشرق دریائے سائغری کے سرچشموں کے نواحی میں حصن الیہود (یہودیوں کا قلعہ) اور قصبہ السند کا بھی ذکر کیا ہے۔ شہر افسوس (اف سوس) جو یہاں کے ساحل پر ہے اس سے عرب جغرافیہ نویس خوب واقف تھے۔ اور یہ اس شہر کو افسوس البسوس (سوس) کہتے تھے۔ یہ شہر اس وجہ سے مشہور تھا کہ یہاں سات اصحاب کا غار یا کہف تھا"

آگے لکھتا ہے۔

"ایران میں نہر تیرایا تیرین کا شہر اس نام کی ایک نہر یا دریا پر آباد تھا معلوم ہوتا ہے کہ دریائے کرخہ (دریائے سوس) کے آخری حصہ کا ایک معاون تھا، جو دریائے کرخہ (سوس) میں اس کی دائیں جانب سے شامل ہوا تھا تیرا کا شہر یقیناً حویزہ ہی کے علاقہ میں واقع ہوگا یہ شہر اھواز کے مغرب میں ایک دن کی مسافت پر اس سڑک پر واقع تھا۔ جو اھواز سے واسط کو جاتی ہے بصنا کے پردے، قرقوت کے نمدے کے غالیچے، اور شہر تیرا کے چہرے کے لمبے نقاب مشہور تھے"

سوس ہ۔ دریائے کرخہ، جو شہر سوس کی جانب کچھ فاصلہ سے بہتا تھا۔ اس کی گزرگاہ میں حضرت دانیال نبی کی قبر بنائی گئی تھی اور قریب تر کنارے پر ایک خوب صورت مسجد

اس مقام کی نشاندہی کرتی تھی۔ مورخ مستوفی نے لکھا ہے کہ :۔

"حضرت دانیال کی قبر شہر سوس کی مغرب میں تھی، پاسِ ادب سے کوئی شخص اس دریا میں مچھلی نہ پکڑتا تھا۔ اور یہاں سے شمال کی طرف کچھ فاصلے پر شہر جیسان میں حضرت عزیرؑ نبی کی قبر بھی تھی۔"

بیروت :۔ بصنا کے قریب اور سوس سے تقریباً ایک دن کی مسافت پر لیکن غالباً دریائے کرخہ سے مغرب کی طرف بیروت کا شہر تھا، جہاں ساتویں صدی ہجری میں یاقوت آیا تھا۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ :۔

" یہ نخلستانوں سے گھرا ہوا ایک بڑا شہر تھا"

یہاں بیروت کا یہ نام، اسرائیلی جلاوطنوں نے بیروت (شام) سے آنے والوں نے رکھا ہو گا جو کہ یہاں آباد ہوئے۔

سلیمانان :۔ اھواز کے جنوب میں دریائے دجیل (کارون) بہت عریض ہو کر ایک مدو جزر والی کھاڑی کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ دریائے دجیل (کارون) کی کھاڑی جو فیض دجیل کہلاتی تھی شہر سلیمانان کے مقام پر خلیج فارس میں ملتی تھی یہ اھواز پہنچنے کے واسطے جہازوں کے لئے زیادہ آسان تھا کہ وہ باسیان (بسان یا بسن) والے کے مقام سے مختلف دریاؤں کے ذریعے دورتک اور وہاں سے صدرہ کا راستہ اختیار کریں۔

سوسن :۔ ایذج کے شمال مغرب میں چار فرسخ کے فاصلے پر سوسن کا چھوٹا سا شہر جسے عروج یا عروح اور جابلق بھی کہتے تھے دریا کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ اس کے گرد وسیع باغ تھے جن میں انگور، چکوترا، اور نارنگیاں پیدا ہوتی تھیں اور بعض مصنفوں کی تحریر کے مطابق یہ وہی مقام ہے جو عہد عتیق کی کتاب دانیالؑ والا شوشان قصر ہے یعنی قصر سوسن۔

تستر سے آٹھ فرسخ شمال مغرب میں، دذفول کی سڑک پر وہ کھنڈرات پائے جاتے ہیں جنہیں آج کل شاہ آباد کہتے ہیں یہ کھنڈر جندے سابور کے محل وقوع کا پتہ دیتے ہیں۔ آل ساسان کے عہد میں یہ صوبہ خوزستان کا دارالحکومت تھا۔

خلیفہ عباس کے زمانے تک یہ شہر اس طبی مدرسے کے لئے مشہور رہا جسے ایک عیسائی طبیب بختیشوع (جو نسلاً ان اسرائیلی اسیروں کی اولاد میں سے تھا جنہیں بخت نصر نے یہاں لا کر بسایا تھا) نے یہاں قائم کیا تھا۔ اس طبیب کو اپنی زندگی میں اور اس کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں کو، ایک سے زیادہ خلفاء عباسیہ کے دربار میں بڑا مرتبہ حاصل رہا۔ لیکن اب وہ شہر جندے سابور ایک غیر آباد ویرانہ ہے۔ جو اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جندے سابور کہاں آباد تھا۔ شہر دُزفول، دُز کا پُل،، دریائے دُز کے کنارے جندے سابور کے مغرب میں واقع تھا اس شہر کا نام ایک مشہور پل پر تھا۔ مورخ ابن خرداد بہ اس نام کو قنطرۃ الزاب لکھتا ہے چونکہ۔

اس کے بیان کے مطابق دریائے دُز کا نام (زمانہ قبل میں) ،،زاب،، تھا دُزفول کا شہر دریا کے دونوں کناروں آباد تھا۔،،

معلوم رہے کہ زاب اور دُجیل کے دریا موصل اور بغداد کے علاقہ میں واقع تھے۔ اور وہاں کے جلاوطنوں کی یہاں سکونت کی وجہ سے ان دریاؤں کے نام زاب اور دجیل موسوم ہوئے جیسا کہ تیراہ والوں کے نام سے یہاں دریائے تیرا اور تیرین شہر مشہور ہوا اور بعد میں ساسانیوں کے سبب جلاوطن ہو کر مشرق میں جا کر کوہ سلیمان کے مغرب میں ایک دریا کے کنارے آباد ہوئے تو اس کا نام ناب اور، ندوب موسوم ہوا۔ اور اسی طرح اس علاقہ زدوب میں شمال کی طرف علاقہ تیرا موسوم ہوا۔ علاقہ تیرہ زاب اور دجیل جس کا ذکر ہو چکا اس کے قریب مشرق کو الیہودیہ اور جے کے شہر تھے جو اس وقت اصفہان کے نام سے مشہور ہیں۔ بخت نصر نے جلاوطن اور اسیر یہودیوں کو

یہاں الگ تھلگ بسایا تھا جس کی وجہ سے یہ نام پڑ گیا۔،، اس سارے علاقے میں اس قسم کے بہت نشانات ان لوگوں کے باقی ہیں مگر صرف اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ جلاوطن یہاں ایران سے کچھ نام مشرق کی طرف ساتھ لے گئے اب بھی جیئے نام گاؤں دیر کے علاقہ میں موجود ہے اور کلبانیہ جو سوس کے قریب ایک قصبہ تھا یہ نام بھی ساتھ لے کر ایک گاؤں کلپانی مردان کے قریب اور دوسرا کلپانی نام بونیر میں موسوم ہے۔

کتاب مقدس۔ باب عبرانی خطوط صفحہ ۱۹۲ (پشتو ترجمہ ۱۹۵۸ء برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور) میں ہے کہ

"اور کیا کہوں کیونکہ وقت نہیں کہ میں گدعون، بالاق، سمسون، یفتہ، داؤد اور سموئیل جیسے انبیاء کے حالات بیان کروں جنہوں نے ایمان کی قوت سے بادشاہتیں مطیع کر لی تھیں۔،،

مکاشفت (باب اول صفحہ ۲۸۳/۲۸۴ میں درج ہے)

"وہاں تمہارے پاس بعض ایسے ہیں جو بلعام کی تعلیم کی پابندی کرتے ہیں۔ اس نے بالاق (بلاق) کو بتایا کہ بنی اسرائیل کو ٹھوکر رکھ دیں کہ وہ بتوں کے قربانی کے گوشت کھائیں اور اسی طرح حرام کاری میں مبتلا ہو جائیں .... اور تھواتیرہ (جس کا تیری مخفف ہے) کے کلیسا کے فرشتے کو لکھیں۔،،

مردزئی قبیلہ مرد کے بارے میں تاریخ شام ولبنان میں درج ہے ۔۔

مسلمہ کی یہ مہم ایک غیر معروف گروہ کے خلاف تھی جو شمالی شام کے پہاڑی علاقہ میں رہتا تھا۔ یہ لوگ، مردہ، کہلاتے تھے۔ انہیں کو جراجمہ بھی کہتے تھے۔ کیونکہ ان کے مرکز کا نام جرجومہ تھا جو جبل لکام میں واقع تھا۔ وہ عربوں کی سرحد پر مقیم تھے۔ اور ایشیائے کوچک کی حفاظت کے لیے پتیل کی دیوار بنے رہے۔ وہ تھے تو عیسائی آرامی زبان بولتے تھے۔ وہ طبعًا سرکش

تھے اور جنگ جوئی ان کا پیشہ تھا۔ مظلوم اور غیر مطمئن لوگ ان کے پاس جمع ہوتے۔ غالباً اسی زمانے میں یہ لوگ "مردہ" مردائی یعنی باغی کہلانے لگے۔ عبدالملک کے بیٹے ولید کے عہد میں (۷۰۵ء) قطعی فیصلہ کر لیا گیا کہ اس خطرے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ مسلمہ نے ان تکلیف دہ گروہوں کے مرکز پر حملہ کر دیا اور مقام جرجومہ کو مسمار کر ڈالا۔ ان میں سے ایک حصہ مارا گیا اور باقی وہاں سے جلاوطن ہوئے"۔

تاریخ شام اردو صفحہ ۱۸۳ کے نیچے حاشیہ نمبر ۱ پر "مردہ" کے متعلق تحریر ہے کہ۔

" اس کی اصل ایک قدیمی سامی لفظ "م ر د" ہے۔ جس کے معنی ہیں بغاوت یا مزاحمت کرنا۔"

پشتو زبان میں بھی اس لفظ کا یہی مطلب لیا جاتا ہے۔ مرور، مرور یعنی کسی سے خفا ہونا۔ منہ موڑنا۔ باغی ہونا۔ تعلق چھوڑنا وغیرہ۔ لہذا تحقیق طلب اور قابل غور ہے کہ قبائل خٹک میں تری (تہری) اور بالاق یا بلاق میں مروزئی کے نام سے ایک قبیلہ موسوم اور موجود ہے۔

ساغری:۔

شمالی شام میں انطاکیہ سے مشرق کی طرف عموریہ کے شمال السند، اور سندابری کے مقامات پر دریائے ساغری نکلتا تھا اور شمال مشرق کو بہتا ہوا بحر بنطس میں گر جاتا تھا اس دریا کے علاقہ سے جو اسرائیلی جلاوطن ہوئے قیاس غالب ہے کہ انہیں لوگوں کو ساغری کہا گیا

کرلانی:۔

کران * کرانی یا کرلانی عبرانی لفظ ہے جو افغانوں کا چوتھا بڑا قبیلہ ہے اور کرلانی

---

* فتوح البلدان حصہ اول حمص کے عنوان میں شمالی شام میں قارا (کارا) ایک مقام بتاتا ہے۔

گروپ میں ذیل کے افغان قبائل شامل ہیں۔

خٹک، دلازاک، ورک زئی۔ اتمان خیل۔ افریدی (افرتیے) خوگیانی۔ ہونی۔ منگل وزیر بنگش۔ شینک۔ موسیٰ زئی۔ اور وردگ وغیرہ، ان کی ذیلی شاخیں تعداد میں تقریباً ایک سو بیس ہیں۔ جلاوطنی سے قبل یہ لوگ شام کے انتہائی شمالی علاقوں میں دور دور تک جگہ بہ جگہ منتشر (کرلی) حالت میں پھیلے ہوئے آباد تھے۔ جیساکہ ساغری وغیرہ کا ذکر ہو چکا۔ بعد میں یہ قبائل بھی وہاں سے جلاوطنی کے بعد اپنے ہم نسل سابق جلاوطن اسرائیلیوں کے پیچھے مشرق کی طرف آئے اور ان کے ساتھ شامل ہوئے اور ان کا نام "کرلانی،، رکھا گیا۔ اس بارے میں قاضی عبدالحلیم اثر کی ایک قلمی تحریر جو میرے پاس ہے ذیل میں درج ہے۔

تری اور ترکی

افغان مورخین نے افغان قبائل کے جو شجرہ ہائے نسب ترتیب دیئے ہیں ان میں ایک قوم کا نام کرلان ذکر کیا ہے۔ اور پھر اس کی دو ذیلی شاخیں بیان کی ہیں (۱) کودی (۲) ککی۔ اور پھر ککی کے ایک ذیلی شاخ کا نام خٹک اور اس کی ایک ذیلی شاخ کا نام تری لکھا ہے اور دوسرے کا ترکی۔ جہاں تک واقعات اور حقائق کا تعلق ہے۔ عبرانی زبان میں علی الاطلاق شمالی علاقہ کو (کرا۔ کر کارا۔ تری) کہا جاتا ہے۔ اور اس کا اطلاق اس علاقہ پر کیا گیا ہے جو ایشیائے کوچک کے کوہستان ارارات کا انتہائی شمالی علاقہ ہے جو آج مملکت ترکیہ کا حصہ اور اس کا نچلا سرا دریائے احمر کے جنوب میں شمالی شام تک پھیلا ہوا ہے۔ (کرہ کرا) اس پورے شمالی کوہستان کا نام ہے۔ (تری) اسی کوہستان کے ڈھلان کی طرف نشیبی دروں سے ملحقہ حصوں کا نام ہے ان میں سے وسیع ترائی کا علاقہ تری ہے اور اس میں سے زیادہ نشیبی حصہ جو تنگ گھاٹیوں

پر مشتمل ہو وہ درک کہلاتی ہے جس کا ایک علاقائی تلفظ (ترک) ہے۔ اور (ترکی) اسی لغت کا نسبتی نام ہے۔ اور اس (کرکرا) اور ترکی کا وہ حصہ جو پہاڑیوں کی چوٹیوں میں واقع ہو۔ اسے (کود۔ خود) کہتے ہیں۔ اور اس سے نسبتی نام کودی بنایا گیا ہے۔ کودی کے لغوی معنی ہیں۔ شمالی پہاڑیوں کی چوٹیوں کے رہنے والے یہ وسیع شمالی پہاڑیوں کا علاقہ جسے (کرا) کہا گیا ہے اس کے تمام رہنے والے چاہے وہ ترکی ہیں۔ کودی ہیں۔ درک ہیں۔ ترک ہیں۔ یہ سب کے سب جغرافیائی اعتبار سے (کران۔ کرانی) ہیں جن کو افغان مورخین نے کرلانی بنا دیا ہے۔

یہ عبرانی زبان کا لغت موجودہ ترکی زبان میں بھی مستعمل ہے ترکی زبان میں (کرا KARA) کے لغوی معنی ہیں۔ برف اور وہ کوہستانی سرزمین جہاں عرصہ گزر جانے کی وجہ سے برف نے سفید ہونے کے بعد پڑتے پڑتے سرخ پیلا، قرمزی اور بالآخر سیاہ رنگ اختیار کر لیا ہو۔ اور اسی مناسبت سے عربی زبان میں بھی کَرَّا۔ کَرَّا کے معنی کئے گئے ہیں۔ (سیاہ کالا) وجہ یہ کہ اس انتہائی شمال میں سورج کی روشنی نہ پہنچنے کی وجہ سے یہ ایک طرح سے کالی سرزمین ہے جہاں ہر وقت تاریکی کا پردہ پڑا رہتا ہے۔

اسی طرح ترکی زبان میں لفظ کرا کے معنی ہیں۔ (زمین۔ خطہ۔ اصل ملک) اور خطہ خاص۔ عبرانی زبان میں اس سے شمالی، کوہستانی خطہ، مراد لینے کے بھی معنی لئے جائیں گے۔ کہ انہوں نے اصل ملک اور خطہ خاص کے مفہوم میں خصوصیت پیدا کی ہے۔ اردو ادب اور لغات میں ایک لغت ہے (کرا) جس کے معنی ہیں خالص۔ یہ بھی اسی ریشہ کا ایک لغت ہے۔

جب غور کیا جائے تو شمالی کوہستان خطے خصوصًا ایشیائے کوچک کے انتہائی شمالی

پہاڑی خطے ہی اصل ملک کا مفہوم لئے ہوئے ہیں۔ وجہ یہ کہ طوفان نوح کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اسی خطہ میں ارارات کی چوٹیوں پر اتاری گئی تھی۔ اور یہاں پر ہی حضرت نوح کے فرزندوں کی نسل آباد ہوئی تھی اور یہاں سے ایک دفعہ پھر دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گئی تھی ۔،،

دوڑ:۔

دوڑ افغانوں کا ایک قبیلہ ہے جس کا مورث اعلیٰ دوڑ نامی قصبہ اور علاقے سے جلاوطنی کے بعد مشہور ہوئے۔ دوڑ کا مقام سامرا (شاردن) کے شمال میں دس میل کے فاصلے پر تھا جہاں سے دریائے وان دجلہ کے بائیں کنارے سے نکلتا تھا۔

اصطخر۔ اصطخر اس قوم کا ایک بڑا واضح نشان آستر ملکۂ شاہ کائرس کا مقبرہ ہے جو ایران کے صوبہ فارس اصطخر شہر میں موجود ہے۔

اس مقبرہ کے متعلق جی۔ لی۔ اسٹرنج، فلارنس اٹلی، مصنف جغرافیہ خلافت مشرقی ۱۸۹۰ء ـــ ۱۹۰۵ء ترجمہ محمد جمیل الرحمٰن مددگار پروفیسر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۳۰ء نے اس کا ذکر چار دفعہ کیا ہے جو ذیل میں درج ہے۔

۱ـــ مسلمان مصنفوں نے مشہور ہخامنشی عمارتوں اور مقبروں کی نسبت جنہیں وہ جمشید اور حضرت سلیمان سے منسوب کرتے ہیں۔ کوئی دلچسپ بات بیان نہیں کی ہے۔ صفحہ ۳۹۲

۲ ـــ دریائے پلوار پہلے مشرق کی طرف بہتا ہے اور پھر پسرگادی سے شمال میں مقبرہ ملکۂ کائرس سے، جسے مسلمان مشہد مادر سلیمان کہتے ہیں۔ جنوب مغرب میں مڑتا ہے۔ صفحہ ۳۹۴

۳ ـــ یہ سڑکیں اصطخر سے گزر کر "کبین،، ہوتی ہوئی ملکۂ کائرس کے مقبرے کے پاس سے نکل کر دیہہ بید پہنچتی تھی۔ صفحہ ۴۰۸

آگے لکھتا ہے کہ

"ہم اوپر کہہ آئے ہیں (ملکہ کائرس کے مقبرے کو مسلمان حضرت سلیمانؑ کی والدہ کی قبر سمجھتے تھے۔ اور اسے مشہد مادر سلیمان کہتے تھے۔ چو پہل سنگ بستہ مقبرے کے متعلق جواب تک موجود ہے، مشہور تھا کہ ایک طلسم اس کی حفاظت کرتا ہے۔ مصنف فارس نامہ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی چار دیواری کے اندر سکونت اختیار کرنے کا قصد کرتا تھا تو دفعتاً اندھا ہو جاتا تھا۔ گردونواح کے چراگاہ مرغزار کلان کہلاتے تھے اور مشہد مادر سلیمان سے آگے کی منزل دیہہ بید تھا"

تجزیہ اور تشریح:۔ مصنف مذکور نے جو کچھ معلوم کیا وہ بھی غنیمت ہے کیونکہ ڈھائی ہزار سال گزر چکے۔ اکثر نام غلط اور اس کی وجہ تسمیہ اور اصلیت پر پردے پڑ گئے ہیں اور بہت دفعہ اصل واقعہ سے افسانہ بن جاتا ہے افسوس کہ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگرچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ مسلمان اس مقبرے کو حضرت سلیمؑ کی والدہ کی قبر سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہاں اس نے خود مسلمان سے قوم مسلمان (مسلمانان) مراد لی ہے۔ اس کو چاہیئے تھا کہ اسی طرح سلیمان سے قوم سلیمان یعنی سلیمانان مراد لیتے کیونکہ مسلمانان کے وزن پر سلیمانان بولا جاتا تھا۔ اور ایران میں اُس وقت بنی اسرائیلی جلاوطنوں کو سلیمانان کہتے تھے۔ وجہ یہ کہ حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد کے بعد حضرت سلیمان اس قوم کے پیشوا تھے۔ اصل میں یہ مقبرہ ملکہ آستر کا ہے جو اخویرس (خورس، سائرس، کورش، کائرس اور خسرو) جو سب ایک ہی نام ہے) شہنشاہ مملکت ایران کی چہیتی ملکہ تھی۔ یہ مقبرے اور ان کے محلات بطور یادگار اور آثار قدیمہ کی صورت میں موجود ہیں۔ ملکہ آستر جس کے مقبرے کا ذکر ہوا۔ مادر سلیمان نہیں بلکہ حضرت سلیمانؑ کی قوم یعنی سلیمانان کی والدہ ہے جس نے سب جلاوطن اسرائیلیوں کو حقیقی والدہ کی طرح ان کی خدمت، حفاظت اور پرورش کر کے معزز بنایا اور اسی کی بدولت اسرائیلی جلاوطن مملکت ایران میں

ہر جگہ خوش حال اور آباد رہے نظام سلطنت میں شامل کئے گئے اور اپنی قوم کی ایسی محکم سرپرستی اور انتظام کیا کہ ان کے مرنے کے بعد بھی اس شاہی خاندان کے دورِ حکومت میں جو دو سو بیس سال تک قائم تھا۔ معزز رہے تھے یہ عام روایت ہے کہ شاہ خورس نے دینِ موسیٰ قبول و اختیار کیا تھا۔ اور اسرائیل پر بڑا مہربان تھا اور اسی طرح اس کے مرنے کے بعد بھی جب اس کا بیٹا کمبوجیہ (کیقباد) بادشاہ ہوا ان پر مہربان رہا وہ اکثر بلخ میں رہتا تھا اپنے باپ کے طریقہ پر قائم رہا۔ اس وقت اس کے پاس و اطراف ایک ہی وقت میں چار بنی اسرائیلی انبیاء تبلیغ میں مصروف تھے۔ ان انبیاء کے ساتھ بادشاہ مذکور کا تعاون اور حمایت شامل تھی۔

تاریخ ایران کے مصنف پروفیسر مقبول بیگ لکھتے ہیں کہ۔

”ہخامنشی عہد کے قدیم ترین آثار پازارگدہ میں ملتے ہیں۔ جو کہ کورش اعظم کے زمانے میں فارس اور ایران کا پایہ تخت تھا۔ اس کے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہاں کبھی کوئی بڑا شہر آباد تھا پازارگدہ میں ہخامنشی عہد کا بانی ایران کا عظیم فاتح کوروش اعظم کی زوجہ ملکہ آستر دفن ہے۔ پازارگدہ کے آثار کوروش اعظم کی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔ سب سے پہلے مرغاب کی وادی کے پہاڑ کی چوٹی پر ایک ہموار سطح مقام نظر آتا ہے جسے ”تختِ سلیمان“ کہتے ہیں۔ اس کی ایک شکل ایک متوازی اضلاع کی سی ہے اس کی لمبائی تین سو فٹ ہے۔ اس کی تعمیر میں سفید پتھروں کے بڑے بڑے ہموار ٹکڑے استعمال کئے گئے ہیں۔ یہاں کوئی سیڑھی نہیں نہ کسی اور عمارت کے آثار ہی ہیں۔“

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ پازارگدہ کے علاقہ میں اسرائیلی جو اس وقت سلیمانان کے نام سے یاد کئے جاتے سکونت پذیر تھے اور یہ ان کا اہم مقام تھا۔ تاریخ ایران میں آگے درج ہے۔

"استخر بازار گرد سے اڑتالیس میل کے فاصلے پر ہے ایک طویل سلسلہ کوہ ان دونوں کے مابین حائل ہے۔ استخر ہخامنشیوں کا پایہ تخت تھا۔ اس شہر کے کھنڈرات اب ہخامنشی دور کی عظمت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ہخامنشی عہد میں اسکا نام بھی پارس ہی تھا۔ استخر کے خرابوں سے پانچ میل کے فاصلے پر سلسلہ کوہ میں ایک مسطح میدان ہے جو "تخت جمشید"، کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مقام ہموار سطح سے چالیس فٹ کی بلندی پر ہے۔ لمبائی اس کی پندرہ سو تیس فٹ اور چوڑائی نو سو بیس فٹ ہے۔ یہ بھی "تخت سلیمان"، کی طرح سفید پتھروں کے ہموار ٹکڑوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ دارائے اعظم نے اس میدان کے اوپر شاہی محل تعمیر کرایا جس کا نام تا چارا تھا ایک اور محل " اپادانا"، بھی اس نے شروع کرایا تھا۔ لیکن زندگی نے مہلت نہ دی۔ آخر تعمیرات کا یہ کام اس کے بیٹے خشیارشا (ارتخشا) کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچا اور تخت جمشید کو یونانی پرسی پولس کہتے ہیں۔ بعض جدید محققین کا خیال ہے کہ ہخامنشی عہد میں اس کا نام پارس تھا۔ بہر حال اس قدیم شہر کو اب تخت جمشید کہا جاتا ہے آگے لکھتا ہے کہ:۔

" نقش رستم"، عین کوہ پر ایک مقام ہے جو تخت جمشید سے تین فرسنگ کے فاصلے پر پلوار ندی کے قریب واقع ہے۔ یہاں چند مقبرے ہیں جو پہاڑوں کے پہلو کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔ یہ سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے اوپر واقع ہیں۔ دو مقبروں کے سامنے کے حصے محلات شاہی کے جھروکے معلوم ہوتے ہیں اندر سے بند ہیں۔ سامنے ایک چھوٹا سا ایوان ہے جس کے چار ستون ہیں۔ ان مقبروں میں ایک دارائے اعظم کا ہے کیونکہ اسی پر اس کا کتبہ موجود ہے۔ یہاں ایک مُردہ خانہ بھی ہے نیچے نو قبریں ہیں۔ مقبروں کے بالمقابل ایک برج ہے یہاں جھنڈے رکھے جاتے تھے"۔

ابن خلدون لکھتا ہے۔

"کورش نے اسرائیل کی قیدیوں میں سے ابو حاویل الرحا کی لڑکی (آستر) مردخائی کی رضائی بہن سے اپنا عقد نکاح کر لیا۔ مردخائی نے اسے (یعنی بادشاہ کورش کو) دین یہودیت کی تعلیم دی اور بنی اسرائیل کے انبیائے وقت مثلاً عازریا، میثائیل، مئینا اور عزیز علیہم السلام کی اس نے صحبت پائی۔ یہ وہی کورش ہے۔ جس نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی طرف لوٹایا اور بنی اسرائیل نے اس کی حمایت سے بیت المقدس کو آباد کیا اور از سر نو وہاں اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ کورش اس کے بیٹے کیقباد اور دارا کا مذہب دین حق پر قائم اور بلاشبہ ایران کے قدیم مجوسی مذہب کے خلاف تھا۔"

قصص القرآن کے مصنف مولانا حفظ الرحمٰن لکھتے ہیں:۔

"پھر خورس، اور دارا کے مومن، ہونے اور ایران کے قدیم مذہب مجوسی، سے بیزار رہنے پر سب سے بڑی شہادت دارا کا وہ تبلیغی اعلان ہے جو اس نے دانی ایل نبی کے دشمنوں کے خلاف شائع کیا تھا۔ جس کا مضمون یہ ہے تب دارا بادشاہ نے ساری قوموں اور گروہوں جو روئے زمین پر بستے تھے نامہ لکھا۔

"تمہاری سلامی ترقی پائے۔ میں حکم کرتا ہوں کہ میری حکومت کے ہر ایک صوبے کے لوگ دانی ایل نبی کے خدا کے آگے ایک ترساں ولرزاں ہوں کیوں کہ یہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال ہے اور آخر تک رہے گی اور وہی چھڑاتا بچاتا ہے اور آسمان اور زمین میں وہی نشانیاں دکھلاتا اور عجائب و غرائب کرتا ہے۔ اسی نے دانی ایل کو شیر ببروں کے چنگل سے چھڑایا ہے۔ پس یہ دانی ایل نبی دارا کی سلطنت اور خورس فارسی کی سلطنت میں کامیاب رہا۔"

سائرس:۔

یہ اس نام کی یونانی وضع ہے۔ انگریزی میں کائرس اور یہودیوں نے اسے خورس، اخویرس، قرار دیا۔ اور عربوں نے خسرو۔ کیانی یا ہنا منشی خاندان کا یہی شہنشاہ ہے جسے شاہنامہ میں کیخسرو کہا گیا اس کا اصلی نام گوردیا گورودش، کورش تھا اس کی تخت نشینی ۵۵۰ ق م میں ہوئی۔ اس کا بیٹا کیم بی سس نام جو یونانی لفظ ہے۔ پارسی اسے کمبوجیہ، یہودی اور عرب کیقباد کہتے تھے اور دارا ایران کا مشہور دارا گشتاسب ہے۔

اصطخر کی تشریح:۔

اس شہر کا قدیم نام "پرسی پولس" تھا ملکہ آستر کی شان وشوکت اور اعزاز کے سبب یہ مقام "آستر خُرّہ" سے یاد کیا جاتا رہا۔ عرصہ گزرنے پر آستخر مشہور ہوا جو بعد میں اصطخر لکھنے کا غلط رواج شروع ہوا۔ بہر صورت اصطخر یا استخر سے ملکہ آستر کی یاد دِل میں تازہ ہوتی ہے۔

"خُرّہ" یہی مصنف جی لی اسٹرینج اِسی کتاب کے صفحہ ۲۱۴ پر لکھتا ہے۔

" قدیم فارسی زبان میں خُرّہ کے معنی "شان وشوکت" کے ہیں، اور اس لئے خُرّہ اردشیر اور خُرّہ شاہ پور سے مراد وہ علاقے ہیں، جن سے ساسانی خاندان کے بانی اردشیر، اور اس کے مشہور ومعروف بیٹے شاپور یا سابور کی شان وشوکت کی یاد دل میں تازہ ہوتی ہے۔"

الغرض اب پھر اپنے مقصد پر آتا ہوں مختصر قصہ یہ کہ مذکورہ واقعات اور آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبائل ترین شام کے شمالی علاقہ تیرہ (تیرا) سے جلاوطنی کے بعد علاقہ خوزستان (ایران) میں اسی دریائے مذکور کے کنارے بسائے گئے اور انہی کے نسبت سے دریا اور اس نواحی کا نام تیرا اور ایک شہر بھی تیرین کے نام سے یعنی تیرا والا موسوم اور مشہور ہوا۔ ساسانیوں کے جبر وتشدد کے سبب ایران سے نکل کر مشرق کی طرف موجودہ افغانستان کے علاقہ تیراجوان کے سبب موسوم ہوا، میں اپنے عزیزوں کے

ہاں سکونت پذیر ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ ان میں مشہور اور بڑا قبیلہ ابدالی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

روایت ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل میں نفتالی بن یعقوبؑ کی اولاد سے ہیں۔ اور عرصہ دراز گزرنے اور تلفظ میں فرق کے سبب نفتالی سے افتالی اور بعد میں ابدالی مشہور ہوئے ہیں۔ یہ کوئی خاص فرق نہیں صرف ن الف سے بدلا ہے۔

ترین قبائل کے علاوہ دوسرے افغان قبائل کے بھی ملک ایران سے خارج ہونے اور ان کے مشرق کی طرف آنے کے آثار و قرائن، ملک ایران کے شمالی اطراف میں (جس کا کچھ حصہ اس وقت روسی سلطنت میں ہے) بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً ہمدان نہاوند، حلوان، جولان یا گیلان۔ مرانہ دریائے صافی، نیز ارمیہ، میانہ یا میانج جس میں قبائل اُرمڑ اور میانہ آباد تھے۔ طہران، قزوین، تبریز کرمان شاہ اور اصفہان وغیرہ کے علاقوں میں ان کے انبیاء کی قبریں صوامع، گرجے، قلعے، چشمے، دریا پہاڑ اور قصبے زیادہ تعداد میں انہی کے ناموں سے موسوم ہیں۔ انہی قبائل کے آثار ا[illegible]بعد میں ان علاقوں سے ساسانیوں کے عہد میں اخراج وغیرہ سے قیاس اخذ کیا جاتا ہے کہ اکثر بنی اسرائیل افغان قبائل ان جتھوں میں سے ہوں گے جنہیں اشوریوں کے بعد بخت نصر نے سلطنت یہودا کی تباہی کے بعد مشرق میں بابل کے نواحی علاقوں میں بسایا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ بابلی حکومت کی مشرقی حدود صرف انہی علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ بابل کے برعکس آشوری مملکت کی حدود مشرق میں بہت وسیع تھیں۔ جو دریائے سندھ کی وادی، کاشغر اور موجودہ بلوچستان تک قائم تھیں۔

ایران میں سکونت کے سبب بعض مصنفوں نے ان کو ایرانی اور فارسی لکھا ہے جس کا نسب سے کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ یہ سکونتی نسبت ہے جو وہاں کی رہائش کے سبب بولا جاتا تھا جس کا ذات اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

شامی علاقہ جات کے اسرائیلی نام جو صرف علاقہ یوسف زئی میں بغیر کسی تاویل کے بلکہ

بعینہٖ انہی ناموں سے جو ندی، نالے، قصبے دیہات اور پہاڑ موجود اور موسوم ہیں، بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے جو "مشت نمونہ خروار" ہے۔ ہاں جس نام میں یہاں کے لہجے میں جو فرق آیا ہے وہ بھی اصل نام کے ساتھ قوسین (بریکٹ) میں لکھا جاتا ہے۔

نطوفہ، یاغدرہ، روڈ، دربند، کرنا، آشرہ، بوتقا، منارہ، ندبا، (زروبی)۔ شوا، ایتم، سدوم، خنذف، (گندف) کرخ (کرغ) جلولا (جلالہ) مورا، سورا، بارما(ن) سواوے قانا، غوزبند، براندی (براندو) ایلہ، ایلم، دوسرا (دوہ سرے) جور (جوڑ) قراقر (کراکڑ) صیدا (صیدو) دیر۔ ملکا۔ خلخال (خالونہ) تمر (تمرگرہ) مندا (منڈا) بروا۔ باقر۔ کیارہ سکرہ۔ بیکا۔ کلالہ۔ جیبئے اور رباط وغیرہ۔

قومی یک جہتی

تاریخ افغانان اور تاریخ خان جہان لودی و مخزن افغانی وغیرہ نے زمانہ قدیم کے ان تمام مشائخ و اولیائے کرام کا ذکر اپنی تصانیف میں بہت تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ انہوں نے اپنے وقت میں اپنے آپ کو افغان اور قوم افغان کو بنی اسرائیل کہا ہے اور ابھی تک ان کے گفتار و کردار سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا ہے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی کسی وقت قوم افغان کے بنی اسرائیل ہونے سے انکار کیا ہو۔

زمانہ جدید کے چند ایک مشائخ و بزرگان کا حوالہ دینا بھی خارج از بحث نہ ہوگا جو اس بات سے متفق تھے کہ افغان بنی اسرائیل ہیں۔

ا ـــ شیخ ملی۔ جن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا ذکر تواریخ حافظ رحمت خانی نے جلی حروف میں کیا ہے۔ اور کتاب یوسف زئی افغان طبع چہارم ۱۹۷۳ء نے ان کی کارکردگی کو عوام الناس کے سامنے رکھ دیا ہے۔ انہوں نے افغان قوم کے شجرہ ہائے نسب قوم کے صلاح و مشورہ سے مرتب کئے جس کا سلسلہ حضرت یعقوب اور حضرت ابراہیم تک پہنچتا تھا۔ اور انہی

شجروں پر افغان قوم میں مفتوحہ ملک کو تقسیم کیا گیا۔ جب انگریز آیا اور اس علاقہ پر اس نے قبضہ کیا تو ۱۸۷۰ء میں اس نے ملک کا بندوبست کرنا چاہا۔ تو اس سلسلہ میں قوم کے ہر طبقہ کے معمر اشخاص اور جرگوں سے پوچھ گچھ کی گئی۔ تو انہوں نے وہی شجرے پیش کئے جو شیخ ملی نے مرتب کئے تھے۔ اور جن پر اُس وقت تقریباً چار صدیاں گزر چکی تھیں۔ تاہم قوم میں سے کسی شخص نے بھی اس پر اعتراض نہ کیا بلکہ ہر قبیلہ اور اس کی ذیلی شاخ نے اس کی تصدیق کی۔ تاریخ پشاور کا مصنف رقمطراز ہے کہ قوم کے سامنے حکومت کی طرف سے دیگر مرتب کردہ شجرے بھی پیش کئے گئے تھے مگر انہوں نے ان کو ماننے سے انکار کیا اور کہا کہ ہمارے پاس اپنے شجرے موجود ہیں۔ یعنی وہ بڑے زیادہ صحیح اور قابل اعتبار اور ہمارے اجداد کے قول کے مطابق ہیں جو شیخ ملی نے مرتب کئے تھے۔ ہم انہیں پر عمل پیرا ہوں گے۔ چنانچہ حکومت نے اُن کے شجروں کو تسلیم کیا۔ اور بندوبست کا کام اسی بنیاد پر مکمل ہوا۔

اس میں خشی (رخمی)، تبائل اور عوریا خیل کے بیانات اب بھی محفوظ ہیں۔ اور یہ شجرے اور ان کے مطابق تقسیم اراضی کا ریکارڈ اب بھی محکمہ مال میں ہر تحصیل ہر ضلع میں محفوظ چلا آ رہا ہے۔

خشی تبائل اور عوریا خیل کی آئندہ نسلوں کے لئے یہی ثبوت کافی ہے کہ وہ سڑابنی اسرائیلی ہیں۔

ریاستہائے سوات دیر و باجوڑ میں جہاں انگریز نہ پہنچ سکا تھا۔ ان لوگوں نے بھی اسی تقسیم پر اکتفا کیا اور وہی اراضی ان کے قبضہ میں رہی جو انہیں شیخ ملی کے شجرہ نسب کے مطابق تقسیم میں دے چکے تھے۔ اور ابھی تک وہ اس تقسیم پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

شیخ ملی نے شجرہ نسب سڑابنی کا اسرائیل (یعقوبؑ) سے جا ملایا تھا۔ پھر تقسیم انہوں نے جس طرح کی وہ عین اس کے مطابق تھی۔ جو تورات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے میدانِ موآب میں اپنی قوم بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے وصیت کی تھی۔ اور پھر یشوعؑ

بن نون نے اس کو عملی جامہ پہنایا تھا اور حضرت موسیٰؑ کی وصیت کے مطابق ملک تقسیم کر دیا تھا۔ چونکہ شیخ ملی بھی بنی اسرائیل سے تھے اور ان کو افغان قوم میں ایک بلند مقام حاصل تھا لہذا انہوں نے بھی موسیٰؑ کے بنائے ہوئے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ملک کو تقسیم کیا۔ اور مذہبی پیشوایان کو بھی اسی طرح سیریاں دلادیں۔ (تقسیم کے متعلق موسیٰؑ کی وصیت ص۴۵ پر ملاحظہ ہو)

۲۔ اخوند درویزہ نے اپنی تصنیف تذکرہ میں اس بارے میں ایک سیر حاصل بحث کی ہے اور بڑے دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے کہ افغان بنی اسرائیل ہیں۔ آپ سید علی ترمذی المعروف پیر بابا کے مرید تھے۔ یہ کتاب ان کے ایماء سے مغل شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں لکھی گئی تھی۔ انہوں نے بھی اس بات سے اتفاق کیا ہے۔ آپ مدتوں بایزید انصاری کے ساتھ اختلاف سے رہے اور کئی مناظرے و مقابلے کئے۔ بایزید انصاری خود اور اُن کے کئی رفقاء افغان قوم کے بزرگوں میں سے تھے۔

مگر کبھی بھی ان میں اس بات پر اختلاف نہیں ہوا۔ شجرہ نسب پر انہوں نے نہ بُرا مانا اور نہ ہی اس سے انکار کیا۔ اس ضمن میں ان کی خاموشی جبکہ دوسرے ہر پہلو پر وہ مناظرے کرتے تھے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اس بات سے پورا اتفاق تھا۔

۳۔ عبدالرحمٰن بابا اور خوشحال خان خٹک جو دونوں افغان قوم کے مشاہیر تھے انہوں نے اس نظریے کے ساتھ کہ افغان بنی اسرائیل ہیں اتفاق کیا ہے۔

۴۔ شاہ افغانستان امیر عبدالرحمٰن خان کتاب دبدبہ امیری میں لکھتے ہیں "میرے بچپن سے اب تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ جس روز کسی نہ کسی ملک و قوم کی تاریخ میں نے خود نہ پڑھی ہو یا مجھے پڑھ کر نہ سنائی گئی ہو۔" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"کل افغان سنی مسلمان ہیں۔ اور افغان مورخین کے بیان کے موافق اسرائیل کی نسل سے ہیں۔ ان کا نام افغان لفظِ افغنہ سے مشتق ہے۔" اور اپنی سوانح عمری "تاج التواریخ" میں پھر لکھتے ہیں۔

"لهذا چند فقره را مختصراً بیان مینمایم تمام اہالے افاغنه مسلمان سنی مذہب مے باشند و به موجب کتب تواریخ افغانستان اینها اصلاً از طائفه بنی اسرائیل می باشند واسم افغان را از لفظ افغانه گرفته اند۔ چوں نسب بعضے از آنها بافغانه که سپه سالار حضرت سلیمانؑ بود میرسد و نسب بعضے دیگر از آنها بارمیا پسر شلموئی پیغمبر می رسد۔"

چنانچہ افغان مشاہیر اپنے گوئل یعقوب یعنی بنی اسرائیل میں سے ہونے پر فخر کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کا نسبتی نام اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے چلے آرہے ہیں۔ کتاب یوسف زئی افغان اور کتاب آثار سے اس سلسلے میں کچھ مثالیں بطور دلیل پیش کی جاتی ہیں۔

۵۔ شیخ عبدالواحد افغان مزار عانی بلگرامی کے نام سے ایک صوفی عالم گزرے ہیں جنہوں نے "سبع سنابل" کے نام سے ایک کتاب ۹۶۹ھ میں تالیف کی ہے۔ جس میں انہوں نے اپنا طریقت کا شجرہ یوں بیان کیا ہے۔"

عبدالواحد بن ابراہیم افغان بلگرامی از مخدوم شیخ حسین افغان بنی اسرائیلی از شیخ عبدالصمد المعروف به شیخ صفی۔"

۶ ــــ اخوند حافظ محمد شعیب (متوفی ۱۲۳۲ھ) المعروف بابا جی صاحب تورڈھیری (ضلع مردان) جو کہ حضرت اخوند حافظ ملا محمد خان ابن ملا دور خان محمد زئی کے مرید تھے۔ آپ نے مرآۃ اولیاء کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

"این فقیر حقیر خاک پائے کبیر و صغیر (محمد شعیب) غفران اللہ تعالیٰ عنه دست بر دامن گنج انوار و مخزن اسرار، پیشوائے شریعت و رہنمائے حقیقت و مخزن معرفت، بحر عرفان، حافظ قرآن حضرت "محمد" بنی اسرائیلی سربنی قدس اللہ سرهٗ ۔ وفات حضرت ایشان در ماه ربیع الثانی شب پنجشنبه بیست و ششم ماه مذکور وقت نماز خفتن سال ہزار و دو صد و شش ہجری

(۱۲۰۶ھ) بود و قبر مبارک در کلہ ڈیر است و آں موضع است از توابع عمرزئی و عمرزئی دہ است از دہ ہائے اشنغر (پشاور)

اخوند حافظ ملا محمد خان بن ملا دور خان افغان محمد زئی جو ایک جلیل القدر بزرگ ہونے کے علاوہ محقق، عالم، سربراہِ قبیلہ اور مصنف بھی تھے انہوں نے اپنی تالیف میں اپنا نام محمد بنی اسرائیلی سڑبنی لکھا ہے۔

۔عبداللہ قصوری۔ قصور مضافات لاہور (پنجاب) میں ایک تاریخی قصبہ ہے۔

یہاں افاغنہ کی ایک شاخ "خویشگی قبیلہ، زمانہ قدیم سے آباد ہے اس قبیلہ میں ارباب علم و فضل اور امرأ و رؤسا ہوئے ہیں۔ انہی کے سبب یہ بستی علم و عرفان کا مرکز رہی ہے۔ ان میں سے ایک بزرگ عبداللہ خویشگی قصوری تھے۔ جو فارسی میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے عبدی ان کا تخلص تھا۔ اور کثیر التصانیف مصنف تھے ان کی ایک کتاب اخبار اولیاء من لسان الاصفیاء (۱۰۷۷ھ) اس میں ایک سو ساٹھ افغان مشائخ کے تراجم ہیں۔ یہ مشائخ اپنے آپ کو افغان اسرائیلی کہتے تھے ان میں سے بعض اپنے ناموں کے ساتھ تعارف کے لئے افغان اسرائیلی لکھا بھی کرتے تھے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے اس کے باب چہارم کا عنوان بطور نمونہ پیش کرتا ہوں جس سے مصنف کی کارکردگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عنوان یہ ہے۔

"دربیان نسب افغانان و سبب آمدن از بیت المقدس در ہند"

اس نے کافی دلائل کیساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ افغان وہی اسرائیلی ہیں۔ جو شام و فلسطین سے جلاوطن ہو کر یہاں مشرق میں آباد ہوئے تھے۔

۸ــــ ایک افغان اہل علم۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی مصنف "تاریخ ہزارہ"، ایبٹ آباد میرے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "مجھے ذاتی طور تاریخ و مذہب سے رغبت ہے اور پٹھان ہونے کی وجہ سے پٹھان قوم کی تاریخ سے بھی خاص انس اور فخر ہے۔ فطری قومی انا اور تاریخ کے واقعات کے مطالعہ سے میں نے ایک نظریہ اپنا لیا ہے۔ اس قوم کو خدمتِ علم

سیاست، انداز شجاعت اور سخاوت سے نوازا اور یہی لوازمات حکومت ہیں۔ کیوں نہ ہو کہ یہ بنی اسرائیل ہیں اور خدا نے ان کو اقوام عالم پر برتری عنایت فرمائی قرآن اس پر شاہد ہے "۔

۹ — نواب سر صاحب زادہ عبدالقیوم جن کی فراست کسی سے پوشیدہ نہیں ان کا بھی یہی خیال تھا کہ افغان بنی اسرائیل ہیں "۔

۱۰ — عبدالسلام خان عمر خیل روہیلہ اپنی تصنیف "نسب افاغنہ" ، ہیں اور

۱۱ — حافظ رحمت خان روہیلہ اپنی تصنیف "خلاصتہ الانساب" ، میں کافی دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ قوم افغان بنی اسرائیل ہیں "۔

۱۲ — نواب محمد اکبر خان رئیس یوسف زئی ہوتی۔ جن کی لائبریری لاثانی حیثیت رکھتی تھی۔ اور نسب کے بارے میں وہ بہت سخت تحقیق کرنے والے شخص تھے اور اس بارے میں کافی معلومات بھی رکھتے تھے ان کا بھی یہی عقیدہ تھا بلکہ کبھی کبھی بھری مجلس میں قسم کھاتے تھے کہ افغان بنی اسرائیل ہیں "۔

* * بیان عمر:- آخر میں حضرت میاں عمر چمکنی کے بیان پر اس باب نسب کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔ کہ حضرت میاں عمر جو ۱۰۸۵ھ میں سرزمین پنجاب میں دریائے راوی کے کنارے پر واقع قصبہ فرید آباد میں محمد ابراہیم کے گھر پیدا ہوئے۔ نسلاً شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے آزاد علاقہ باجوڑ کے قبیلہ موسیٰ خیل ترکانی سے تعلق رکھتے تھے۔ فرید آباد میں جب ان کے والد ماجد فوت ہوئے تو وہ اپنے نانا ملک محمد سعید کے ساتھ موضع چمکنی آکر مقیم ہو گئے ۱۱۹۰ھ میں موضع چمکنی پشاور میں وفات پائی یہیں پر آپ کا مزار ہے۔ اور اسی مناسبت سے میاں عمر چمکنی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

آپ بہت بڑے عالم، مدبر، مورخ اور مصنّف تھے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اور تمام قوم پختون کے پیر اور استاذ مانے جاتے تھے۔ قوم کی طرف سے ان کو غوث الافغان کا خطاب ملا تھا۔ قوم اور دین کی انہوں نے بہت خدمت کی ہے اور اسی طرح پشتو زبان

کی بھی، یہ ان ہی کی شخصیت اور تدبر تھا کہ ہندوستان میں مرہٹوں کو شکست کھانی پڑی۔ احمد شاہ ابدالی ان کے بہت معتقد تھے۔ اور ان کی سلطنت کے مضبوط ہونے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا انہی کے مشورہ سے احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں پر فوج کشی کی تھی عوسیا خیل اور خشی قبائل کے سرداروں کو مع ان کے جوانوں کے مرہٹہ کے مقابلہ کے لئے ہندوستان کو احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں شامل کر کے پانی پت کی لڑائی میں بھجوایا۔ جس سے احمد شاہ کی فوج کی ہمت اور شجاعت میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ جو یوسف زئی افغان روہیلکھنڈ (ہندوستان) میں تھے۔ ان کی وہاں سلطنت تھی۔ اور فرمانروا وہاں کے حافظ رحمت خان اور نجیب الدولہ تھے ان کے ساتھ میاں عمر نے رابطہ قائم کیا۔ اور وہاں سے تقریباً چالیس ہزار افغان نجیب الدولہ کی سرکردگی میں احمد شاہ ابدالی سے آملے۔ اور ان کی فوج میں شامل ہوگئے مرہٹوں کا بڑا زور تھا۔ تمام پنجاب اور ہندوستان پر وہ قابض تھے۔ پانی پت کے مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ بڑی خونریز لڑائی ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تقریباً تین لاکھ مرہٹے کام آئے اور باقی بھاگ گئے۔

احمد شاہ ابدالی جب کبھی پشاور آتے تھے تو چمکنی ضرور باریابی کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ اور ہر اقدام سے پہلے ان سے صلاح ومشورہ کرتے تھے۔

پانی پت کی فتح کے بعد احمد شاہ ابدالی افغانوں کی شجاعت کا لوہا مان چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے میاں عمر کے مشورہ سے افغان کے نام پر اس علاقے کا نام افغانستان رکھا جسے کبھی خراسان سجستان اور زابلستان کہتے تھے اور یوں افغانستان معرض وجود میں آیا۔

در کشادہ باد بہ دولت ہمیشہ ایں درگاہ   بحق اشہد ان لا الہ الا اللہ

اب بھی خدا کے فضل وکرم سے وہ نام موجود ہے اور حکمران بھی افغان ہی ہے مگر افسوس کہ وہ حدود جو احمد شاہ ابدالی قائم کر گئے تھے۔ وہ امیر شیر علی خان اور عبد الرحمٰن خان شاہ افغانستان کے دور حکومت میں بوجہ باہمی اختلافات کے نہ رہے۔ شمال کی طرف سے روس اور جنوب

مشرق کی طرف انگریزوں نے کچھ علاقوں پر قبضہ کیا۔ اس پر عبدالرحمٰن خان نے اپنی کتاب "دبدبہ امیری" میں افسوس کا اظہار کیا ہے۔

اب یہاں نسب کے بارے میں حضرت میاں عمر صاحب چمکنی کے چند اقوال کتاب "یوسف زئی افغان" طبع چہارم ۱۹۷۳ء ضمیمہ نمبر ا سے پیش کئے جاتے ہیں۔

آپ کی تالیفات میں سے شمائل النبی برزبان پشتو کو خاص شہرت حاصل رہی ہے اس کتاب کا وہ قلمی نسخہ جو ۱۱۷۲ء کا تحریر کردہ ہے اور اس وقت پشاور شہر میں محلہ بالا مانی جناب سید افضل ہمدانی بنوری مرحوم کے مدرسہ رفیع الاسلام کے کتب خانہ میں موجود ہے اس میں حضرت میاں عمر چمکنی فرماتے ہیں۔

" محمد عمر ابن ابراہیم بنی اسرائیلی سڑہ بنی شمائل راؤ ړہ
پہ پښتو زیہ چہ طالبان تے پہ لوستُ شي خوشحال "

ترجمہ: محمد عمر ابن ابراہیم اسرائیلی سڑہ بنی نے شمائل النبی، پشتو زبان میں تحریر کی تاکہ طالب علم اس کے پڑھنے سے خوشحال ہوں۔

ان کی ایک اور کتاب خلاصہ کیدانی افغانی ہے اس میں انہوں نے اپنے آپ کو پختون اور افغان دونوں ناموں سے یاد کیا ہے اور اپنا شجرہ نسب یہودا ابن یعقوبؑ سے جا ملایا ہے۔

تیسری کتاب کا پورا نام المعانی شرح آمالی ہے۔ یہ کتاب میاں عمر نے ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء میں تالیف کی ہے۔ اور یہ اگرچہ علم عقائد سے تعلق رکھتی ہے تاہم درمیان میں جگہ جگہ تاریخی مضامین بھی درج کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر دیباچہ میں اپنے حالات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔

" پس یہ فقیر محمد عمر ابن محمد ابراہیم محمدی مشرب ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جہت نسب سے مشہور افغان سے ہے اور واقعات حقیقت میں افغان ہونے کے علاوہ اپنی طرف کسی دوسرے قسم کی نسبت کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن

چونکہ اپنے نسب سے انکار کرنے پر وعید یعنی سزا کا حکم وارد ہے اس وجہ سے جو بات کہ نفس الامر میں سچی ہے لکھی جاتی ہے ۔

میرے والد ماجد جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اس کا نام ابراہیم ہے نسب سے افغان ہے اور افغان مذکور ملک طالوت کی اولاد میں سے اور ملک طالوت بنی اسرائیل میں سے ہے ۔ اور اسرائیل ایک نام ہے ۔ جو عبارت ہے مہتر یعقوبؑ سے جو اسحاقؑ کا فرزند ہے اور اسحاقؑ حضرت ابراہیمؑ کے فرزند ہیں علیہم السلام۔،،

گذشتہ بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ افغان قوم کے مشائخ، علماء و امراء، عوام و خواص، مرد و زن، بادشاہ، بزرگانِ دین، فقیر، نواب سب اس پر متفق چلے آرہے ہیں کہ افغان نسلِ ابراہیمی اور بنی اسرائیلی ہیں لہٰذا اِس فیصلے کے خلاف کسی غیر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس میں تاویل کرے۔ اپنے آباؤ اجداد کے متعلق اُن کی اولاد کا کہنا زیادہ معتبر ہوتا ہے بہ نسبت غیروں کے۔ اور ان لوگوں کو جو بزرگان دین کے مذکورہ عقیدے اور رائے کے خلاف سوچتے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے سبق حاصل کریں جو ذیل میں درج ہے،

ابن خلدون لکھتا ہے ،، کہ جس زمانہ میں عرب کے وفود اسلام لانے کے لئے نبی کریمؐ کے پاس آتے تھے تو عرب کے شاہی خاندان کا ایک وفد کندہ سے آیا اس کے سردار اشعث نے اثناء کلام میں آپ سے عرض کیا۔ ہم لوگ آکل المرار کی اولاد ہیں اور آپ بھی آکل المرار کے لڑکے ہیں، یعنی ہم اور آپ ایک خاندان کے ہیں۔ آنحضرتؐ نے یہ کلام سُن کر ہنس کر فرمایا، نہیں! ہم نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں۔ نہ تو ہم اپنی ماں پر تہمت لگاتے ہیں اور نہ اپنے باپ سے انکار کرتے ہیں۔،،

الغرض کافی تحقیق کے بعد میری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان جو نسلِ افغان سے متعلق ہیں ان کو بھی اپنے اجداد کے اقوال و اعمال اور معلومات پر یقین کامل رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ نسب کے بارے میں اِن کی معلومات کی نسبت ان کے بزرگ زیادہ حقیقت، خلوص

اور سمجھ داری پر تھے وہ اپنی اصل نسل خوب جانتے تھے اور جیسا کہ ہم اُن کے وارث ہیں۔ تو ہمیں اپنے مورثِ اعلیٰ کی اس وراثت پر جو نسب کے بارے میں ہے، بغیر شک و شبہ مضبوطی سے قائم رہنا چاہیئے۔ سیاست کے لئے دوسرے حربے بھی بہت ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ افغان اور پختون سب ایک ہی قوم اور سامی النسل ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ اگر وہ اپنا شجرہ نسب قیس سے آگے نہیں لے جا سکتے تو اس میں عیب کی کوئی بات نہیں۔ دنیا کی کوئی قوم اپنا شجرہ پوری طرح نہیں بیان کر سکتی۔

افغان بنی اسرائیل ہیں

ایک نامور عالم و فاضل اور مورخ مولوی نجم الغنی خان رامپوری اپنی تصنیف اخبار الصنادید جلد اول (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۸ء) میں لکھتے ہیں کہ:۔

...... افغانوں کے نسب پر جو اعتراض تم نے سنے ان کا مآل یہ ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل نہیں لیکن افغانوں میں یہ متفق علیہ تاریخی امر ہے کہ قیس مورثِ اعلیٰ اُن کا بنی اسرائیل میں سے تھا۔ یہ بات یہودیوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں یعنی تینوں فرقوں نے بالاتفاق تسلیم کی ہے کہ حضرت عیسیٰ سے قریباً سات سو برس پہلے (اشوریوں اور) بخت نصر بابلی نے بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے (نینوا اور) بابل میں پہنچا دیا تھا اور اس حادثے کے بعد بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے صرف دو قبیلے یعنی یہودا اور بنیامین اپنے ملک میں واپس آئے اور دس قبائل ان کے (کلہم) مشرق میں رہے اور چونکہ اب تک یہود پتا نہیں بتلا سکتے کہ وہ قبائل کہاں ہیں اور نہ انہوں نے ان سے خط و کتابت اور رشتہ کا تعلق رکھا۔ اس لئے اس واقعہ سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ انجام کار وہ قومیں مسلمان ہو گئی ہوں گی پھر جب ہم اس قصے کو اس جگہ چھوڑ کر افغانوں کی سوانح پر نظر کرتے ہیں کہ وہ اپنے باپ اور

دادوں سے قدیم سے یہ سنتے آئے ہیں کہ دراصل وہ اسرائیلی ہیں تو اس امر میں کچھ بھی شک وشبہ نہیں رہتا کہ یہ لوگ انہیں جلاوطن دس قبائل میں سے ہیں جو مشرق میں ناپید نشانی بتلائے جاتے ہیں اور انہیں اسرائیلیوں میں سے کشمیری بھی ہیں جو اپنی شکل اور پیرایہ میں افغانوں سے بہت کچھ ملتے ہیں ایسے امر کی بحث کے وقت جس کو ایک قوم پشت بہ پشت اپنے خاندان اور نسب کی نسبت تسلیم کرتی چلی آئی ہو یہ بالکل نامناسب ہے کہ ہم چند بیہودہ قیاسوں کو ہاتھ میں لے کر ان کے مسلمات کو رد کر دیں۔ اگر ایسا کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی قوم بھی اپنی صحت قومیت کو ثابت نہیں کر سکتی۔ پھر جب کہ افغانان اپنے تئیں اسرائیلی ظاہر کرتے ہیں تو سخت بے وقوفی ہوگی۔ کہ خواہ نخواہ ان کے مسلمات قدیمہ سے انکار کیا جائے قوموں کی جانچ پڑتال میں یہی کافی ثبوت اور اطمینان کے لئے واضح استقامت ہے کہ جو کسی قوم میں ان کے خاندان اور قومیت کی نسبت مشہور واقعات ہوں ان کو مان لیا جائے اور ایسے امور میں اس سے زیادہ ثبوت ممکن ہی نہیں کہ ایک قوم باوجود اپنی کثرت برادری اور کثرت و انتشار نطفہ کے ایک قول پر متفق ہو اور اگر یہ ثبوت قابل اعتبار نہ ہو تو پھر اس زمانے میں مسلمانوں کی جس قدر قومیں ہیں۔ مثلاً سید اور قریش اور مغل وغیرہ یہ سب بے ثبوت اور صرف زبانی دعوے ٹھہریں گے لیکن یہ ہماری سخت غلطی ہوگی کہ ہم ان اخبار مشہور و متواترہ کو نظر انداز کریں جو ہر ایک قوم اپنی صحت قومیت کے بارے میں بطور تاریخی امر کے اپنے پاس رکھتی ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنے خاندان کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ مبالغات کر دے مگر ہمیں نہیں چاہیئے کہ مبالغات کو دیکھ کر یا کئی فضول اور بے ربط باتیں پا کر اصل امر کو بھی رد کر دیں بلکہ مناسب تو یہ ہے کہ وہ زوائد جو درحقیقت فضول معلوم ہوں

چھوڑدیئے جائیں۔ اور نفس الامر کو جس پر قوم کا اتفاق ہے لیا جائے۔ پس اس طریق سے ہر ایک محقق کو ماننا پڑے گا کہ قوم افغان ضرور بنی اسرائیل ہے۔ ہر ایک کو خود اپنے نفس کو اور اپنی قوم کو زیر بحث رکھ کر سوچنا چاہیئے کہ اگر وہ قوم جس میں وہ اپنے تئیں داخل سمجھتا ہے کوئی دوسرا شخص محض چند قیاسی باتیں مدنظر رکھ کر اس قوم سے اس کو خارج کر دے اور تسلیم نہ کرے کہ وہ اس قوم میں سے ہے اور اس کے ان ثبوتوں کو جو پشت بہ پشت کے بیانات سے معلوم ہوتے ہیں، نظر انداز کرے اور مجمع عظیم کے اتفاق کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھے تو ایسا آدمی کیسا فتنہ انگیز معلوم ہوتا ہے پس بقول شخصے "ہرچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند"۔ یہ بھی نامناسب ہے کہ دوسروں کی قسم قومیت پر جو ایک بڑی قومی اتفاق سے مانی گئی ہے ناحق کی جرح کی جائے ہمیں کیا حق پہنچتا ہے اور ہمارے پاس کیا دلیل کہ ہم ایک قوم کے مسلّمات اور متفق علیہ امر کو یوں ہی زبان سے رد کر دیں۔ جب ایک امر منقولی اتفاق سے صحیح قرار دیا گیا ہے تو اس کے بعد قیاس کی گنجائش نہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ بہت سی باتیں فضولی اور شیخی کے طور پر بعض قوموں کے لوگ اپنی قومیت کی نسبت بیان کرتے ہیں لیکن محقق لوگ فضول باتوں کی وجہ سے اصل واقعات کو ہرگز نہیں چھوڑتے، خُذ ما صفا ودع ما کدر، پر عمل کر لیتے ہیں۔ مثلاً گوتم بدھ کے سوانح میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ منہ کی راہ سے پیدا ہوا تھا لیکن جب ہم گوتم کے سوانح لکھنا چاہیں تو ہمیں نہیں چاہیئے کہ منہ کی راہ کی پیدائش پر نظر ڈال کر بدھ کے اصل وجود ہی سے انکار کر دیں۔ اسی طرح جب کسی خاندان کا پتہ ایک معلوم حد تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ تو پرانی باتوں پر فخر کرنے والے لوگ آسمانی پیدائش بننے کو چاند اور سورج وغیرہ سے سلسلہ جا ملاتے ہیں۔ چنانچہ راجپوتوں کی شاخ میں چندر بنسی اور سورج بنسی

دو بڑے مشہور خاندان ہیں پھر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کا کوئی مورث اعلیٰ نہ ہوگا اسی طرح راجپوتوں میں ایک شاخ آگ بنسی ہے جو خود کو آگ کی پیدائش بتلاتے ہیں تو اس قصے کی بات سے ان کی قومیت اور وجود سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ تاریخ نویسی ایک بڑا نازک امر ہے اس میں وہ شخص جادہ استقامت پر رہتا ہے جو افراط و تفریط دونوں سے پرہیز کرے۔ یہ اعتراض بھی ٹھیک نہیں ہے کہ اگر افغان لوگ عبرانی الاصل تھے تو ان کے ناموں میں کیوں عبرانی لفظ نہیں اور ان کا شجرہ پیش کردہ توریت کے بعض مقامات سے کیوں اختلاف رکھتا ہے۔ یہ سب قیاسی باتیں ہیں جو قومی تاریخ اور تواتر کو مٹا نہیں سکتیں۔ دیکھو نبی علیہ السلام نے قریش کے اس شجرے کو صحیح نہیں قرار دیا جو وہ لوگ حضرت اسماعیل تک پہنچایا کرتے تھے اور بجز چند پشت کے باقی سے سکوت فرمایا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قریش بنی اسماعیل نہیں ہیں پھر جب کہ قریش جو علم انساب میں بڑے حریص تھے تفصیل وار سلسلہ یاد نہ رکھ سکے۔ تو یہ قوم افغان جن میں اکثر غفلت میں زندگی بسر کرنے والے گزرے ہیں اگر انہوں نے اپنے سلسلے کی تفاصیل بیان کرنے میں غلطی کی یا کچھ جھوٹ ملایا تو اصل مقصد میں کیا فرق آ سکتا ہے۔ اور اب توریت بھی کون سی ایسی محفوظ ہے جو نص قطعی کا حکم رکھتی ہو۔ غرض یہ نکتہ چینی خوب نہیں اور یہ بات بھی صحیح نہیں کہ افغانوں کے نام عبرانی طرز پر نہیں۔ بھلا بتاؤ کہ یوسف زئی، داؤد زئی، سلیمان زئی اور موسیٰ خیل، یہ عبرانیوں کے نام ہیں۔ یا کچھ اور ہے۔ ہاں جب یہ لوگ دوسرے ملکوں میں آئے تو ان ملکوں کا رنگ بھی ان کی بول چال میں آگیا۔ دیکھو سادات کے نام بھی ہمارے ملک میں چمن شاہ اور گمن شاہ اور متو شاہ وغیرہ پائے جاتے ہیں تو کیا اب ان کو سید نہیں کہو گے؟

کیا یہ عربی نام ہیں غرض یہ بیہودہ نکتہ چینی اور نہایت قابل شرم خیالات ہیں۔ ہم قوم کے متواترات سے کیوں انکار کریں۔ اس سے عمدہ تر اور صاف تر ذریعہ حقیقت شناسی کا ہمارے ہاتھ میں کون سا ہے کہ خود وہ قوم، جس کی اصلیت ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں، ایک امر پر اتفاق رکھتی ہے۔ ماسوا اس کے دوسرے قرائن صاف بتلا رہے ہیں کہ حقیقت میں یہ لوگ اسرائیلی ہیں۔ مثلاً ایک قرینہ افغانوں کے بنی اسرائیل ہونے پر یہ ہے کہ افغانوں کا یہ بیان کہ قیس ہمارا مورث اعلیٰ ہے ان کے بنی اسرائیل ہونے کی تائید کرتا ہے کیونکہ یہودیوں کی کتاب مقدس میں جو کتاب پہلی تاریخ کے نام سے موسوم ہے اس میں باب ۹ آیت ۳۹ میں قیس کا ذکر ہے۔ اور وہ بنی اسرائیل میں سے تھا اس سے ہمیں پتہ ملتا ہے کہ یا تو اسی قیس کی اولاد میں سے کوئی دوسرا قیس ہوگا جو مسلمان ہوگیا ہوگا اور یا یہ مسلمان ہونے والے کا کوئی نام ہوگا اور وہ اس قیس کی اولاد میں سے ہوگا اور پھر بباعث خطائے حافظہ اس کا نام بھی قیس سمجھا گیا بہر حال ایک ایسی قوم کے منہ سے قیس کا لفظ نکلنا جس کو یہودیوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رہا تھا اور محض ناخواندہ تھی۔ یقینی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قیس کا لفظ اپنے آباؤ اجداد سے سنا تھا کہ ان کا مورث اعلیٰ ہے۔''

اس کے بعد مصنف مذکور نے کافی دلائل اور قرآئن سے ثابت کرنے کے بعد آخر میں بحث ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

''پھر جبکہ افغانوں کی قوم کے اسرائیلی ہونے میں اتنے قرآئن موجود ہیں اور خود وہ تعامل کے طور اپنے باپ دادوں سے سنتے آئے ہیں کہ وہ قوم اسرائیلی ہیں اور یہ باتیں ان کی قوم میں واقعات شہرت یافتہ ہیں تو سخت ناانصافی ہوگی کہ ہم تحکم کے طور سے ان کے بیانات سے انکار کریں۔ ذرا یہ تو سوچنا کہ ان کے دلائل

کے مقابلے پر ہمارے ہاتھ میں انکار کی کیا دلیل ہے یہ ایک قانونی مسئلہ ہے کہ ہر ایک پرانی دستاویز جو چالیس برس سے زیادہ کی ہو وہ اپنی صحت کا آپ ثبوت ہوتی ہے۔ پھر جبکہ صدہا سال سے دوسری قوموں کی طرح، جو اپنی اپنی اصلیت بیان کرتی ہیں۔ افغان لوگ اپنی اصلیت قوم بنی اسرائیلی قرار دیتے ہیں تو ہم کیوں جھگڑا کریں۔ اور کیا وجہ کہ ہم قبول نہ کریں یاد رہے کہ یہ ایک دو کا بیان نہیں یہ ایک قوم کا بیان ہے جو لاکھوں انسانوں کا مجموعہ ہے اور پشت بہ پشت گواہی دیتے چلے آئے ہیں۔،،

زبان

اس قوم کی زبان پختو (پشتو) ہے اور بعض اسے افغانی بھی کہتے ہیں اب یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ زبان وہ اپنے ساتھ لاتے تھے یا یہاں آکر بنائی۔ بہرحال قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ زبان صرف افغان قوم ہی استعمال کرتی چلی آرہی ہے گو کہ اور بھی کئی قومیں یہاں آباد ہیں اس قوم کو ملک شام اور اس کے مضافات کو چھوڑے ہوئے ۲۷۰۰ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اتنے طویل عرصہ کے دوران میں بہت تحقیق کے بعد بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ زبان کسی اور قوم نے بھی استعمال کی ہو۔ کیونکہ پہلے پہل جب یہ لوگ یہاں آئے تو اس وقت دیگر اقوام مثلاً آرین کے مختلف قبائل میڈی منگولین اور تاتارین وغیرہ پہلے سے آباد تھے محققین نے یہ بھی معلوم کیا کہ عبرانی زبان کو بھی بہت حد تک یہ لوگ بھلا بیٹھے تھے جیسے شام کے مورخ فلپ کے حتی لکھتے ہیں:۔

”وہ یہودی جو بابل سے یروشلم آئے تھے۔ زربابل اور نحمیاہ کے ماتحت یہودی ایک خاص درجہ خود اختیاری سے مستفید رہے۔ لیکن عبرانی زبان صرف اسی وجہ سے ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ جلاوطن ہو گئے تھے اور انہیں غیر وطن میں رہنا پڑا تھا جہاں کی بولی دوسری تھی۔ بلکہ یہود (کے وطن) میں بھی یہ زبان ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ آرامی زبان نے لے لی تھی۔ عبرانی کی

حیثیت محض ایک مقدس زبان کی رہ گئی تھی۔ اور یہودی خود سرکاری خط و کتابت میں آرامی زبان ہی استعمال کرتے تھے۔ عبرانی اگرچہ مرگئی تھی۔ لیکن اس نے بہت سی مہذب زبانوں، کے لئے الفاظ کی ایک میراث چھوڑی۔ انگریزی زبان میں جو نام بہت عام ہیں مثلاً جان، جوزف پال، میری، یہ سب عبرانی الاصل ہیں۔"

اس کے علاوہ انگریزی میں سگنل اور ویلڈنگ جو عبرانی اور پختو زبان کے سنگل اور ویلی کے مترادف ہیں، بھی موجود ہیں۔

الغرض اس کی روشنی میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے کچھ عبرانی الفاظ کچھ آس پاس کی پڑوسی آرامی، سریانی اور اکادی زبانوں سے لے کر اپنے لئے ایک دوسرے کو سمجھانے کی خاطر وہاں شام میں اس زبان کی بنیاد ڈالی ہو۔ کیونکہ عبرانی بھلانے سے ان کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ گزر اوقات کے لئے کوئی زبان اختیار کریں۔ چنانچہ انہوں نے اس وقت جو زبان اختیار کی اس کا نام پختو ہوا۔ پختو کا لفظ اس سے بھی مشابہت رکھتا ہے کہ وادی پخت موآب شرق اردن شام میں جو قبیلہ رہائش پذیر تھا وہ بنی بخت تھا۔ اور بخت سے پختون اور پختو کا ہونا قرین قیاس ہے جب سے یہ لوگ اس علاقہ میں آئے ہیں تو اسی وقت سے انہوں نے اپنی الگ قومیت قائم رکھی ہے اور اپنی زبان پختو کو محفوظ رکھا ہے اگرچہ دوسری اقوام کے ساتھ کافی حد تک مشترک رہ چکے ہیں۔ ان کے ساتھ معاملات اور روزگار رکھنا لازمی تھا اس لئے انہی کی زبان میں ان سے بات چیت کرنے پر مجبور تھے۔ زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد ظاہری شکل و شباہت اور لباس ان کا ایک جیسا ہو گیا تھا۔ اس وقت ان کی شناخت ہی صرف ان کی اپنی زبان پختو ہی سے ہوتی تھی جیسا کہ مغلوں کے دور میں جب ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی آپس میں جھڑپیں ہوئیں اُس وقت کے حالات اخوند درویزہ اپنی تصنیف "تذکرہ میں سید علی ترمذی المعروف پیر بابا" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انہوں نے خود دیکھا کہ ہمایوں جب ہندوستان میں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر

پسپا ہوا۔ تو شیر شاہ سوری اس کے تعاقب میں تھا تو ان کے لشکر کے سپاہی دوسرے کو صرف زبان ہی سے پہچانتے تھے۔ جو پختو زبان نہیں بول سکتا تھا اسے مغل بادشاہ کا سپاہی تصور کیا جاتا تھا۔ اور اسے پکڑ لیتے تھے، کیونکہ خدوخال اور شکل و شباہت اور لباس ان کے ایک ہی جیسے تھے۔ اور وہ ایک ہی ملک خراسان کے رہنے والے تھے۔ لیکن پختون نہ تھے۔ غیر پختون کو پشتو نہیں آتی تھی۔

اس سلسلے میں ایک اور مثال پیش خدمت ہے تاکہ سب پر واضح ہو جائے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد تک بھی پورے ہندوستان میں پٹھانوں کی اپنی گھریلو زبان پشتو ہی تھی۔ جس کا ثبوت سرسید احمد خاں کے سوانح حیات سے ظاہر ہے۔ وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں بجنور میں تحصیلداری کے عہدے پر فائز تھے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ "جب میں بجنور میں تحصیلدار تھا تو غدر کے ایام میں نجیب آباد سے پٹھان لوگ آئے تھے جن کا سرگروہ کلو خان کا بیٹا تھا جو نجیب الدولہ کا پوتا ہے۔ یہ لوگ بجنور کے ایک باغ میں جمع تھے اور آپس میں مشورہ کر رہے تھے لیکن ان کی گفتگو کوئی نہیں سمجھا کہ یہ کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستانی پٹھان آپس میں اپنی ہی زبان پشتو میں گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے رات کے آخری حصے میں انگریزوں پر حملہ کر دیا۔"

اسی طرح تاریخ مگدہ کا مصنف بھی لکھتا ہے کہ بہار، اڑیسہ، اور بنگال، میں افغان اپنے آپس میں پشتو استعمال کرتے تھے۔ اور ان کے ہاں اپنی زبان محفوظ تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ زبان افغان قوم نے دوسری قوموں سے سیکھی تو ضروری تھا کہ وہ دوسری قومیں بھی اس زبان پر حاوی ہوتیں۔ کیونکہ وہ ان کے ساتھ ایک ہی سرزمین پر رہتے تھے، لیکن ایسا ہرگز نہیں بلکہ افغانوں اور ان کے متعلقین کی زبان ہے۔

پختو کو اس قوم کی صرف زبان ہی کا نہیں بلکہ اسے اس قوم کے آئین کا درجہ بھی حاصل ہے اور وہ اسے بطور اپنے قانون، عزت و احترام اور قومی آزادی کی خاطر بھی استعمال کرتے

رہے ہیں۔ اب بھی افغان قوم کے لوگ کسی دیرینہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ پختو (آزادی) کے وقت میں یہ کام ہوا۔ اور غیرت کے مقام پر خصوصاً کہتے ہیں کہ یہ کیا پختو ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ قوم قائم بھی اسی قانون پر ہے چنانچہ اس کے احترام و بقا کی خاطر جب یہ ہندوستان پر قابض ہوئے اور وہاں اپنی سلطنتیں قائم کیں تو جب تک وہ اپنی پختو (پشتو) زبان کی قدر کرتے رہے اور اس پر قائم رہے۔ اس وقت تک ان میں برتری کا جذبہ اور احساس بھی موجود رہا اور جب انگریز کے آنے کے بعد انہوں نے اپنی زبان کو بھلا دیا تو گویا تمام سرمایہ ہی لٹ گیا اور یہ ایسے احساس کمتری میں مبتلا ہوئے کہ رہی سہی حکومتیں ختم ہو گئیں اور یہ غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

پٹھانوں کی عام زندگی

پٹھانوں کی اخلاقی طاقت، اس کی سپاہیانہ بہادری اور سیاسی معاملات میں اس کی تیز فہمی ہی نے اس کے اجداد کو اپنے وطن سے دُور حاکمانہ اختیارات عطا کئے تھے۔ (سراولف کیرو)

پٹھان اپنی عام زندگی میں سادگی پسند اور جفاکش دکھائی دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے اسے ماحول ہی ایسا عطا کیا جس میں محنت و مشقت اور جفاکشی کے سوا گزر ہی مشکل ہے۔ اس کی پیدائش، اس کی طفولیت اور اس کا عہدِ شباب انہی سنگلاخ پہاڑیوں میں گزرتا ہے۔ پیدائش کے وقت سے ہی بوئے آزادی اس کے دماغ کو معطر رکھتی ہے اور جب ہوش سنبھالتا ہے تو اپنے آپ کو آزاد فضا میں آزاد شہری کی حیثیت سے دیکھ کر فطرتاً اپنی آزادی کے قیام و بقا کے لئے ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ آزادی کے قصے کہانیاں سنتا ہے۔ قومی روایات اور تاریخی واقعات سے بہرہ مند ہوتا ہے اور اپنے بزرگوں کی زبانی گزشتہ ادوار کے

حالات سن کر گرد و پیش کی واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے اپنے حجرہ میں بتایا جاتا ہے کہ آزادی وطن یا آزادی قبیلہ یا آزادی خاندان کے لئے اس کے والدین یا متعلقین یا اجداد کس طرح قربانی دے چکے ہیں تو اس میں بھی وہی جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی تحفظ آزادی اور ننگ و ناموس کے لئے اپنے آپ کو ہر وقت مسلح رکھنے کی فکر کرتا ہے۔

جاوید احسن خان "ندائے افغان ملتان" میں افغانوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :۔

"پٹھانوں کی زندگی دشت کی طرح سادہ اور پہاڑوں کی طرح عظیم ہوتی ہے۔ وہ اپنی دنیا کے آپ بادشاہ اور غیر کی اطاعت سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ ہتھیار سے محبت اور عورت کی نسوانیت کی حفاظت ان کا وصفِ خاص ہے۔ مذہب اور عزت کے معاملہ میں سر سے گزر جانا ان کا جوہرِ مردانگی ہے۔ ان کی مہمان نوازی اور دوست داری ضرب المثل ہے۔ محبت اور غیرت ان کے خون میں شامل ہے۔ ان کی شخصیت میں قوت اور شوکت اور آواز میں آزادی کی گونج پائی جاتی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو اپنا طرۂ دستار تاج شاہی سے کم نہیں جانتے۔"

خدّ و خال

افغان بدن سے مضبوط، جسم سے ہیبت ناک اور رعب دار ہے، اور چست و چابک دست ہے۔ سمجھ داری میں بے مثل ہے۔ شہروں میں رہنے والے دیہاتی یا پہاڑوں میں بسنے والوں میں کوئی فرق نہیں۔ دنیا کی سیاست سے باخبر ہوتے ہیں۔ وہ دلاور، نڈر اور نشانہ باز ہیں۔ اور مرد و زن خوبصورتی میں لاثانی ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے ہیں جیسا کہ خوشحال خان بابا کہتے ہیں کہ :۔

"پہ خائست باندِ ئے ختمہ داویناوہ ؛ چہ لہ قومہ دیعقوب عالی تبار دی"
(افغانوں کے خداداد حُسن پر یہ بات قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی عالی تبار خاندان سے ہیں)

جسارت اور صاف گوئی میں لاثانی پٹھانوں کو دیگر اوصاف کے علاوہ قدرت نے جسارت اور صاف گوئی جیسا بہترین وصف بھی عطا کیا ہے مثال کے طور پر جب مولنٰا محمد علی جوہر گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن گئے تھے تو وہاں کے اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" نے ان کی تصویر شائع کرنیکے ساتھ لکھا۔ مولنٰا موصوف نے اپنا عقیدہ تبدیل کر دیا ہے ۔ اس کے جواب میں مولنٰا محمد علی جوہر نے جسارت اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے فرمایا :۔

"ڈیلی ہیرلڈ اخبار جیسے مضبوط بنانے میں میں نے بھی حصہ لیا تھا۔ غلط بیانی سے کام لیا ہے حالانکہ میری رگوں میں وہی خون ہے جس سے لارڈ ریڈنگ (وائسرائے ہند جو نسلاً یہودی تھے) کی رگیں معمور ہیں جنہوں نے مجھے قید کیا تھا۔ میں سامی النسل اور بنی اسرائیل سے ہوں لہذا اگر لارڈ ریڈنگ نے صیہونیت سے برگشتگی اختیار نہیں کی۔ تو میں نے اسلام کو ترک نہیں کیا۔ میں جہاں تھا وہیں ہوں"۔ (محمد علی جوہر ص۸۳ مرتبہ ادارۂ تصنیف و تالیف شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

معلوم رہے کہ محمد علی، شوکت علی (علی برادران) نسلاً میر احمد خیل صدوزئی منڈر یوسفزئی افغان تھے۔ اُن کا جدِ اعلیٰ حیات خان بن ملا محمد خان ملاخیل کندے یارہ خیل موضع مرغز تحصیل صوابی علاقہ پشاور سے ہندوستان جاکر روہیلکھنڈ میں مقیم ہوئے تھے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے چند سال پیشتر ۱۹۳۶ء مولانا شوکت علی مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کیلئے موضع ترلاندی ضلع مردان آئے تھے اور جب فارغ ہوئے تو اپنے گاؤں مرغز جانیکا ارادہ ظاہر کیا۔ ہم نے (صدر بخت جمال خان، مولانا شاد محمد، روشن خان اور میاں ضیاءالدین بیرسٹر) ازراہِ مذاق کہا کہ مرغز کے سب لوگ تو سرخپوش ہیں۔ اُنہوں نے ہنس کر جواب دیا کہ میں مسلم لیگ کے سلسلہ میں نہیں بلکہ وہاں اپنے خاندان کے قبرستان پر فاتحہ خوانی اور اُن کے حُجرہ میں تھوڑی دیر بیٹھنے کی غرض سے جارہا ہوں ۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا اور وہاں پر ایک جمِ غفیر نے اُن کی آؤ بھگت کی ۔ میاں ضیاالدین انکے ساتھ تھے۔

۱؎ لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور اُنہوں نے اپنی اہلیہ کے نام پر تعمیر کیا تھا۔

حرفِ آخر :-

اس وقت جبکہ کتاب "تذکرہ" کے آخری صفحات بھی پریس کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان اور طباعت کی اغلاط کے بارے میں اپنا عذر بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔

میری مادری زبان پشتو ہے۔ اردو نہ تو میری مادری زبان ہے، نہ میں نے اس کی باقاعدہ تحصیل کی ہے اور لکھنے کی مشق تو "کتاب حواشی بر تواریخ حافظ رحمت خانی" کی تالیف سے پہلے بالکل نہ تھی۔ اس کے علاوہ یہاں میری ساری توجہ زبان کی درستگی اور عبارت آرائی کی بجائے صرف تاریخ کے بیان اور حقیقت کی ترجمانی پر مرکوز رہی ہے، اس لئے اگر آپ اس کی زبان میں تذکیر و تانیث یا واحد و جمع یا الفاظ کے تقدم و تاخر اور تراکیب میں غلطیاں پائیں تو یہ بات قرینِ قیاس ہے۔

جو غلطیاں ہیں وہ ایسی نہیں کہ ان کے لئے اغلاط نامہ لگانے کی ضرورت ہو۔ یہ کتاب عام قارئین کے لئے نہیں بلکہ طالب علموں اور اس کا خاص ذوق رکھنے والوں کی دلچسپی کی چیز ہے اور امید ہے کہ وہ ان اغلاط کی درستگی خود فرما لیں گے۔

آخر میں گزارش ہے کہ کسی علاقہ، ملک یا قوم کی تاریخ مرتب کرنا کوئی آسان کام نہیں خصوصاً ایسی حالت میں کہ اس علاقہ یا قوم کی پرانی دستاویزات دستیاب نہ ہوں یا ناپید ہو چکی ہوں اور صدیوں سے اس طرف توجہ نہ دی گئی ہو۔ بدیں وجہ زیرِ مطالعہ اوراق میں فروگزاشتوں کا ہونا ناگزیر ہے۔ ان حالات میں ہم قارئین سے یہی گزارش کریں گے کہ وہ ان پر ہمدردانہ نظر ڈالیں اور نکتہ چینی کرنے کی بجائے مجھے کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کی طرف متوجہ کریں اور مستند معلومات اور اپنے نیک مشوروں سے مجھے مستفید ہونے کا موقع دیں تاکہ اس کتاب کے آئندہ اشاعت کو اور زیادہ دلچسپ بنایا جا سکے۔

میں نے اپنی بساط کے مطابق ایک خاکہ پیش کرنے کی سعی کی ہے اور اللہ پاک کا شکرگزار ہوں کہ ہماری یہ ناچیز مساعی کو ہر جگہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ قریب ایک سال کی گردشِ قلم نے آج بتاریخ یکم جنوری ۱۹۸۰ء اپنی منزل کو پا لیا۔ خدا میری اس محنت کو حسنِ قبول کی دولت سے نوازے۔ آمین یارب العالمین۔

بحقِ حرمتِ افغان یہ ہے ملحوظ اے ملّت!
جگر پارہ کو اپنی تیری بر میں چھوڑے جاتا ہوں



والسلام

روشن خان بن محمد زمان خان

: موضع نواں کلی، صوابی، مردان، پشاور :

تواریخ حافظ رحمت خانی کے بارے میں ایک اہم مراسلہ

From: Abdul Ali Khan,
Officer on Special Duty.

F/40/77-Res



GOVERNMENT OF PAKISTAN
~~NATIONAL AFFAIRS WING~~
MINISTRY OF EDUCATION
520, 555, G-6/4
(Research Wing)
ISLAMABAD. April 9, 19

TELE : 22380
22449

My dear

It is an honour and pleasure to bring to your notice Roshan Khan's book " تواریخ حافظ رحمت خانی " in two volumes which I am sure the students of your institutions will find informative and useful.

With every good wish.

Yours sincerely,

Sd/-

(Abdul Ali Khan)

1. All the Vice Chancellors of the Universities.

2. All the Secretaries, Education (Provincial).

3. All the Directors Education, including D.P.Is & Directors Technical Education.

Copy to;-

1. The Director, Pushto Academy, University of Peshawar, with the request that publications of this nature may kindly be brought to the notice of Ministry of Education from time to time.

2. Mr. Roshan Khan, Village-Nawankali, Tehsil-Swabi, District - Mardan, NWFP., We have placed the copy sent to us in the Library of Research Wing.

(Abdul Ali Khan)

NOTE:

The publication is in Urdu and has been published by the Pashto Academy, University of Peshawar, Peshawar.

اس خط کا ترجمہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو ۔

ترجمہ

گورنمنٹ آف پاکستان
وزارت تعلیم
۵۲۰، ۵۵۵، جی - ۶/۴ (ریسرچ ونگ)
اسلام آباد۔ ۹ اپریل ۱۹۷۸ء

از طرف : عبدالعلی خان
افسر بکار خاص

مائی ڈیر
یہ امر میرے لئے باعث فخر ومسرت ہے کہ میں روشن خان کی کتاب "تواریخ حافظ رحمت خانی" جو دو حصوں میں ہے، کی طرف آپ کو متوجہ کروں جس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کے تعلیمی اداروں کے لئے بہت معلوماتی اور مفید ثابت ہوگی۔

نیک تمناؤں کے ساتھ
آپ کا مخلص
(شرح دستخط) عبدالعلی خان

۱۔ تمام یونی ورسٹیوں کے وائس چانسلروں کے نام
۲۔ تمام صوبائی محکمہ ہائے تعلیم کے سکریٹریوں کے نام
۳۔ محکمۂ تعلیم، پبلک انسٹرکشنز اور فنی تعلیم کے تمام ڈائرکٹروں کے نام

نقول برائے

۱۔ ڈائرکٹر پشتو اکیڈمی پشاور یونی ورسٹی پشاور۔ اس گذارش کے ساتھ کہ براہ کرم اس نوعیت کی تمام مطبوعات کو وقتاً فوقتاً وزارت تعلیم کے علم میں لایا جاتا رہے۔
۲۔ جناب روشن خان، موضع نواں کلی، تحصیل صوابی، ضلع مردان، صوبہ سرحد ہم نے آپ کی بھیجی ہوئی مذکورہ بالا کتاب (وزارت تعلیم کے) شعبۂ تحقیق کے کتب خانے میں رکھوا دی ہے۔

عبدالعلی خان

نوٹ :۔ مذکورہ بالا کتاب اردو میں ہے اور پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی پشاور نے اسے شائع کیا ہے۔

أَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟)

بصائر و عبر

❋ خلیفہ عبدالملک کے ہم جلیسوں میں سے کسی نے اس سے کہا کہ میں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں چنانچہ جب تخلیہ ہوگیا تو عبدالملک نے اس سے کہا کہ تم جو چاہو کہہ سکتے ہو مگر ان تین باتوں کا لحاظ رکھنا، ایک تو یہ کہ میری تعریف نہ کرنا کیونکہ میں اپنے آپ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں، دوسرے یہ کہ کسی کی غیبت نہ کرنا، میں اسے ہرگز نہ سنوں گا، تیسرے یہ کہ میرے سامنے جھوٹ مت بولنا کیونکہ جھوٹے کی کوئی رائے نہیں۔ یہ سن کر اس شخص نے کہا تو آپ مجھے واپس جانے کی اجازت دیجئے، عبدالملک نے کہا مناسب ہے۔" اپنے کسی عامل کے متعلق عبدالملک کو معلوم ہوا کہ اس نے تحفے قبول کئے ہیں، عبدالملک نے اسے اپنے پاس بلایا اور دریافت کیا کہ آیا اپنے تقرر کے زمانے سے اب تک تم نے کوئی تحفہ قبول کیا ہے؟ اس عامل نے جواب دیا۔ امیرالمومنین کا سارا علاقہ آباد ہے، آمدنی وافر ہے اور رعایا کی حالت بہترین ہے، عبدالملک نے کہا زیادہ باتیں مت کرو، جتنی بات دریافت کی گئی ہے اس کا جواب دو، یہ بتاؤ جب سے تم والی ہوئے ہو تم نے کوئی تحفہ قبول کیا ہے؟ اس نے اس کا اقرار کیا۔ عبدالملک نے کہا اگر تم نے کسی کا تحفہ قبول کیا اور پھر اس کا معاوضہ نہیں دیا تو تم لئیم ہو اور اگر تم نے تحفہ دینے والے کو کوئی ایسا حق دیدیا ہے جو اسے نہیں پہنچتا تھا اور اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو اس طرح اور کسی کے ساتھ تم نہیں کرتے تو ایسی حالت میں تم خائن ہو اور ظالم ہو۔ بہرحال جو کچھ تم نے کیا اس میں تمہاری دنائت ثابت ہوگی یا خیانت اور جہل صریح۔ عبدالملک نے اس عامل کو علیحدہ کردیا۔"

❋ عبدالملک نے حجاج کو لکھا کہ اسباب بغاوت کی تشریح کرو۔ حجاج نے لکھا: بغاوت سرگوشیوں سے شروع ہوتی ہے پھر علی الاعلان شکایت کی جاتی ہے اور آخر میں عظیم الشان خطرات پر منتہی ہوتی ہے۔ عبدالملک نے لکھا تم نے بالکل ٹھیک تعریف کی ہے، اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری رعایا ٹھیک رہے تو ان پر لازم کرو کہ وہ جماعت پر قائم رہیں۔ انہیں ان کی فوجی تقسیم کے مطابق معاش دو۔"

❋ حجاج نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے حمد و ثنا کے بعد کہا "اللہ نے دنیا کے لئے فنا اور آخرت کے لئے بقا لکھ دی ہے، جسے بقا دی اسے فنا نہیں اور جس کے لئے فنا لکھ دی ہے اسے بقا حاصل نہیں ہوسکتی۔ ایسی صورت میں مبادا یہ ظاہری دنیا تم کو فریب دے کر آخرت کو جو سامنے نہیں ہے، بھلا دے،

تو تعات کی کثرت مواقع کو کم کر دیتی ہے"۔

❁ ۸۷ھ میں جب خلیفہ ولید نے دمشق کی جامع مسجد کی تعمیر شروع کی تو اسے مسجد کی دیوار میں پتھر کی ایک تختی ملی۔ عالموں نے مطالعہ کے بعد کہا کہ یہ حضرت سلیمانؑ کے عہد کا کتبہ ہے۔ جب اسے پڑھا گیا تو اس میں یہ عبارت منقوش تھی:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اے بنی آدم اگر تُو دیکھ لے کہ تیری مختصر زندگی کا کتنا تھوڑا حصہ باقی ہے تو اپنی بقیہ زندگی میں امیدوں کا دامن کوتاہ کرلے اس طرح تو اپنی خواہشوں اور تدابیر کو کم کر دے۔ اُس وقت تجھے افسوس ہوگا جب تُو قبر میں اتارا جائے گا۔ تیرے اہل و عیال اور خدمت گار تجھے زمین کے سپرد کر کے چلتے بنے ہوں گے اور تیرے دوست اور قریبی رشتہ دار تجھے رخصت کر چکے ہوں گے۔ اُس وقت تجھے پکارا جائے گا، کوئی جواب نہ دے گا، نہ تُو اپنے گھر واپس جائے گا اور نہ اس کا کوئی موقع ہوگا کہ تُو اپنے عمل میں کچھ زیادتی کر سکے، موت سے پہلے زندگی کو غنیمت سمجھو، مجبوری سے پہلے وقت سے کام لو اور قبل اس کے کہ تجھے عذاب دیا جائے اور عمل کا کوئی موقع نہ رہے عمل کر لے۔ یہ تحریر سلیمان بن داؤد کے زمانہ میں لکھی گئی ہے"۔

❁ خلیفہ ہونے کے بعد سلیمان بن عبدالملک نے منبر پر چڑھ کر تقریر کی، جس میں حمد و ثنا کے بعد اُس نے کہا:۔ اے لوگو! کتاب اللہ کو اپنا امام بناؤ، اسی کو اپنا حاکم، رہنما اور رہبر بناؤ کیونکہ کلام اللہ تمام سابقہ منزل من اللہ کتابوں کا ناسخ ہے مگر اسے کوئی اور حکم منسوخ نہیں کر سکتا، جس طرح سپیدۂ سحری ظلمتِ شب کو روشن کر دیتی ہے اسی طرح کلام اللہ شیطان کے مکر و فریب اور ترغیب بے جا کو دور کر دیتا ہے"۔

❁ ابوحازم خلیفہ سلیمان بن عبدالملک سے ملنے آئے، سلیمان نے اُن سے کہا اے ابوحازم اِس کی کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو بُرا جانتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا اس لئے کہ تم نے دنیا کو آباد کیا ہے اور آخرت کو ویران کیا ہے اس لئے تم آبادی سے ویرانے میں جاتے ہوئے گھبراتے ہو۔ سلیمان نے پوچھا کیونکر اللہ کے سامنے جانا ہوگا۔ انہوں نے کہا نیک بندوں کے لئے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص تھوڑی

دیر کے لئے باہر چلا جاتا ہے اور پھر خوشی خوشی اپنے اہل و عزا کے پاس واپس آتا ہے اور بدکاروں کی مثال بھگوڑے غلام کی ہے کہ وہ بہت ہی خوفزدہ اور غمگین اپنے مالک کے سامنے آتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا سب سے بہتر عمل کیا ہے؟ انہوں نے کہا فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنا، محارم (برائی) سے بچنے کے ساتھ ساتھ۔ سلیمان نے پوچھا سب سے بہتر بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا اُس شخص کے سامنے جس سے تم کو خوف بھی ہے اور توقعات بھی ہیں کلمۂ حق کہنا۔ سلیمان نے پوچھا سب سے زیادہ عقلمند کون ہے؟ انہوں نے کہا جس نے اللہ کی اطاعت پر عمل کیا ہو۔ سلیمان نے پوچھا سب سے زیادہ جاہل کون ہے؟ انہوں نے کہا جس نے اپنی آخرت کو غیر کے دنیاوی منافع کے لئے بیچ دیا ہو۔ سلیمان نے کہا آپ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں اور اس میں اختصار سے کام لیجئے۔ انہوں نے کہا امیر المومنین! اللہ کی تعظیم کیجئے اور یہ کبھی نہ ہونے دیجئے کہ وہ آپ کو وہاں پائے جہاں سے اُس نے منع کر دیا ہے اور اُس جگہ نہ پائے جہاں کا حکم دیا ہے، بس یہ سمجھئے کہ گویا دنیا میں تم کو تھوڑی دیر ہی قیام کرنا ہے اور آخرت میں ہمیشہ بسر کرنا ہے۔ یہ سُن کر سلیمان بہت رُویا اس کے کسی مصاحب نے ابوحازم سے کہا کہ آپ نے امیر المومنین پر بڑی زیادتی کی۔ ابوحازم نے اُسے ڈانٹا چپ رہ۔ اللہ نے علماء سے یہ عہد لیا ہے کہ جو وہ جانتے ہوں اُسے ظاہر کر دیں اور حقیقت نہ چھپائیں۔ اس کے بعد ابوحازم دربار سے اٹھے اور اپنے گھر گئے۔ سلیمان نے انہیں کچھ روپیہ بھیجا؟ اس کے قبول کرنے سے انہوں نے انکار کر دیا اور قاصد سے کہہ دیا کہ جا کر کہہ دے بخدا اے امیر المومنین! جب میں اس دولت کو آپ ہی کیلئے پسند نہیں کرتا تو بھلا اپنے لئے کیونکر پسند کروں"۔

❋ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز بن مروان نے اپنی تقریر میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا:۔ اے لوگو! قرآن کے بعد کوئی کتاب منزّل مِنَ اللہ نہیں، اور نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کوئی اور نبی ہے۔

اور سُن لو۔ میں خود قاضی نہیں ہوں بلکہ دوسرے کی پیروی کرنے والا ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی بات پیدا نہیں کروں گا بلکہ دوسرے کی اتباع کروں گا۔ جو شخص ظالم حکمران سے بھاگے وہ عاصی نہیں بلکہ خود وہ ظالم حکمران عاصی ہے۔ یاد رکھو، اللہ کی معصیت کے لئے کسی شخص کی اطاعت جائز نہیں تھا اپنے ایک [illegible] کو عمر نے لکھا کہ تمہارے شاکی بہت ہو گئے ہیں اور معترف کم ہیں لہٰذا عدل کرو یا علیحدہ ہو جاؤ۔

❋ اگر تمہیں اپنے کام کے متعلق زیادہ اور اچھا عوض لینا مقصود ہو تو وہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کرو اور اس کے بندوں سے کسی بدلے یا شکریے کی امید نہ رکھو اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کی سنت یہی ہے لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَاءً وَّلَا شُکُوْرًا "اللہ تعالیٰ تمہیں اُس سے زیادہ بدلہ دے گا جس کی توقع تم بندوں سے کرتے ہو۔"

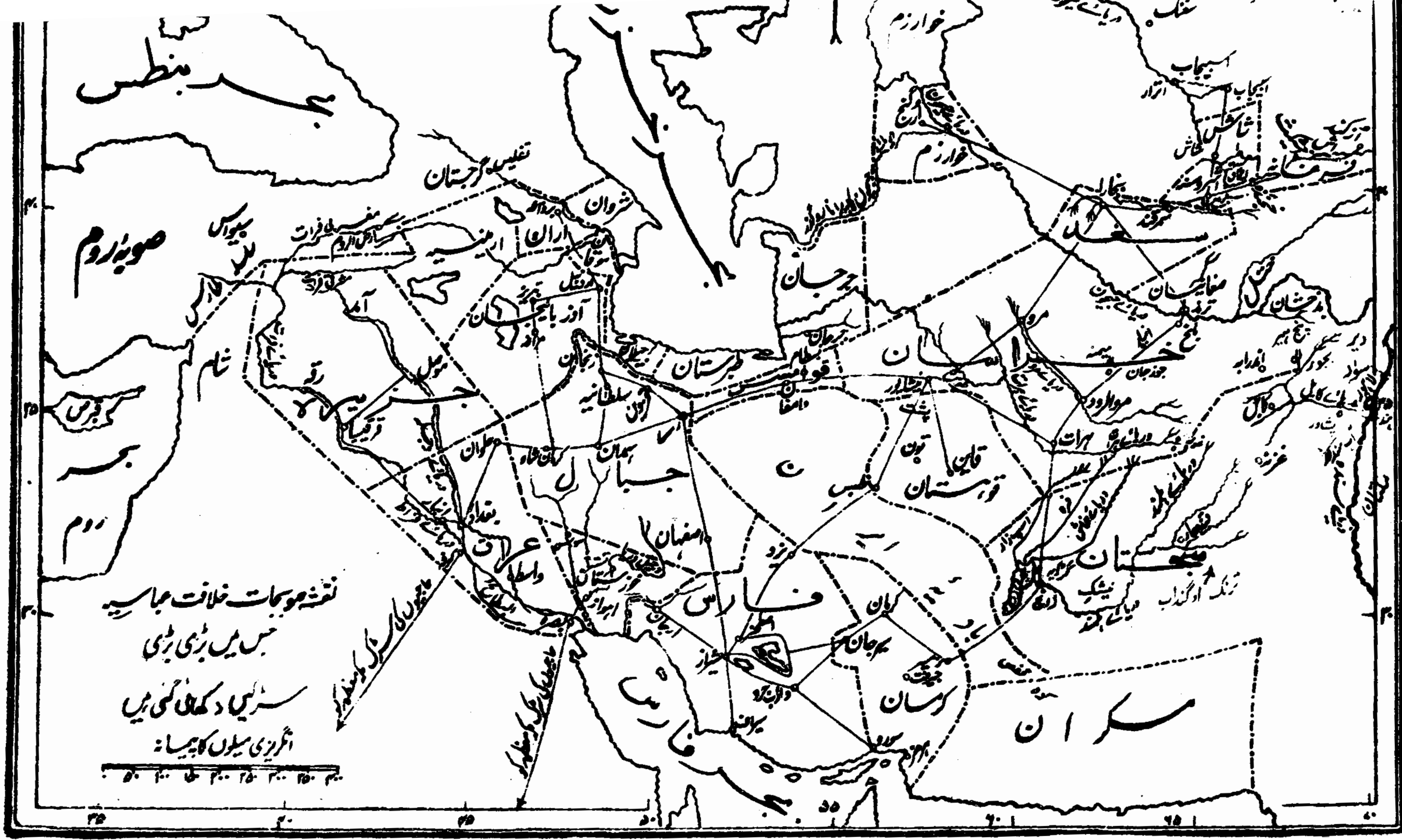
❋ رسول کریمؐ نے بی بی فاطمہؓ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ یَا فَاطِمَۃُ اعْمَلِیْ فَلَنْ اُغْنِ عَنْکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔

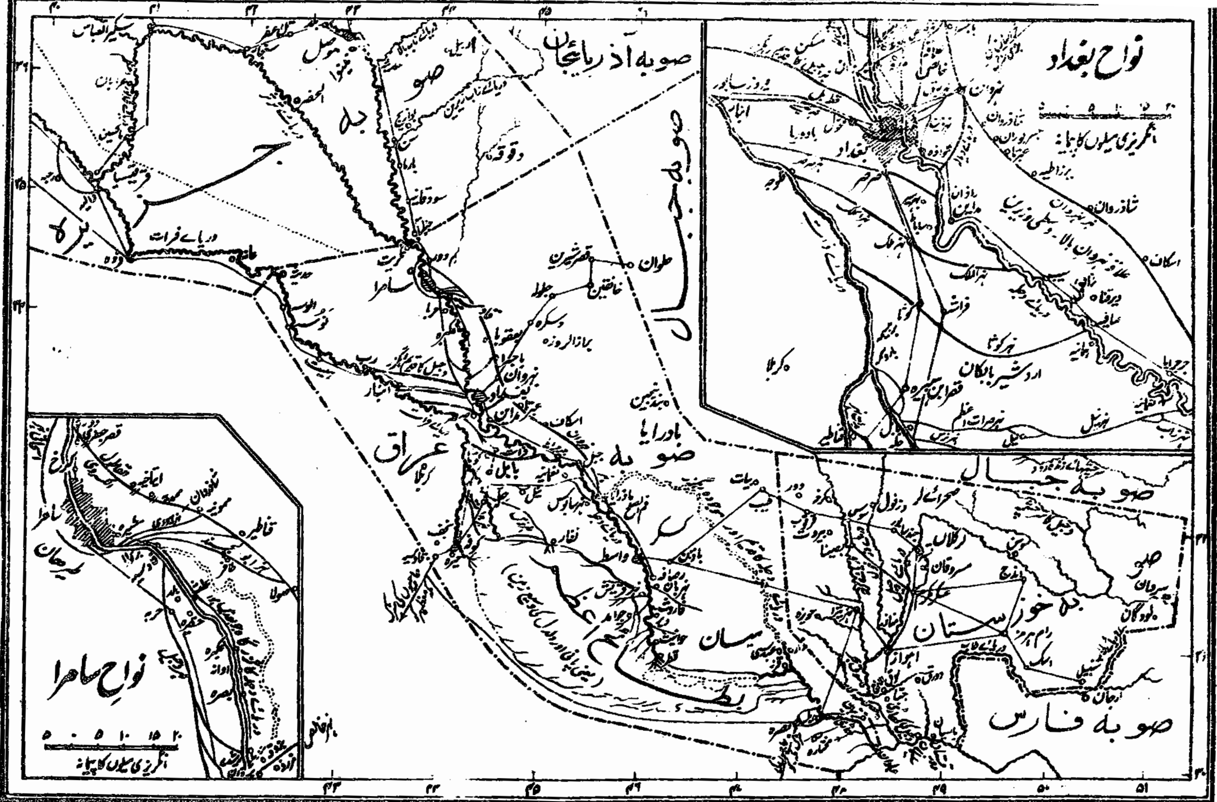
(ترجمہ) اے فاطمہ! نیک عمل کرو اور سمجھ لو کہ میں اللہ پاک کے سامنے تم کو کسی بات سے بری نہیں کر سکوں گا۔ (بحوالہ مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۵۴)

❋ ۹۶ھ ہجری میں سعید بن جبیر حجاج کے سامنے آئے تو حجاج نے اُن کا نام پوچھا۔ اُنہوں نے کہا سعید بن جبیر۔ حجاج نے کہا شقی بن جبیر۔ سعید نے کہا میرا باپ میرے نام سے تیرے مقابلہ میں زیادہ واقف تھا۔ حجاج نے کہا تو بھی شقی ہے اور تیرا باپ بھی شقی تھا۔ سعید نے جواب دیا یہ غیب ہے۔ اور وہ تیرے سوا دوسری ذات ہے جو غیب سے واقف ہے۔"

❋ حجاج بن یوسف نے ایک دن نائم سے پوچھا کہ نعمت کی تعریف کرو، اُس نے کہا۔ "امن"، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ خوف زدہ شخص کو زندگی کا کوئی لطف حاصل نہیں۔ حجاج نے کہا کچھ اور، اُس نے جواب دیا "تندرستی"، کیونکہ بیمار آدمی عیش سے بہرہ اندوز نہیں ہوتا۔ حجاج نے کہا کچھ اور، اُس نے کہا "غنیٰ"، کیونکہ محتاج آدمی زندگی کے لطف سے محروم ہے۔ حجاج نے پوچھا کچھ اور۔ اُس نے کہا بس، اِس سے زیادہ میرے پاس کوئی بات قابل بیان نہیں رہی۔" (بحوالہ مروج الذہب)

❋ تَنَبَّہْ اَیُّھَا الْمَغْرُوْرُ وَانْظُرْ
اِلٰی آثَارِ مَسْعُوْدٍ وَّ سُوْرٍ
وَلَا تَغْتَرِرْ بِالدُّنْیَا سُرُوْرًا
فَاِنَّ الْمَوْتَ یَھْدِمُ کُلَّ سُوْرٍ (بیہقی)


نقشہ صوبجات خلافت عباسیہ
جس میں بڑی بڑی
سڑکیں دکھائی گئی ہیں
انگریزی میلوں کا پیمانہ
۰ ۵۰ ۱۰۰ ۱۵۰ ۲۰۰ ۲۵۰ ۳۰۰ ۳۵۰ ۴۰۰
بحر منطس
صوبہ روم
بحر روم
قبرس
شام
الجزیرہ
عراق
جبال
فارس
کرمان
مکران
خراسان
سجستان
طبرستان
جرجان
خوارزم
صغد
اران
شروان
آذربائیجان
قوہستان
بحر فارس
بغداد
اصفہان
شیراز
ہرات



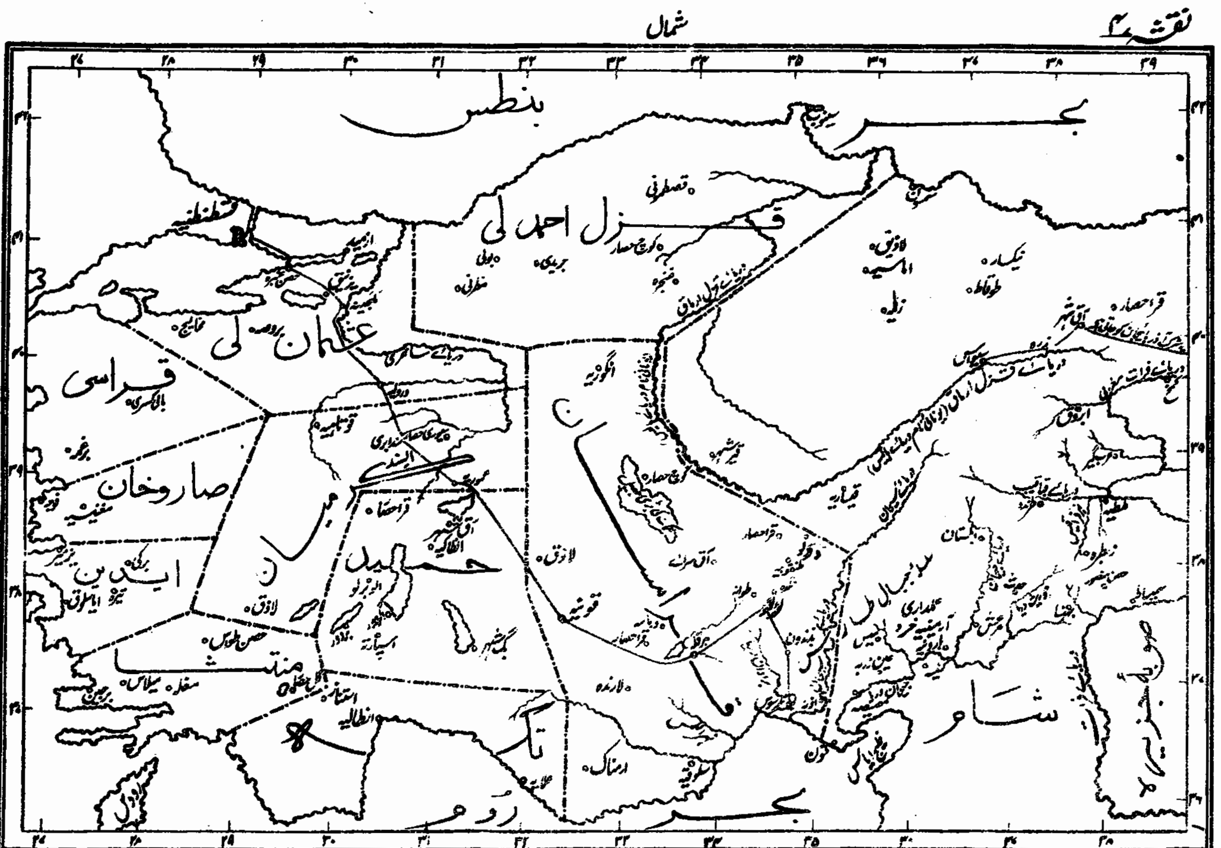
صوبجات عراق وخوزستان اور صوبہ جزیرہ کے ایک حصہ کا نقشہ

نقشہ ۳

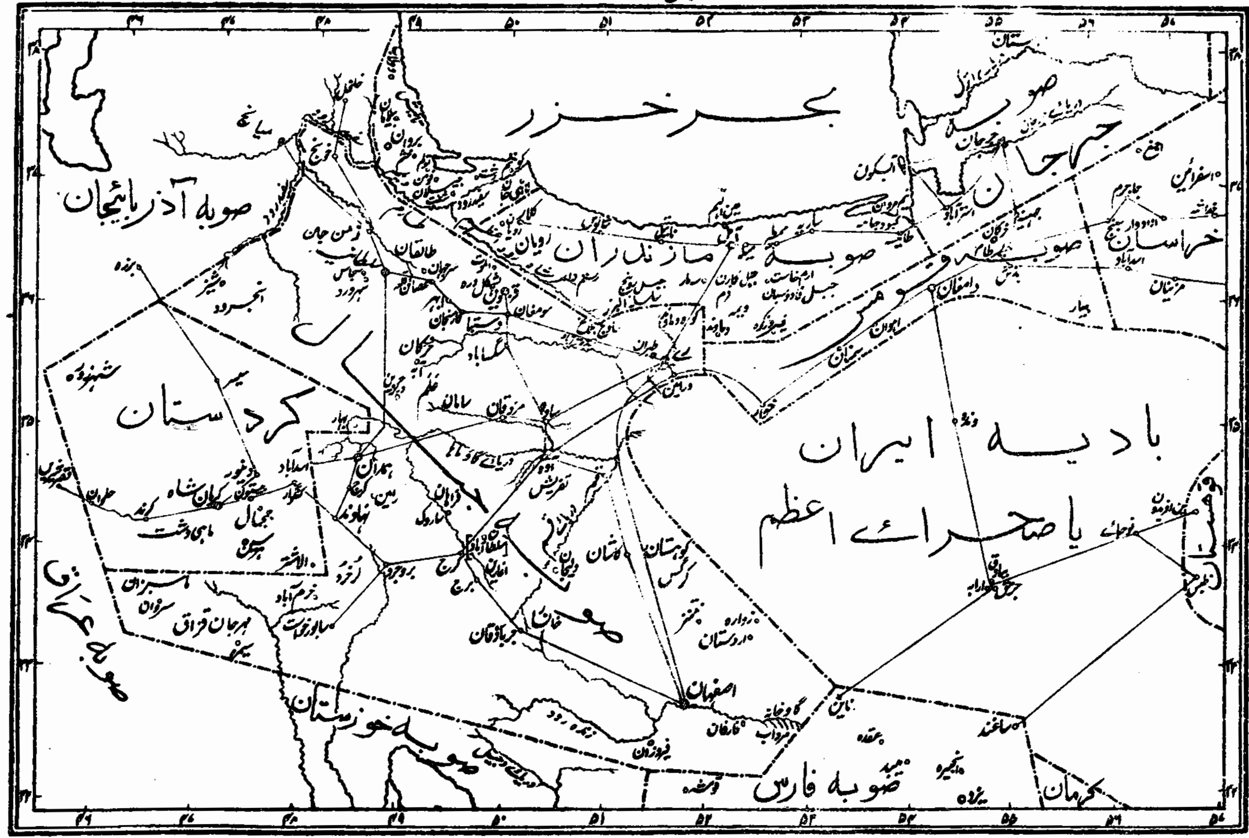
شمال

نقشہ صوبجات سرحد شمال مغرب معہ جزیرہ و آذربائجان

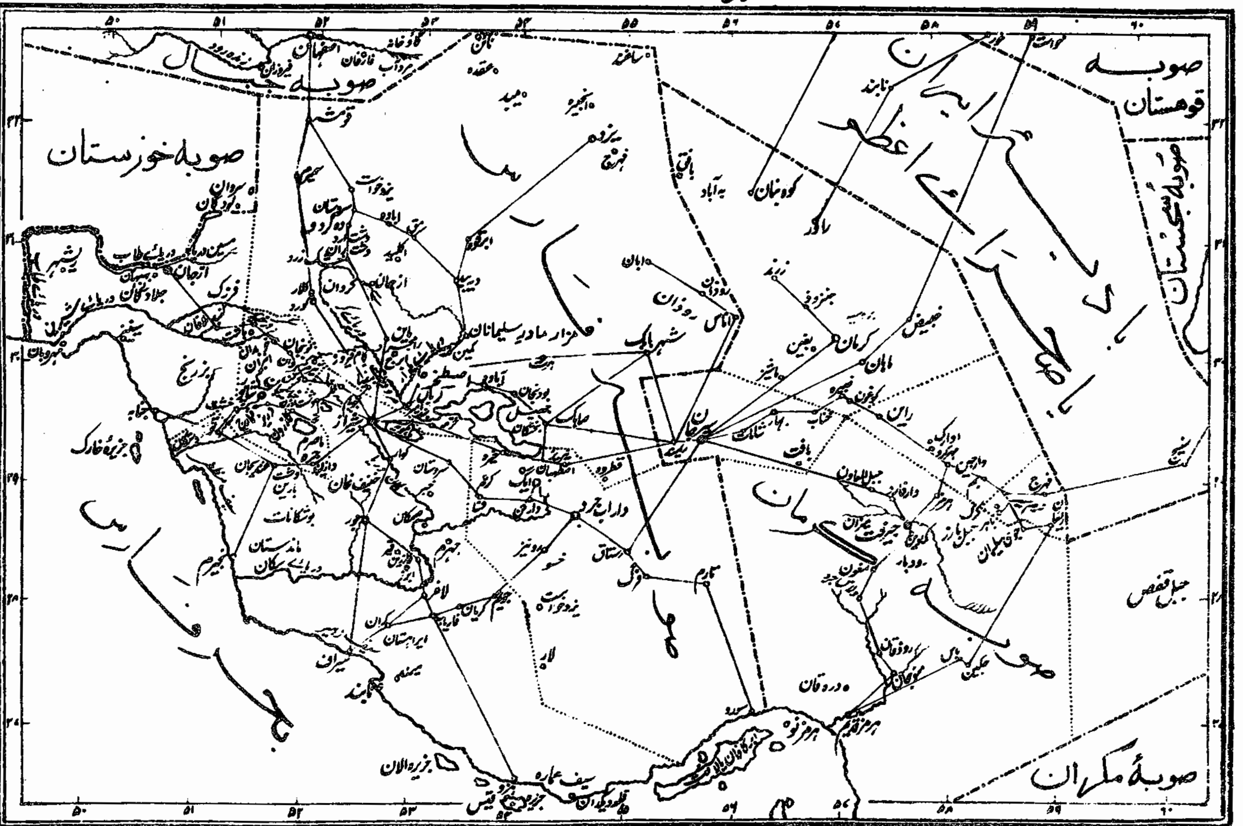
نقشه ۴


شمال
بحر بنطس
قزل احمدلی
عثمانلی
قراسی
صاروخان
ایدین
منتشا
حمید
قرمان
شام
بحر روم
قسطمونی
انگوریه
قونیه
لارنده
طوقات
نیکساره
اماسیه
صاروخان
برسه
بالکسری
قراحصار
لاذق
لارنده
ارمناک
انطالیه
سلوقیه
طرسوس
ادنه

نقشہ ۵

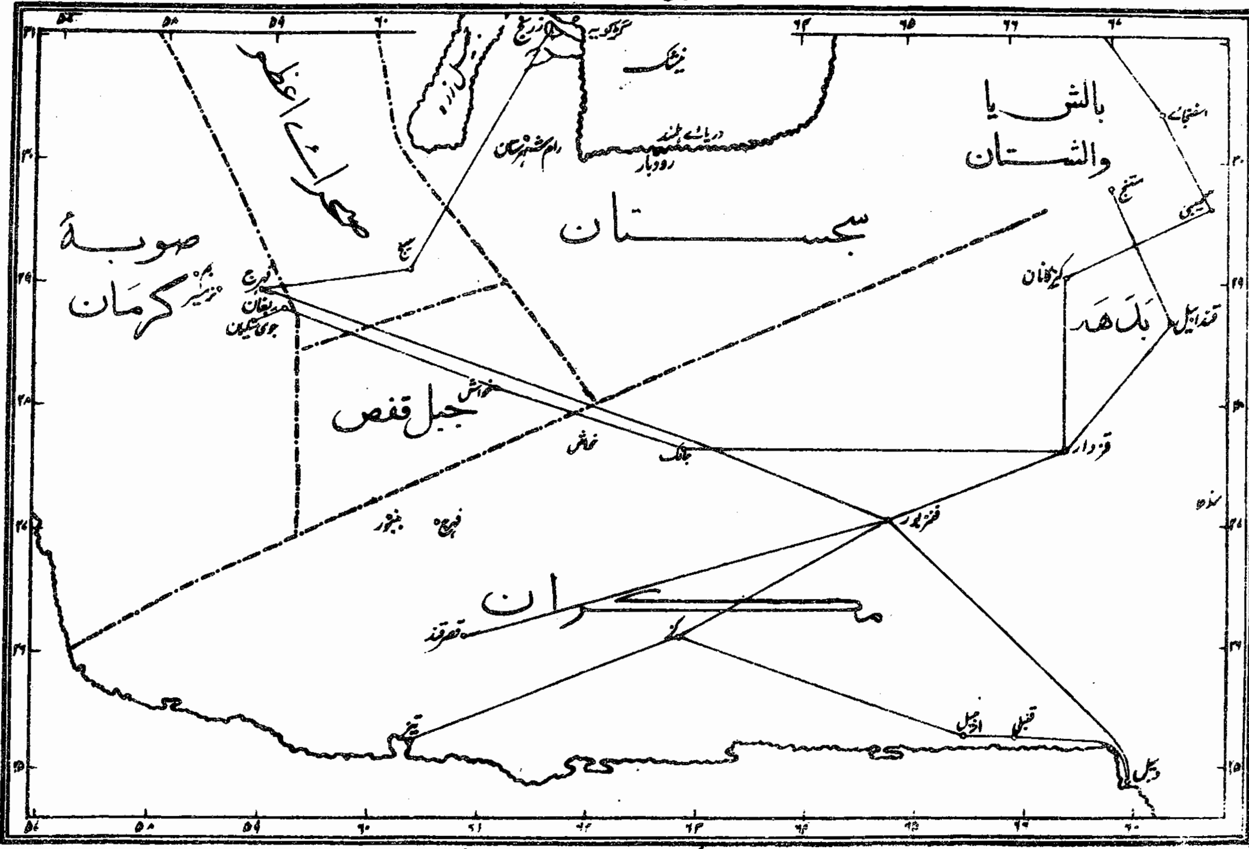


نقشہ صوبجات جبال، وجیلان مع صوبجات مازندران، قومس وجرجان

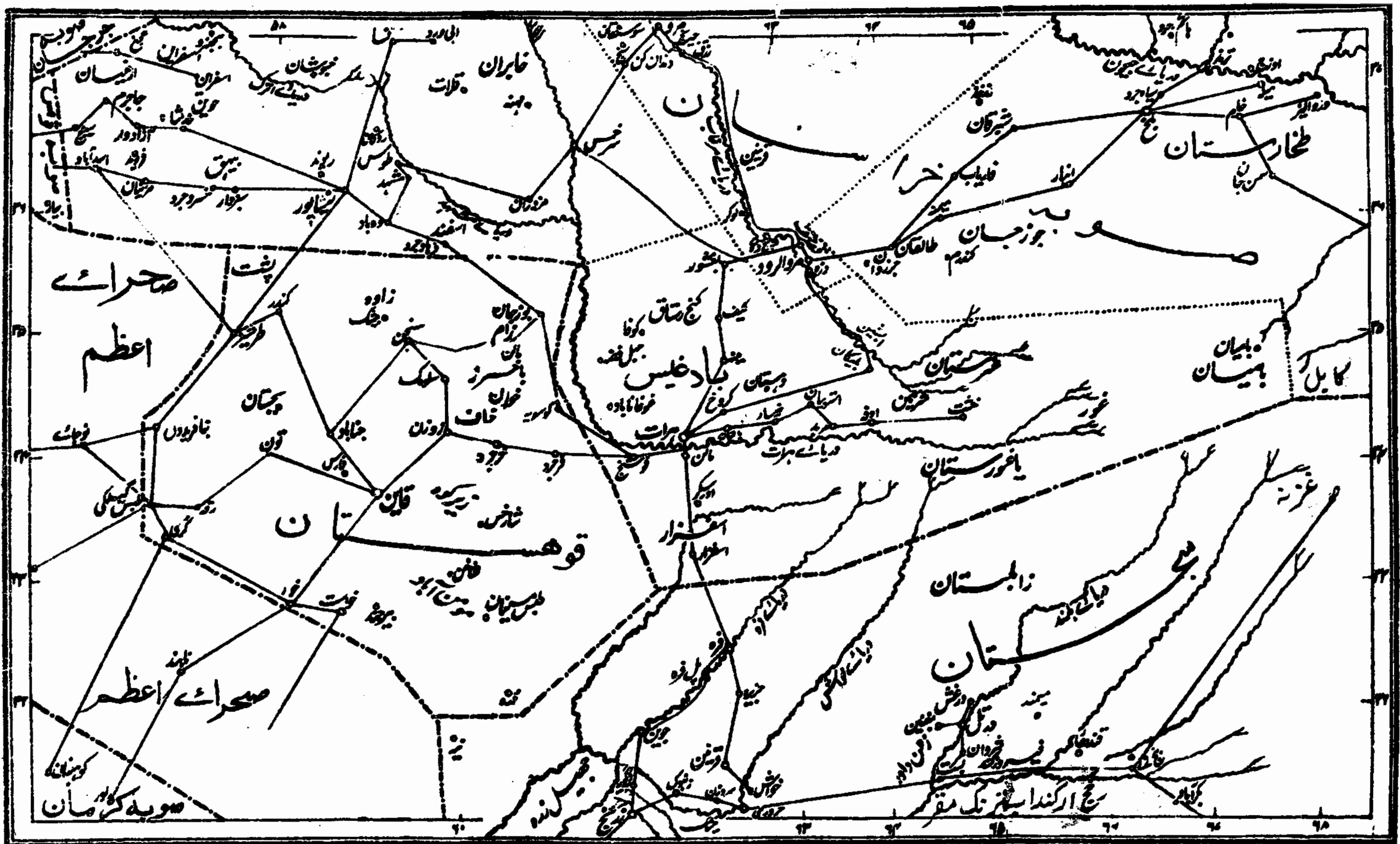


نقشه صوبجات فارس و کرمان

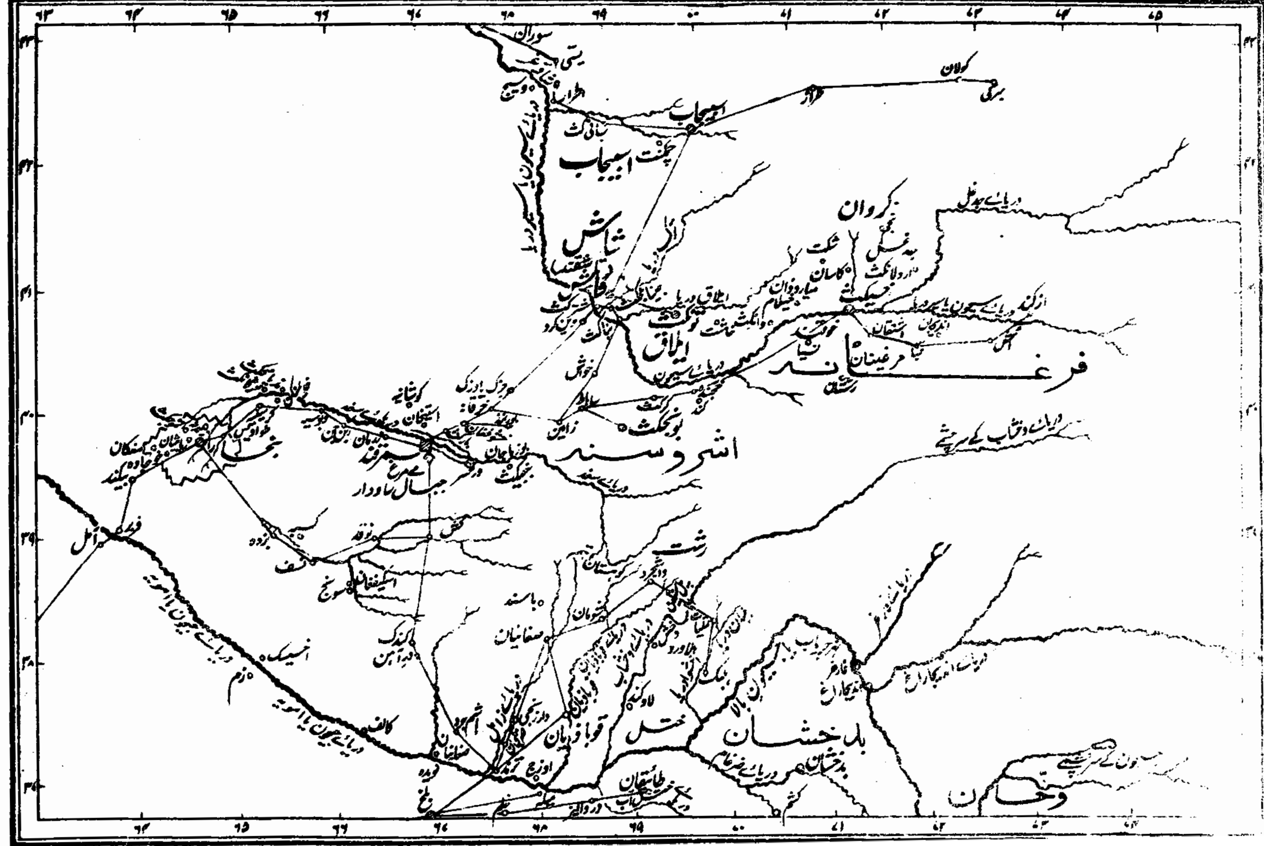
نقشہ ۵



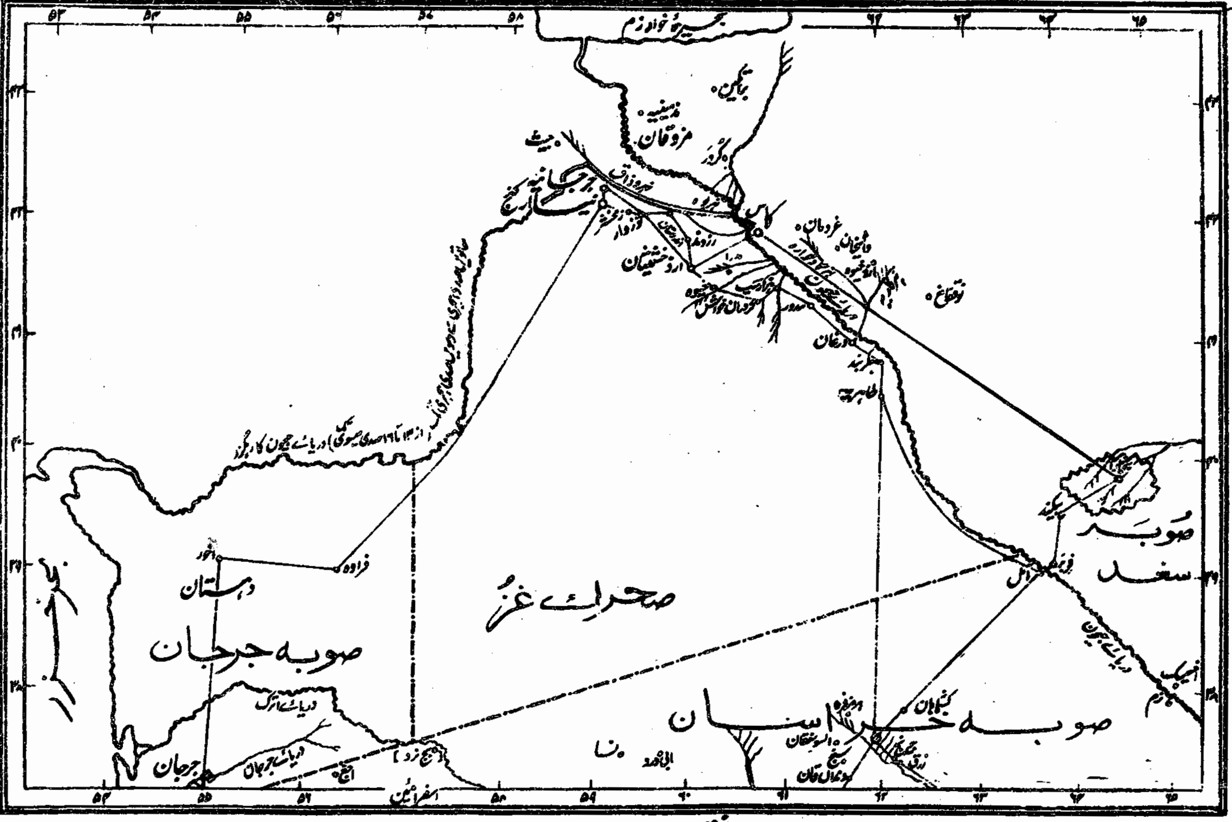
نقشہ صوبۂ مکران مع حصۂ سجستان



نقشہ صوبہ جات قوہستان خراسان وحصہ سجستان


نقشہ ۹
شمال
اسبیجاب
شاش
ایلاق
فرغانہ
مرغینان
کاسان
کروان
اشروسنہ
بونجکث
زامین
جبال ساودار
کش
نسف
آمل
رشت
صغانیان
قوادیان
ختل
بدخشان
وخان
طالقان
بلخ
دریائے وخشاب کے سرچشمے

نقشہ ۱۰


شمال
بحیرۂ خوارزم
مزوقان
کاس
صحرائے غز
صوبہ جرجان
دہستان
فراوہ
جرجان
دریائے اترک
دریائے جرجان
صوبہ خراسان
صوبہ سغد
دریائے جیحون
نسا
طاہریہ
نوقاغ

ام المومنین حضرت صفیہ رضؓ

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ (سورۂ احزاب پارہ ۲۱)

نام و نسب :- صفیہ نام تھا اور حضرت ہارون بن عمران علیہ السّلام کی اولاد میں سے تھیں۔ اُن کے باپ کا نام حیی تھا۔ اس وجہ سے انہیں صفیہ بنت حیی اسرائیلیہ کہتے ہیں۔ ان کے باپ اور دادا دونوں اپنی قوم کے معزز ترین اشخاص، باوقار سردار اور بہادر افراد میں شمار کئے جاتے تھے اور اپنی انہی خوبیوں کی بنا پر بنی اسرائیل کے تمام عرب قبائل میں ممتاز اور اعلیٰ مرتبہ سمجھے جاتے تھے۔

نکاح :- حضرت صفیہ کا نکاح خیبر میں قلعہ القموص کے سردار کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا تھا۔ جنگ خیبر میں جب مسلمانوں نے فتح حاصل کی اور قلعہ القموص پر ان کا قبضہ ہوا تو کنانہ بن ابی الحقیق قلعہ میں مارے گئے اور ان کے خاندان کے تمام افراد کو قیدی بنا لیا گیا، ان قیدیوں میں حضرت صفیہ بھی شامل تھیں۔

مختلف مقامات پر یہ متعدد لڑائیاں یہودیوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں اُن کے بڑے بڑے سردار مارے گئے جن میں حضرت صفیہ کے والد اور بھائی بھی تھے

الغرض مالِ غنیمت تقسیم ہو رہا تھا تو اصحاب کے مشورے سے حضرت صفیہ کو پیغمبر علیہ السلام نے اپنے لئے مخصوص فرما لیا اور آزاد کر کے انہیں اپنے نکاح میں لے آئے۔[ل] یہ واقعہ ۷ھ میں پیش آیا تھا۔ صہبا کے مقام پر شادی کی رسم ادا کی گئی اور دعوت

[ل] مالِ غنیمت سے حصے میں آئی ہوئی "ملکِ یمین" سے بغیر آزاد کئے ہوئے نکاح کر لینا بھی درست تھا اور حضورؐ کے حبالۂ عقد میں آنا تو کسی خاتون کے لئے دنیا کا سب سے بڑا اعزاز تھا لیکن آنحضرتؐ کو چونکہ حضرت صفیہ کے خاندانی وقار کا خیال اور ازواج مطہرات میں انہیں خاص مقام دینا مقصود تھا اس لئے آپ نے انہیں پہلے آزاد کر دیا پھر اُن کے پاس پیامِ عقد بھیجا جسے حضرت صفیہ نے برضا و رغبت منظور کر لیا۔ (روشن خان)

ولیمہ کا انتظام کیا گیا[1] روانگی کے وقت آنحضرت نے اپنے ساتھ اونٹ پر سوار کیا اور اپنے جُبّے سے اُن کا پردہ کیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضرت صفیہ رضؓ بھی پاک بیبیوں میں سے ہیں[2]

مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ کو اپنے ایک جان نثار صحابی حارث بن نعمان کے گھر اتارا۔ حضرت صفیہ کے عقل و فراست اور حسن و جمال کا شہرہ سُن کر انصار و مہاجرین کی بہت سی خواتین انہیں دیکھنے آئیں ۔ ان خواتین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں ۔ آنحضرتؐ نے ان سے دریافت فرمایا کَیْفَ رَئَیْتِھَا یَا عَائِشَہ ۔ اے عائشہ صفیہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ حضرت عائشہ نے جواب دیا: ایک یہودن ہے ؟ حضورؐ نے فرمایا: ۔ الیسا مت کہو وہ مسلمان ہو چکی ہے، اس کا اسلام زیادہ بہتر ہے" ۔

عادات: ۔ حضرت صفیہ بہت نڈر، رحم دل اور نہایت صابر خاتون تھیں ۔ قلعہ القموص پر مسلمانوں کے قبضے کے بعد صفیہ اور اُن کی چچا زاد بہن گرفتار ہو کر حضرت بلال رضؓ

---

[1] نکاح کے بعد ایک شب گذار کر یا خلوت کے بعد عزیزوں اور دوستوں کی دعوت طعام کرنا بنی اسرائیل کی قدیم رسم ہے ' اس دعوت میں وہ اہتمام کرتے تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنی پسندیدگی اور عمل کی مُہر لگا کر اُسے اسلامی روایات میں شامل فرما دیا' اب یہ ایک اسلامی تہذیبی روایت ہے لیکن پٹھانوں میں ایک قومی روایت کے طور پر بھی خاص اہتمام سے اس اسلامی دینی روایت پر عمل کیا جاتا ہے اور اُسے وہ نکاح کی روٹی کہتے ہیں ۔ (روشن خان)

[2] عرب کے شرفاء میں پردے کا رواج تھا لیکن لونڈیوں کے لئے جنہیں اپنے لئے مخصوص بھی کر لیں پردے کی پابندی ضروری نہ سمجھی جاتی تھی، حضرت رسول اللہ کا حضرت صفیہ کو آزاد فرمانا، پھر نکاح کرنا اور پھر اپنے ساتھ اونٹ پر سوار کرانا اور اپنے جُبّے سے اُن کے پردے کا اہتمام فرمانا یہ سب کچھ حضرت صفیہ کے لئے خاص قدر و منزلت کا اعلان تھا ۔ (روشن خان)

کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں جارہی تھیں تو ادھر ادھر یہودیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں، ان لاشوں میں حضرت صفیہ کے خاوند کی لاش بھی پڑی تھی۔ یہ ایک دردناک منظر تھا جسے دیکھ کر صفیہ کی بہن اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں، بے اختیار اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور اس نے اپنے چہرہ و سر پر خاک ڈالی لیکن صفیہ کی زبان سے اُف تک نہ نکلی۔

حضرت صفیہ میں اللہ تعالیٰ نے صورت کے حسن کے ساتھ سیرت کی بے شمار خوبیاں بھی جمع فرمادی تھیں۔ ایک مرتبہ ان کی ایک لونڈی نے حضرت عمرؓ سے حضرت صفیہ کے بارے میں کہا کہ یہودیت کی بو اُن میں اب بھی موجود ہے۔ یعنی سنیچر کا دن عزیز رکھتی ہیں اور یہودیوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حقیقت حال دریافت فرمائی تو حضرت صفیہ نے جواب دیا کہ اللہ تعالےٰ نے سنیچر کے بجائے جمعہ کی فضیلت مسلمانوں کو عطا فرمائی ہے، اب سنیچر کے دن سے محبت کرنے کی کیا ضرورت ہے، رہا یہودیوں کے ساتھ میرے تعلقات کا سوال تو ان سے میرا رشتہ ہے لہٰذا صلۂ رحمی کا خیال رکھوں گی اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کروں گی۔ حضرت عمرؓ ان کا یہ کھرا اور صحیح جواب سن کر خاموش ہوگئے۔ حضرت صفیہ نے لونڈی (خادمہ) کو بلا کر دریافت کیا۔ آخر تجھے کس بات نے یہ چغلی کھانے پر آمادہ کیا؟ اس نے جواب دیا۔ شیطان نے، حضرت صفیہؓ نے اس کی سرزنش کرنے کے بجائے اُسے معاف کر کے آزاد کر دیا۔

حضرت صفیہ کو آنحضرتؐ سے بہت محبت تھی، ایک مرتبہ جب حضورؐ بیمار پڑے تو حضرت صفیہ اور دوسری ازواج مطہرات عیادت کے لئے آئیں۔ صفیہ آپ کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہوگئیں اور کہا اے اللہ کے نبی! کاش آپ کی یہ تکلیف مجھ پر آپڑے، آنحضرتؐ نے فرمایا خدا کی قسم یہ سچ کہتی ہے۔ یہی حال آنحضرت کا بھی تھا صفیہ ان کو بہت عزیز تھیں۔ ایک مرتبہ دوران سفر میں حضرت صفیہ کا اونٹ اچانک بیمار پڑ گیا۔ صفیہ پریشان ہوئیں، حضورؐ کو معلوم ہوا تو تشریف لائے

اور صفیہ کو تسلی دی۔ جوشِ محبت میں اُن کے آنسو نکل آئے تو حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں خشک کیا۔ حضورؐ نے اپنی دوسری زوجہ مطہرہ حضرت زینب بنتِ جحش سے کہا کہ وہ اپنا اونٹ صفیہ کو دے دیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ میں اپنا اونٹ اس یہودن کو کیوں دوں، ان کی اس بات پر حضورؐ اتنے ناراض ہوئے کہ دو ماہ تک اُن سے بات نہ کی، بالآخر حضرت عائشہ نے کوشش کر کے حضرت زینبؓ کا قصور معاف کروایا۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ صفیہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو آپؐ نے دیکھا وہ غمزدہ بیٹھی ہیں آپؐ نے وجہ دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت زینب نے کہا ہے کہ حضورؐ کی ازواج میں وہ دونوں سب سے افضل ہیں، اس لئے کہ آپ کی زوجیت کے ساتھ وہ دونوں آپ کی رشتہ دار بھی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا تم نے اُن سے یہ کیوں نہ کہا کہ "ہارون میرے باپ" موسیٰ میرے چچا اور محمدؐ میرے شوہر ہیں اس لئے تم مجھ سے افضل کیوں کر ہو سکتی ہو[1]"

حضرت صفیہؓ فیاض بھی بہت تھیں، صلۂ رحمی اور ہمدردی کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ ان کا صرف ایک ذاتی مکان تھا جسے انہوں نے فی سبیل اللہ دے دیا تھا۔ ۳۵ھ میں جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو دشمنوں نے گھیر لیا تھا تو حضرت صفیہؓ ایک خچر پر سوار ہو کر ایک غلام کے ساتھ حضرت عثمان کی امداد کے لئے روانہ ہوئیں لیکن اشتر نخعی نے اُن کا راستہ روک لیا اور اُن کے خچر کو مار مار کر انہیں واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔

حضرت صفیہ بہت عاقل، دانا اور صاحب علم زوجہ مطہرہ تھیں، لوگوں کو دین کے مسائل بتاتی تھیں۔ ان سے کچھ احادیث بھی مروی ہیں جو زین العابدین علی بن حسینؓ، اسحاق بن عبداللہ بن حارث، مسلم بن صفوان، کنانہ، یزید بن معتب

---

[1] حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش مکہ میں اپریل ۵۷۱ء عیسوی میں ہوئی، اور وفات مدینہ (یثرب) میں بروز دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ ہجری مطابق ۸ یا ۱۰ جون ۶۳۲ء عیسوی کو پیش آیا۔ (روشن خان)

وغیرہ نے بیان کی ہیں۔

وفات:۔ حضرت صفیہ نے سنہ ۵۰ ھجری میں انتقال کیا۔ جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ میری تمام املاک میرے بھانجے کو دے دی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت صفیہ رضؓ نے ایک لاکھ درہم چھوڑے تھے۔ چونکہ ان کا بھانجا یہودی تھا اس لئے لوگوں نے اُن کی وصیت کی تعمیل میں تامل کیا لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے فرمایا لوگو! وصیت کے معاملے میں خدا سے ڈرو اور وصیت پوری کرو۔ چنانچہ لوگوں نے وصیت کی تعمیل کی۔ [1]

یہاں تک جو مضمون آپ کی نظر سے گزرا وہ محترمہ یاسمین پرویز احمد خان کی تحقیق کا ملخص ترجمہ تھا۔ حضرت صفیہ رضؓ کی سیرت کے بعض پہلوؤں اور اُن کے فضائل و محاسن پر امام بلاذری، علامہ مسعودی، علامہ شبلی نعمانی وغیرہ نے بھی روشنی ڈالی ہے نامناسب نہ ہوگا کہ اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

علامہ مسعودی لکھتے ہیں:۔

"ہجرت کا ساتواں سال تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر کے یہودیوں سے خیبر میں غزوہ فرمایا۔ بنی نضیر و بنی قریظہ ہارون بن عمران برادرِ موسیٰ پیغمبر علیہما السلام کی اولاد میں سے تھے ... قلعہ قموص کے لونڈی غلاموں سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ رضی اللہ عنہا، بنتِ حُیّیؔ بن اخطب کو جو قبیلۂ نضیر کی تھیں انتخاب کر لیا۔ اس سے پہلے وہ کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں تھیں۔ حضرتؐ نے ان کو آزاد فرمایا اور نکاح کر لیا۔" (التنبیہ والاشراف)

امام بلاذری لکھتے ہیں۔

"حضرت صفیہ بنتِ حُیّیؔ کی آنکھ کے قریب ایک سبز نشان تھا،

---

[1] ماہنامہ پشتو، پشاور بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۸۰ء ص

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُن سے دریافت فرمایا: اے صفیہؓ! یہ کاہے کا نشان ہے؟" بولیں: میں ایک دفعہ ابن الحقیق کی گود میں سر رکھے سو رہی تھی، میں نے دیکھا چاند میری گود میں آگیا ہے، جاگی تو یہ خواب اُس کو سنایا" اُس نے میرے منہ پہ تھپڑ مارا اور کہا۔ "کیا تو بادشاہِ یثرب کی تمنّا کرتی ہے؟" (فتوح البلدان حصہ اول)

علامہ شبلی نے زرقانی کے حوالے سے لکھا ہے۔ (سیرت النبیؐ حصہ دوم)

"عرب میں مالِ غنیمت کا جو بہترین حصہ قاید یا بادشاہ کے لئے مخصوص ہو جاتا تھا اس کو صفیہ کہتے تھے، چونکہ وہ جنگ خیبر میں اسی طریقہ کے موافق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی تھیں اس لئے صفیہ کے نام سے مشہور ہوگئیں ورنہ اصل نام زینب تھا، باپ کا نام حیّی بن اخطب اور ماں کا نام "ضرہ" تھا۔ حضرت صفیہؓ کو باپ اور ماں دونوں جانب سے سیادت حاصل تھی، باپ قبیلہِ بنو نضیر کا سردار اور ماں قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھی۔"

امام بلاذری لکھتے ہیں:۔

"جب بخت نصر نے بیت المقدس مسمار کیا اور بنی اسرائیل میں سے جسے چاہا جلا وطن کیا اور جسے چاہا قید کیا۔ اُن میں سے ایک جماعت حجاز کی طرف آکر وادی القریٰ و تیمار اور یثرب (مدینہ) میں مقیم ہوگئی۔ یثرب میں جرہم اور بقلئے عمالیق نے نخلستان اور کھیتیاں بنا رکھی تھیں، یہ بھی اُن کے ساتھ رہنے لگے اور اُن میں مل جل گئے رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھ گئی اور جرہم و عمالیق کم ہوتے گئے حتیٰ کہ انہوں نے جرہم و عمالیق کو یثرب سے نکال دیا اس پہ قابض ہوگئے اور اُس کی عمارتوں پہ اپنا عمل دخل کر کے ایک زمانے تک فراغت سے آباد رہے۔" (فتوح البلدان حصہ اول)

تاریخ کے اِن حوالوں اور دیگر تاریخی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل

کے اُن جلا وطن قبائل کا رفتہ رفتہ یثرب (مدینہ) اس کے قرب و جوار اور پورے علاقہ خیبر پہ قبضہ ہو گیا اور انہوں نے مذہبی روایتی فضیلت کے ساتھ دنیاوی جاہ و منزلت بھی حاصل کر لی۔ ظہور اسلام کے بعد ان میں سے جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے انہوں نے اسلام کی خدمت گزاری، اللہ کے راستے میں ایثار جان و مال اور اتباع نبوی میں بھی امتیاز حاصل کیا۔

یہ تو اُن قبائل کا ذکر تھا جو بیت المقدس پہ بخت نصر کے قبضے اور شام میں تباہی و بربادی کے بعد عرب و حجاز کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے یا انہیں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل کے سینکڑوں خاندان وہ تھے جو شمال مغرب کی طرف جانے کے بجائے جنوب مشرقی ایشیا کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے یا انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ قبائل بھی گردش لیل و نہار سے محفوظ نہ رہے اُن کی زندگی بھی مختلف نشیب و فراز سے گزری۔ انہوں نے اپنی مذہبی روایات کو سینے سے لگایا سیاسی قوت و اقتدار بھی حاصل کیا۔ غربت و مسکنت کی زندگی بھی گزاری اور زندگی کے زوال اور ناکامیوں کا مزا بھی چکھا، تا آنکہ اسلام کے ظہور کے بعد ان میں ایک نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اور نشاۃ ثانیہ کے دور میں داخل ہوئے۔ افغانستان، پاکستان، ہندوستان وغیرہ میں جو افغان موجود ہیں یہ دراصل اُنہی جلاوطن یا مہجور بنی اسرائیلی خاندانوں کے باقیات ہیں اور اسلام کے شرف و برکت کی وجہ سے تو انہیں باقیات الصالحات کہنا چاہیئے۔

دنیا کے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب میں بنی اسرائیل کے یہ مختلف خاندان اور گروہ جس طرح پھیلے اور جس طرح وہ اللہ کی نوازشوں کے مستحق ٹھہرے یا آزمائشوں کے مختلف ادوار اُن کی زندگی میں آئے قرآن حکیم کی ایک آیت میں اُن کی زندگی کے اس انداز کی طرف بڑا بلیغ اشارہ موجود ہے۔

وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ۖ مِّنْهُمُ الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَٰلِكَ ۖ وَبَلَوْنَاهُم بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ٥ (پارہ ۹ سورہ اعراف آیت ۱۶۸)

گندھارا میں بنی اسرائیل کے قدیم آثار

افغانوں کے بنی اسرائیل سے تعلق پر اِس کتاب کے متعدد صفحات پر بحث آئی ہے اور وہاں ہم نے مختلف زاویوں سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ پٹھانوں کا تعلق بنی اسرائیل کے اُن قبائل سے ہے جو اشوریوں اور بخت نصر کی تباہی کے بعد دنیا کے شمال مغرب کے علاوہ جنوب مشرقی ایشیا تک پھیل گئے تھے۔ اس دعوے پر ہم نے تاریخی شواہد کی رو سے، قومی روایات کے لحاظ سے، مذہبی اور تہذیبی رسموں اور رواجوں کے تسلسل سے اور ان کی قومی زبان، پشتو اور سامی زبانوں کے تعلق سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے کے بعض اشارات ام المومنین حضرت صفیہؓ سے متعلق مضمون میں بھی آئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر افغانوں کا تعلق بنی اسرائیل کے خاندانوں اور قبیلوں سے تھا اور وہ زمانہ قدیم سے جنوب مشرقی ایشیا کی طرف ہجرت کر آئے تھے اور انہوں نے قدیم ہند یا علاقہ کابل و پشاور کو اپنا مسکن بنا لیا تھا اور گرد و پیش کے متعدد مقاموں، آبادیوں، پہاڑوں، ندیوں، میدانوں وغیرہ کے نام بھی ان کے اکابر یا ان کے قبائل کے ناموں پر یا ان کی تاریخ کے خاص واقعات سے منسوب تھے تو ان کے آثار و نقوش بھی دستیاب ہونا چاہیئے تھے۔ اب سے نصف صدی یا پون صدی پہلے تو اس کی اہمیت نہ تھی لیکن موجودہ دور میں آثار قدیمہ پر جو تحقیق ہوئی ہے اور قوموں کی گمشدگی اور قدیم زندگی کے جو آثار زمینوں، ٹیلوں، کھنڈروں وغیرہ کی کھدائیوں میں دستیاب ہوئے ہیں انہوں نے تاریخی تحقیق کے اس پہلو کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے اگرچہ یہ سوال نہ کسی نے اٹھایا نہ کسی نے اعتراض کیا۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ اگر ایک قوم (پٹھان) ڈھائی ہزار سال قبل سرزمین افغانستان و پاک و ہند میں آکر آباد ہوئے اور یہاں انہوں نے بود و باش اختیار کی تو آثار قدیمہ سے بھی اس کی تصدیق ہونی چاہیئے۔ اس سوال کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس ایڈیشن کی تیاری کے وقت ہم اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ آئندہ چل کر ہم اس سلسلے میں مزید ثبوت پیش کر سکیں۔

سرزمین پاک و ہند میں تقریباً دو ہزار سال قبل پٹھانوں کی موجودگی کا ثبوت ہمیں ان

دو مجسموں سے ملتا ہے جو علاقہ گندھارا میں ہڈہ جلال آباد اور سری بہلول مردان کے مقامات پر کھدائیوں میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اور کابل اور پشاور کے عجائب خانوں میں اپنی تاریخی قدامت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ افغانوں کے ان دونوں قدیم مجسموں کی تصویریں بھی ہم نے ان کی اہمیت کے پیش نظر کتاب میں شامل کر دی ہیں۔

پہلی تصویر ایک جنگجو افغان اور فوجی سردار کی ہے۔ جو اپنے روایتی انداز میں پگڑی باندھے ہوئے ہے اور اس کے چہرے کے نقوش اس کی سپاہیانہ سیرت کی غمازی کر رہے ہیں اور فاضل محقق اور ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ہنری ہراس نے اس کے تعارف میں اسے افغان ہی لکھا ہے۔ یہ مجسمہ ہڈہ کے مقام پر دستیاب ہوا ہے اور کابل کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔

دوسرا مجسمہ جو سری بہلول کے مقام سے نکالا گیا اور پشاور کے قومی عجائب گھر میں محفوظ ہے، ایک یہودی رئیس کا ہے۔ جس کے چہرے سے اس کی امارت و سیادت اور ذکاوت و ہوش مندی کے آثار ہویدا ہیں۔ اگرچہ فاضل محقق نے اس کے گنج اور پیشانی کے اوپر کے حصے کی قدرتی صفائی کو بدھ مذہب کی روایت کے مطابق سر منڈانے سے تعبیر کیا ہے لیکن نسلاً وہ اسے یہودی ہی لکھتا ہے اور اس کا زمانہ سنہ عیسوی کا بالکل اوائل بتایا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل یا پٹھانوں کے افغانستان اور سرزمین پاک و ہند میں آثار کی تاریخ کم از کم بھی تسلیم کی جائے تو دو ہزار سال پرانی ہے اور ان کی آمد کی تاریخ کو متعین کیا جائے تو وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے بہت پہلے اشوریوں کے دور ستم اور بخت نصر کے حملوں تک جا پہنچتی ہے

یورپین محقق اور ماہر آثار قدیمہ پروفیسر ہنری ہراس نے اپنی تحقیق کو ایک رسالہ کی شکل میں چھاپ دیا تھا جسے انجمن ادبی کابل کے مجلہ علمی "سالنامہ کابل" کے شمارہ ۳۶-۱۹۳۷ء میں عبدالغفور خان نے فارسی میں ترجمہ کر کے چھاپ دیا ہے متعلقہ مضمون "ہیکل سازی قدیم افغانستان" سالنامہ کابل کے صفحات ۲۰۱ تا ۲۴۱ پر آیا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم اس مضمون کے متعلقہ حصے (صفحہ ۲۱۵ تا ۲۱۷) اور اس کے ساتھ مجسموں کے فوٹو بھی شامل کر رہے ہیں۔

یکی هم از زیبا ترین این مجسمه ها ، تمثال یك نفر افغان سالخورده است که بحال قهرمان میباشد . و سرش با یك دستار ساده که شملهٔ آن از گوش چپ او آویزان است ، پوشیده شده ، چشمانش بحال غضب بر دشمن دوخته و چین و شکن بسیاری .برا بروانش پدید آمده . دهان بی دندانش اندکی باز است و گوئی بشدت ، مقابل را توهین میکند (لوحهٔ ٦ ـ ب) .

دیگر، یکنفر برهمن‌را نشان میدهد که زناری بروی سینه بطور حمایل انداخته و لوتهٔ مملو از آب در دست دارد ـ و این لوته بقدری سنگین بوده که با دست راست ازدهن آن محکم گرفته و دست چپ را بزیر آن قرار داده است کلاه آن نهایت دلچسپ بوده و گره موی سر او را امروز بعضی سادوها تقلید میکنند (لوحهٔ ۷ ـ الف) .



لوحهٔ ٦ ب ، سر یکنفر افغان ـ ازهده مکشوف و درموزیم کابل موجود است

b. Hadda. Tête d'un Afghu (Musée de Kaboul)

تمثال ذیل که از قریهٔ شهر بهلول واقع در میادین پشاور مکشوف گردیده عبارت از سر یکنفر در ویش بودائی است که جمجهٔ گنبد نمای او ، بردماغ عالی و ذکای بلندش دلالت میکنند و دیدگان کوچك و با فروغش ، زندگی طبیعتش را میرساند و بینی عقاب مانند او تمایلش را به مداخلت در امور دیگران ارائه میدهد ـ و بالا خره لب ها و زنخ متناسبش ، از فیصلهٔ خلل ناپذیر او در اجرای افکارش نمایندگی میکند . پس از روی این خصوصیات چهره که آثار اخلاق هم ازان پدیدار میگردد ، میتوانیم صاحب آنرا یکنفر یهودی بخوانیم که در سر حد شمال غربی هند ، درقرن اول عیسوی زندگی داشته است (۱) . وچون فرق سر خودرا طوریکه خاصهٔ مسلك رهبانیت است ، تراشیده ، اورا راهب بودائی هم گفته میتوانیم ـ یعنی یکنفر یهودی بوده که آئین بودا را اختیار نموده اخیراً شامل « سانگیا » (مجمع راهبان بودائی) گردیده است (لوحهٔ ۱۰ ـ الف) .



لوحهٔ ۱۰ الف : سر یکنفر یهود ـ از شهر بهلول مکشوف و درموزیم پشاور موجود است

Pl.X a. Shahr-i-Bahlol. Tête d'un juif
Musée de Peshawar

---

(۱) وجود یهود درین صفحات ، از سابق بذریعهٔ منابع تردید نا پذیری برای دنیای علم و فضل معلوم بود .

از سلسلهٔ شاهان افغان و سلاطین افغانی که در خارج هم سلطنت کرده اند

Souverains d'Afghanistan et les rois afghan ayant régnés aussi en dehors du pays



سلطان غیاث الدین غوری شهنشاه افغان (۵۵۸ھ۔ق)

Sultan Ghiassouddine le Ghouride
Empereur Afghan (1192)

سلطان غیاث الدین (جس کا اصل نام شمس الدین ہے) شہاب الدین محمد غوری کا بڑا بھائی اور علاؤ الدین جہاں سوز کا بھتیجا تھا۔

۵۵۱ھ میں سلطان علاؤ الدین جہاں سوز کا انتقال ہوا، اس کی جگہ اس کا بیٹا سیف الدین تخت نشین ہوا۔ ۵۵۲ھ کے شروع ایام میں سلطان سیف الدین کی وفات پر سپہ سالار ابوالعباس شیش اور تمام سرداران قوم متفق ہو کر شمس الدین ولد بہاؤ الدین سام کو بادشاہ تسلیم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ چنانچہ شمس الدین کو تخت نشین کر کے سب نے بیعت کی اور شمس الدین کا لقب غیاث الدین تجویز ہوا۔ سلطان غیاث الدین نے اپنے بھائی شہاب الدین کو تگین آباد اور گرم سیر کے علاقے کا حاکم مقرر کیا۔ پھر ۵۶۷ھ میں سلطان نے شہاب الدین محمد غوری کو غزنی کے تخت پر بٹھا کر اس کا لقب سلطان معز الدین قرار دیا اور خود اپنے دار السلطنت فیروز کوہ کی جانب چلا گیا۔ اس طرح دونوں بھائی مستقل

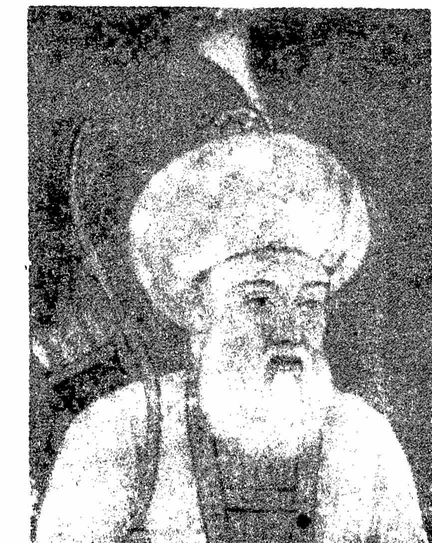
سلطان ہو گئے مگر چھوٹے بھائی شہاب الدین نے اپنے بڑے بھائی کی بزرگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھ کر اپنے آپ کو ہر ایک کام میں اُس کا تابع فرمان رکھا اور دونوں بھائیوں نے یکجہتی و اتحاد و اتفاق کے ساتھ حکومت کی۔ شہاب الدین کو سلطان غیاث الدین کا نائب بھی کہہ سکتے ہیں اور سپہ سالار بھی۔ جس طرح بڑا بھائی شمس الدین اپنے لقب غیاث الدین سے مشہور ہوا، اس طرح چھوٹا بھائی شہاب الدین اپنے لقب معز الدین سے مشہور نہیں ہوا۔ سلطان غیاث الدین ۴۲ سال حکومت کر کے بعمر ۶۳ سال ۵۹۹ھ میں فوت ہوا، اور شہاب الدین محمد غوری کی شہادت ۶۰۲ھ میں ہوئی یعنی سلطان غیاث الدین کے بعد سلطان شہاب الدین صرف تین سال تنہا مطلق العنان سلطان رہا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین کے زمانے میں بھی وہ بطور خود مختار فرمان روا برسر حکومت تھا۔ بحوالہ آئینہ حقیقت نما۔ (روشن خان)

ار سلسلهٔ شاهان افغان و سلاطین افغانی که در خارج هم سلطنت کرده اند

Souverains d'Afghanistan et les rois afghan ayant régnes aussi en dehors du pays



سلطان قطب الدین ایبك (۶۰۲ هـ ـ ق)
Sultan Kotboddine Aïbak (1206)



سلطان شهاب الدین غوری شهنشاه افغان (۵۶۹ هـ ـ ق)
Sultan Chahabuddine le Ghouride Empereur afghan (1173)

از سلسلهٔ شاهان افغان و سلاطین افغانی که در خارج هم سلطنت کرده اند

Souverains d'Afghanistan et les rois afghan ayant régnés aussi en dehors du pays



سلطان شمس الدین التتمش (٦٠٧ هـ ـ ق)

Sultan Chmsuddine Oultatmèche (1210)



سلطان آرام شاه (٦٠٧ هـ ـ ق)

Sultan Aram Chah (1210)

از سلسلهٔ شاهان افغان و سلاطین افغانی که در خارج هم سلطنت کرده اند

Souverains d'Afghanistan et les rois afghan ayant régnés aussi en dehors du pays



ملکه رضیه (۶۳۴ هـ ـ ق)

La Reine Raziiah (1236)



سلطان رکن الدین فیروز شاه (۶۳۳ هـ ـ ق)

Sultan Ruknoddine Férouz-Chah (1235)

از سلسلهٔ شاهان افغان وسلاطین افغانی که در خارج هم سلطنت کرده اند



سلطان علاء الدین مسعود شاه (۶۳۹ ه ق)
...tan Ala-Uddine Mass-Oud Chah (1241)



سلطان معز الدین بهرام شاه (۶۳۷ ه ـ ق)
Sultan Moëzzoddine Bahram-Chah (1239)

چند افغان سلاطینِ دہلی کی تصاویر

اس کتاب میں ایک طویل بحث بعض اکابر و مشاہیر کے بارے میں ان کے افغانی النسل ہونے کی آئی ہے۔ اس سلسلے میں بعض افغان سلاطین دہلی کے نام بھی آئے تھے۔ ہمیں نہایت خوشی ہے کہ جناب محمد کریم خان نزیہی رفیق انجمن ادبی کابل کی تحقیق بھی یہی ہے۔ انھوں نے اپنے مقالہ "تاریخچہ کابل" میں ان کے تاریخی تذکرے کے ساتھ چند تصاویر بھی شائع کی ہیں۔ جن کے عنوانات و تعارف میں ان کے افغان ہونے کی صراحت کی ہے۔ ہم یہاں یہ تصاویر انجمن ادبی کابل کے مجلہ علمی سالنامہ کابل بابت ۱۹۳۶-۳۷ء کے حوالے سے اور فاضل مقالہ نگار کے شکریے کے ساتھ شامل کر رہے ہیں۔ تصاویر کے ساتھ عنوان اور تعارفی الفاظ ہم نے مقالہ نگار کے برقرار رکھے ہیں۔ (روشن خان)